کلکتہ کی اردو صحافت
اور
میں

رضوان اللہ

جملہ حقوق بہ حقِ مصنف محفوظ

کتاب کا نام	:	کلکتہ کی اردو صحافت اور میں
مصنف کا نام	:	رضوان اللہ
آن لائن ایڈیشن	:	فروری ۲۰۱۵ء
قیمت	:	-/250 روپے
کمپوزنگ	:	خالد فیصل
ناشر	:	رضوان اللہ
		D-178، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر
		نئی دہلی–110025

ملنے کے پتے:

D-178، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی–110025

شب خون، 313، رانی منڈی، الہ آباد، یوپی

انتساب

ان گمنام صحافیوں کے نام
جن کا
خونِ جگر شاہ سرخیوں کے کام آیا

قلم چوں بہ قرطاس تیشہ زند
جہانِ نہفتہ درو برکند
ز ترسیلِ اخبار عالم تمام
چو مہرِ درخشاں مجلّا کند

رضوان اللہ

فہرست

عنوانات	صفحہ
پیش لفظ	۷
اعترافات	۱۱
باب اول	
کلکتہ اردو پریس سے میرا تعارف	۱۴
استخوان شکستہ	۱۴
پہلا دور	۱۷
امروز کا اجراء	۲۲
مہد ولحد	۲۴
انگارہ	۲۵
رقابتیں	۲۷
خبریں اور مضامین	۲۹
ایک برس بعد	۳۰
پتھر کا دور	۳۱
باب دوم	
۱۹۴۷ء کا انقلاب	۳۳
مسلم سیاست	۳۳
ایک پریشان کن سوال	۳۴
بدلے ہوئے حالات	۳۵
جب صحافت صنعت بن گئی	۳۶
جرنلزم کورس	۳۷
نئی کشمکش کا آغاز	۳۸
مضمحل صحافت	۴۰
تذکرہ مسلم اداروں کا	۴۲
کلکتہ خلافت کمیٹی	۴۳
سراسیمہ قاری	۴۴
قصہ بہار میں خزاں کا	۴۵
مواد اور وسائل	۴۸
ایجنسیاں	۴۹
ایجنسیوں سے نقصانات	۵۰
رپورٹنگ	۵۲
اداریئے	۵۹
کالم نگاری	۶۰
ایک تہمت کا جواب	۶۱
تسلسل واقعات	۶۲
باب سوم	
پریس کمیشن کا قیام	۶۷
نئے دور کا آغاز	۶۸
ایک نو وارد	۷۱
پہلی جسارت	۷۲
ایک اور نو وارد	۷۶

عنوانات	صفحہ
ایک اور مفقود الخبر	۷۸
ایک جائزہ	۸۰
غلط بیانی سے انکار کی پاداش	۸۵
تصادم کی راہ	۸۸
کاتبوں کی ممبر سازی	۹۲
تحریک کے نشیب وفراز	۹۳
قیام عصر جدید پر ایک نظر	۹۶
دو شخصیات	۱۰۲
چند دیگر اصحاب	۱۰۵
دو ہم شکل بھائی	۱۲۳
باب چہارم	
آزاد ہند سے وابستگی	۱۲۶
سنگم (کلکتہ)	۱۲۸
صحافت میں اساتذہ کا رول	۱۳۱
ایک اخلاقی مسئلہ	۱۳۵
بنگلہ دیش کی تحریک	۱۳۹
مسلمانوں کی سراسیمگی	۱۴۱
جنگ کے اثرات	۱۴۵
مثبت پہلو	۱۴۵
نئے فتنے	۱۴۷
باب پنجم	
انقلاب انگیز سال	۱۵۴
ایمرجنسی اور سنسر شپ	۱۵۵
بنگلہ دیش میں انقلاب	۱۶۱
مخالفانہ پروپیگنڈہ	۱۶۱
جواب طلبی	۱۶۳
دہلی کی پیشکش	۱۶۴
آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس	۱۶۶
پس منظر	۱۶۸
ایک نکتہ	۱۷۰
۱۹۷۵ء میں اخبارات کی فہرست	۱۷۱
کلکتہ کو الوداع	۱۷۲
مراجعت	۱۷۴
باب ششم	
دوسرا حصہ	۱۷۶
عہد نو	۱۷۶
اخبار مشرق کا نیا باب	۱۷۷
اقراء کا اجراء	۱۸۰
مسئلہ اشتہارات کا	۱۸۱
اردو نیوز سروس	۱۸۳
پبلسٹی اور پروپیگنڈہ	۱۸۷
خبر اور افواہ	۱۸۸
ڈس انفارمیشن	۱۸۹
حلقۂ اثر	۱۹۱
ایک تجویز	۱۹۳
آخری بات	۱۹۵

پیش لفظ

ایسے میں کہ جب حرف وبیاں نوکِ زبان تک پہنچتے پہنچتے بوسیدہ ہو جاتے ہوں، جب افکار اور خیالات اسبابِ نشر واشاعت تک بار پانے سے پہلے ژولیدہ ہو جاتے ہوں، جب خبریں خود قاری اور سامع کے لیے فرشِ راہ ہوں نہ کہ وہ ان کا جویا ہو، صحافت کے فنی، اصولی، عملی، لسانی، نظریاتی، سیاسی، تاریخی اور معاشرتی پہلوؤں اور دیگر لوازمات وملحوظات کے بارے میں کچھ کہنے کی جسارت بڑی دیدہ دلیری کی بات ہے۔ لیکن وہی بات کہ ناسمجھ وہاں بھی جست لگا دیتے ہیں جہاں فرشتوں کے پر جلتے ہوں۔ کبھی شوق بے پایاں بھی اس جسارت کا موجب ومحرک ہوتا ہے اور کبھی اپنے فن اور پیشے سے وہ عشق بھی جس کی ناعاقبت اندیشی کسی دلیل کی محتاج نہیں۔

صحافت کے ایک ناپیدا کنار سمندر میں جست لگانے پر اس ایقان نے بھی مہمیز کیا کہ بادِمخالف کیسی ہی طوفان خیز کیوں نہ ہو تعمیر کی کوششیں جاری ہی رہتی ہیں، شور کتنا ہی تیز ہو اپنی بات کہنے کے لیے آواز تیز تر کرنی ہی ہوتی ہے اور مشین، یہاں میری مراد آلات نشر واشاعت سے ہے، کتنی ہی برق رفتار کیوں نہ ہو، اس کا شہسوار ہمیشہ ذہنِ انسانی ہی رہے گا تو پھر اس شہسواری کے رموز سے آگاہی کے اسباب مرتب اور فراہم کرتے رہنا صرف ایک ضرورت نہیں، ایک لازمہ ہے۔ علم پہاڑ سے بھی زیادہ بلند وباوزن ہو جائے تو بھی وہاں تک رسائی کے لئے ابجد اور اس کے اصولوں کو سیکھنے، سمجھنے اور اسے سکھانے والے کی موجودگی کے سوا چارہ نہیں۔ یہی جواز ہے ساری کتابوں کے وجود کا اور جب تک یہ جواز موجود رہے گا کتابیں وجود

میں آتی رہیں گی اور ان کی تخلیق کے لیے انسانی بصیرتوں کی ضرورت باقی رہے گی۔

موجودہ تصنیف کا سبب یہ خوش فہمی ہوسکتی ہے کہ اردو صحافت کا ہاتھی دیکھنے والے جن نابیناؤں نے اس کو بیان کرنے کی کوشش کی ان میں شاید ہمارا بھی شمار ہوجائے، لیکن کیا اس کو بیان کرنا ضروری ہے؟ ہاں۔ میں سمجھتا ہوں ضروری ہے کیونکہ عصری حالات اور معاصرین کا تذکرہ فرضِ کفایہ جیسا ہے کہ کوئی اس فرض کو انجام دے دے تو اس کا بار سب کے سر سے اتر جاتا ہے۔ اگر تصنیف و تالیف کی دنیا میں یہ روایت جاری نہ رہی ہوتی تو شاید دنیا ماضی کی تاریخ سے ناآشنا ہی رہ جاتی۔ اس باب میں میری سرگرانی پرانی ہے۔ بعض تصنیفات اور تحریریں جو وقتاً فوقتاً نظر سے گزریں وہ مہمیز بھی کرتی رہیں لیکن مجھے اس وقت کا انتظار تھا جب کشاکشِ شب و روز سے دم لینے کی ذرا مہلت ملے۔

بہرحال سب سے پہلے دو باتیں عرض کردوں اول یہ کہ میں جو کچھ لکھنے جا رہا ہوں وہ کلکتہ اردو پریس کے حوالے سے ہوگا۔ میرے خیال سے ہندوستان میں سب سے زیادہ چھتنار اردو پریس ہے اور ہر علاقے کے اردو پریس کے حالات و معاملات میں بہتیرے خواص کی یکسانیت کے باوجود ان کے مسائل کی نوعیت اور شدت میں بڑا فرق ہے، ان سے نبرد آزمائی اس تصنیف کے دائرۂ عمل کی سمائی سے باہر ہے، دوسرے یہ کہ میں نے اس تذکرے کو اپنی ذات کے محور سے وابستہ رکھا ہے۔ یہ ''سرِ دلبراں'' نہیں کہ ''گفتہ آید در حدیث دیگراں''۔ یہ ایک شمع سوزاں کی داستانِ حیات ہے جو اپنی سوختہ سامانی سے ہر صبح کو جلوہ افشانی عطا کرتی ہے۔ اس راست بیانی کی ایک خاص وجہ یہ احساس ہے کہ جو شخص خود کسی کشاکش میں مبتلا اور شریک رہا ہو اس کے بیان میں معروضیت کی امید نہیں کی جاسکتی اس لیے کیوں نہ پہلے ہی یہ بات صاف کردی جائے کہ جن حالات و واقعات کا میں تذکرہ کررہا ہوں انہیں میں نے جس طرح دیکھا، برتا اور سمجھا اسی طرح بے لاگ بیان کررہا ہوں۔

جو داستان اس کاغذی پیرہن میں مستور ہے اسے کئی طرح بے لاگ بیان کیا جاسکتا ہے۔ اسے آزادیِ وطن کے بعد تقریباً نصف صدی پر محیط ایک مصلوب زبان کی مضمحل صحافت کا

سپاٹ میزانیہ کہا جا سکتا ہے۔ اسے بے دست و پا انسانوں کے بے زبان ترجمان کا بیانیہ کہا جا سکتا ہے۔ اسے دو جراحت خوردہ طبقوں کی آپسی کشاکش کے حوالے سے بیان کیا جا سکتا ہے جن میں سے ایک کو مالک اور دوسرے کو ملازم کہنا ایک مجبوری ہے۔ اس پوری داستان کو تقریباً برابر دو حصوں میں تقسیم بھی کیا جا سکتا ہے یعنی پہلا پتھر کا دور جب لیتھو مشینیں اردو اخباروں کو زندگی کی بھیک دے رہی تھیں اور دوسرا نئی جست کا دور جب آفسیٹ مشینوں نے تیز گام ہونے کے لیے حدی خوانی کی اسی راہ میں اگلا پڑاؤ وہ ہے جہاں کمپیوٹر کمپوزنگ روایتی خوش نویسی سے ہم آغوش ہوئی۔ اسی طرح اس کہانی کی ایک اور تقسیم ممکن ہے یعنی نصف اول کو کلکتہ میں 'آزاد ہند' اور 'عصرِ جدید' کی قیادت کا دور کہا جا سکتا ہے تو نصف ثانی کو 'اخبارِ مشرق' کی پیش رفت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے لیکن جیسا کہ ابھی عرض کر چکا ہوں اس کہانی کو اس میں شریک ایک کردار کی زبانی بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور وہ کردار میں خود ہوں۔

اس اعتبار سے بھی کہانی کو تقریباً برابر دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی ایک حصہ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۷۵ء تک اور دوسرا ۱۹۷۶ء سے جاری۔ ۲۴-۲۵ برس پر محیط پہلے مرحلے کے دوران میں بذاتِ خود کلکتہ کی بساط پر موجود، فعال اور سرگرم تھا۔ اس کی تفصیلات تو بہت ہیں لیکن اسی حد تک بیان کرنے کی کوشش کروں گا جس کا تحمل یہ تصنیف کر سکے۔ مزید براں وہی دور اردو صحافت میں صف آرائیوں کی ابتدا، صحافیوں کی عمومی صنعت کاری اور اردو صحافت کے معاملات میں غیر اردو بلکہ اردو مخالف صحافیوں کی مداخلت کے آغاز کا زمانہ بھی ہے۔ ایسے میں ہماری رہنمائی کے لیے ماضی کی نظیریں بھی نہیں تھیں۔ اس زمانے میں ہماری پریشانی اور بے بسی کا آج اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

اردو صحافت سے میری وابستگی کا دوسرا دور اس اعتبار سے عجیب و غریب ہے کہ وہ بالواسطہ ہوتے ہوئے بھی ایک حد تک براہِ راست تھا یعنی میں امریکن سنٹر دہلی میں اردو ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے کلکتہ کے اخباروں اور بیشتر صحافیوں سے مستقل رابطے میں رہا لیکن جائے وقوع پر عدم موجودگی کی وجہ سے اس رابطے میں پہلی سی گہرائی نہ تھی۔ بہ فیضِ صنعت

کاری ہمارے داخلی اور باہمی تعلقات میں جو تلخی اور کشیدگی آ گئی تھی اس سے ہمارے نئے حالات معرا اور مبرا تھے، ان تعلقات میں ایک نرمی اور خوش سلیقگی آ گئی تھی دوسرے یہ کہ کسی ایک اخبار سے وابستگی کی تخصیص باقی نہ تھی سارے اخباروں اور ان کے صحافیوں سے یکساں تعلقات ہو گئے تھے۔ ان اخباروں کی باہمی مسابقت یا ان کے اندر صنعتی کشیدگیوں اور کشاکشوں سے مجھے کوئی واسطہ نہیں رہ گیا تھا۔ جب ایک خاص فاصلے سے اور ایک بے لاگ زاویئے سے ان اخباروں کو دیکھنے لگا تو بس ایک ہی مطمحِ نظر رہ گیا تھا اور وہ تھا اردو اخباروں کا ارتقا، صحافتی معیاروں کی ترقی۔ چونکہ اس دوران مجھے انگریزی، ہندی اور دیگر زبانوں کے اخبارات اور صحافیوں کو بھی دور و نزدیک دیکھنے اور برتنے کا موقع ملا تو مشاہدے میں وسعت پیدا ہوئی اور مختلف صحافیوں سے موازنے کا موقع بھی ملا۔

اس موازنے کا بھی ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے جو کسی معینہ وقت یا مقام پر گنے چنے اداروں کے معائنے یا افراد سے ملاقاتوں پر مبنی نہیں بلکہ ایک عرصے تک مشاہدوں اور ملاقاتوں کے بعد قائم ہونے والے تاثرات پر مبنی ہے۔ پوری کیفیت کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یعنی ادارتی جس میں افراد اور ان کی تحریریں شامل ہیں، دوسرے انتظامی شعبہ اور اس کی کارفرمائیاں۔ ان دونوں کی اجتماعی کوششوں کا حاصل اخبارات ہیں۔ ہمارے اردو اخباروں کی ظاہری ہیئت سب پر آشکارا ہے۔ پھر یاد دلا دوں کہ فی الحال میرے پیشِ نظر کلکتہ کے اردو اخبارات ہیں، گو تذکرے کا انداز عمومی ہے، یوں اس تخصیص اور عمومیت کے درمیان کوئی بہت بڑا فرق نہیں ہے۔ لیکن میں جس آشکارا ہیئت کا ذکر کر رہا ہوں اس کا جمود ۱۹۸۰ء میں خدا خدا کر کے ٹوٹا جب کلکتہ کے آفاق پر 'اخبارِ مشرق' طلوع ہوا۔ کلکتہ کا یہ پہلا اخبار تھا جس کی اشاعت آفسیٹ پریس پر شروع ہوئی۔ بانیِ اخبار وسیم الحق صاحب ۱۹۷۴ء سے اس کی تیاریوں میں مصروف تھے جس کا مجھے علم تھا۔ ۱۹۷۵ء آتے آتے انھوں نے مشین وغیرہ بھی درآمد کر لی لیکن عین اسی اثناء میں ایمرجنسی نافذ ہو گئی۔ اس طرح کسی نئے اخبار کی اشاعت شروع کرنے کے لیے حالات ناسازگار ہو گئے اور وسیم صاحب کو اگلے کئی برسوں تک انتظار کرنا پڑا۔ 'آزاد ہند' دو

تین لیتھو مشینوں پر چھپ رہا تھا اس لیے کہ ایک مشین ضرورت کی تکمیل کے لیے ناکافی تھی۔ شاید احمد سعید صاحب کو یاد نہ ہو، میں نے دو ایک بار اشارتاً ان سے کہا تھا کہ آفسیٹ مشین کا بندوبست کریں کہ وہ نئی بلڈنگ بنانے سے زیادہ ضروری ہے۔ اس سے زیادہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ اگر میں 'آزاد ہند' کے شعبۂ ادارت سے وابستہ تھا تو دوسری طرف وسیم صاحب میرے مخلص اور آزمودہ دوست تھے۔ بہر حال 'اخبارِ مشرق' کی اشاعت کے بعد 'آزاد ہند' کے لیے بھی آفسیٹ پریس کا بندوبست کرنا ایک لازمہ بن گیا۔ اس طرح کلکتہ کے اردو اخباروں کی ظاہری ہیئت میں نکھار کا سلسلہ شروع ہوا اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ یہ سلسلہ جاری ہے۔

جہاں تک ادارتی شعبے میں شخصیات اور ان کی تحریروں کا تعلق ہے، ان کے معیاری ہونے میں مجھے نہ پہلے شک تھا نہ اب ہے۔ یہ دیکھ کر ایک طرح کے فخر کا احساس ہوتا تھا کہ ہمارے صحافیوں کی زبان سکہ بند، منجھی ہوئی اور دوسری دیسی زبانوں کے مقابلے میں معیاری ہے۔ اب ایک عام انحطاط کا دور ہے ٹی وی چینلوں کی بھگدڑ نے زبان کا ستیاناس کر دیا ہے۔ اس سے ہمارے اردو صحافی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہاں تحریروں کے موضوعات یقیناً اکثر و بیشتر بندھے ٹکے ہوتے ہیں ان میں تنوع اور پھیلاؤ کی کمی ہے اس کے لیے ان صحافیوں کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اس کا سیدھا تعلق ہمارے اخباروں کی مالی حیثیت سے ہے جسے انتظامیہ کی تنگ دلی نے تنگ تر کر دیا ہے۔ میں اپنے ہم پیشہ صحافیوں کے متعلق وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ''ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی''۔ لیکن یہ بتائے بغیر میری بات نامکمل رہ جائے گی کہ اگر اپنے صحافیوں کے معاشی حالات بہتر بنانے کی تدبیر نہ کی گئی تو بہتری کی کسی کوشش کا حسبِ خواہ بارآور ہونا مشکوک رہے گا۔

اعترافات

دماغ میں اس تصنیف کی کھچڑی ایک عرصے سے پک رہی تھی۔ اس اثناء میں جس کسی سے اس کا ذکر کیا اس نے کسی نہ کسی طور میرے ارادے سے اتفاق کیا، اس میں کسی کی جیب سے کیا جاتا تھا لیکن عزیز گرامی پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے ایک ملاقات میں میرے خیال کی

تائید کچھ اس طرح کی گویا میں نے اس کام کو انجام نہ دیا تو ہماری صحافت کی تاریخ ادھوری رہ جائے گی۔ کچھ عرصہ بعد دوسری ملاقات میں کتاب کا ٹائٹل بھی انھوں نے تجویز کر دیا ''کلکتہ کی اردو صحافت اور میں'' مجھے یہ ٹائٹل عجیب سا لگا لیکن پروفیسر شہریار اس وقت موجود تھے۔ انھوں نے اس تجویز کی پرزور تائید کی اس کے بعد میرے کہنے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا۔ پھر ہمارے سر میں اس کی ہوا ایسی بھری کہ ہم اس ہفت خواں کو سر کرنے کی مہم پر چل پڑے۔ مشکل یہ ہے کہ فاروقی صاحب کے لئے ممنونیت کا اظہار کیسے کروں جبکہ وہ خود اس تصنیفی کاوش میں شریک ہو گئے۔ رہی یہ بات کہ ''سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے'' تو قدم قدم پر ٹھوکریں لگتی رہیں اور اللہ کے بندے دست گیری کرتے رہے۔ رفیقِ دیرینہ قیصر شمیم صاحب، وائس چیئر مین مغربی بنگال اردو اکاڈمی، نے بہت بڑی معاونت کی ورنہ اس تصنیف کی بیل واقعی منڈھے نہ چڑھی ہوتی۔ نومبر ۲۰۰۴ء کے اواخر میں وہ اپنی مجلسِ صدارت کے ساتھ دہلی آئے۔ یہ تجدیدِ ملاقات بارہ تیرہ برس بعد ہوئی تھی، اس وقت تک ہماری اس تصنیف کا بنجارہ کئی پڑاؤ آگے نکل چکا تھا۔ انہی سے معلوم ہوا کہ شانتی رنجن بھٹا چاریہ کی تصنیف ''بنگال میں اردو صحافت کی تاریخ'' کو رئیس جعفری کی نظرِ ثانی کے بعد مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے شائع کیا ہے۔ یہ خبر میرے لیے واقعی عید کی خوشی جیسی تھی۔ اب عیدوں میں بھی وہ خوشیاں کہاں رہ گئی ہیں! میری گزارش پر انھوں نے کلکتہ واپسی کے بعد پہلی فرصت میں اس کتاب کی ایک جلد بطورِ ہدیہ ارسال کر دی۔ میں ان کا بیحد ممنون ہوں۔ اس کتاب کے مندرجات نے بہت ساری بھولی بسری یادیں تازہ کر دیں۔ اس سے ناموں اور تاریخوں کی درستگی اور اصلاح میں بڑی مدد ملی۔ کسی معاملے میں دور افتادہ لوگوں سے معلومات حاصل کرنا مشکل اور صبر آزما کام ہوتا ہے۔ اس راہ میں محبِ صادق وسیم الحق، ایڈیٹر 'اخبارِ مشرق' سید منیر نیازی، نیوز ایڈیٹر 'آزاد ہند'، کمال جعفری، آل انڈیا ریڈیو پٹنہ اور اشہر ہاشمی، یو این آئی، اردو نیوز سروس نے دستِ تعاون دراز کیا۔ ان سب کا رہینِ منت ہوں، خصوصاً عزیز گرامی محبوب الرحمٰن فاروقی سابق ایڈیٹر ماہنامہ 'آجکل' کا، انھوں رجسٹرار آف نیوز پیپرس کی رپورٹیں فراہم کرنے میں دست گیری کی اور برادرم تسکین واحدی کا

جو سبکدوشی کے بعد اپنے وطن موضع شیخ پور، ضلع بلیا میں سکونت پذیر ہیں۔ انھوں نے ایک بزرگ رفیق عابدؔ زاہدی سے مل کر مطلوبہ معلومات حاصل کر کے مجھے ارسال کیں۔

ابراہیم ہوشؔ ایڈیٹر 'آبشار' کی خودنوشت سوانح حیات روزنامہ 'اقراء' کلکتہ میں ۱۹۸۳ء میں قسط وار شائع ہوئی۔ اسی طرح رئیس الدین فریدی ایڈیٹر 'روزانہ ہند' کی خودنوشت سوانح حیات 'آزاد ہند' کلکتہ میں ۹۶-۱۹۹۵ء میں قسط وار شائع ہوئی، ان دونوں سلسلوں کے کچھ تراشے پرانی فائلوں میں مل گئے۔ ان سے بھی متعدد واقعات اور تاریخوں کی تصحیح اور درستگی میں مدد ملی۔ ان اصحاب کے تذکرے اس تصنیف میں شامل ہیں۔

اسی وقت اس تصنیف میں کمیوں اور فروگزاشتوں کا بھی اعتراف کرنا چاہیے۔ صحافت کی خواہ تاریخ ہو، تذکرہ یا فن، ان کے موضوعات اور مضامین زندہ اور نمو پذیر ہوتے ہیں اور ہمیشہ تازہ کاری کے طلب گار رہتے ہیں۔ ظاہر ہے، ہر تصنیف کسی نہ کسی مقام پر پہنچ کر ٹھہر جاتی ہے۔ آگے بڑھنے کے لیے نئی اور بدلے ہوئے حالات و واقعات سے ہم آہنگ تحریروں اور تصنیفوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تصرف اور اضافہ تازہ واردانِ بساطِ فن کی ذمہ داری ہے۔ سو ان اعترافات کے ساتھ میں اپنے حصے کا کام کر چلا۔

رضوان اللہ

■❖■

باب اول

کلکتہ اردو پریس سے میرا تعارف

استخوانِ شکستہ

یہ ۱۹۵۱ء کی بات ہے۔ کلکتہ کی برسات کا شباب اتار پر تھا لیکن آدمی کا وجود بلا رکشا کھینچے بھی کھڑے کھڑے برف کی طرف پگھلا جاتا تھا کہ میرا پاؤں کلکتہ کی اردو صحافت کے مردہ جسم پر اسی طرح اتفاقاً آ گیا جیسے میرؔ کا پاؤں ''ایک کاسۂ سر'' پر آ گیا تھا اور یہ بھی ہوا کہ آزادیِ وطن کے جلو میں کشت وخون کی وجہ سے ''یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا'' اور وہ بھی مجھ سے کہنے لگا کہ ''دیکھ کے چل راہ بے خبر۔ میں بھی کبھو کسو کا سر پرغرور تھا''۔

کلکتہ کی جس اردو صحافت کے مردہ جسم کا ذکر کرنا چاہتا ہوں اس کا سرِ پُرغرور بھی میں دیکھ چکا تھا۔ وہ آزادی سے پہلے کی بات ہے، جب شہرِ عزیز کا چہرہ تقریباً ویسا ہی نکھرا ہوا تھا جس پر غالبؔ فریفتہ ہو گئے تھے۔ صبح فجر کے بعد اور شام کو عصر کے بعد یعنی دن میں دو بار شہر کی ساری شاہراہوں اور گلی کوچوں کی کدورت پانی کی تیز دھاروں سے دھو کر بہائی جاتی تھی جس کے لیے زیرِ زمین دریائی پانی کا پورا نظام اور دھلائی کرنے والوں کی ایک پوری فوج تھی۔ افسوس کہ آزادی کی گرم ہوا نے یہ سب سوختہ کر دیا۔ اتنا ہی نہیں شام کا جھٹ پٹا ہونے سے پہلے ہر رہ گزر کے دونوں طرف ہلکی پیلی روشنی والی گیس کی بتیاں شہر کو اپنی سکون بخش بھینی بھینی روشنی کی چادر میں لپیٹ لیتیں۔ رات گئے تک بوڑھے بچے، لڑکے لڑکیاں، جہاں چاہیں آئیں جائیں، ہوگلی کے کنارے، ریڈ روڈ پر، لیڈیز گارڈن میں (جہاں اب ایڈن گارڈن اسٹیڈیم ہے) بے خوف گھومیں پھریں۔ افسوس کہ بے مہار آزادی نے اس سکون کو غارت کر دیا اور وہ

دن بھی آئے جب اسی شہر کی سڑکوں پر شام کے آٹھ بجتے بجتے کرفیو کا سا سماں ہو جاتا اور لوگ اپنے سائے سے بھی سہم جاتے۔

اسی گرم ہوا میں اردو کی وہ صحافت بھی جھلس گئی جس کا شہر میں طوطی بولتا تھا صبح کو روزانہ 'عصرِ جدید' اور شام کو 'الحق' واقعی گرم پکوڑوں کی طرح بک جاتے تھے۔ صوبے میں مسلم لیگ کی حکومت تھی اور 'عصرِ جدید' مولانا شائق احمد عثمانی کی ذاتی ملکیت میں ہونے کے باوجود مسلم لیگ کی بھرپور ترجمانی کرتا تھا، لیکن جذباتی سیاست کی وہی آندھی اس کو اڑا لے گئی۔ خود 'عصرِ جدید' کے ایڈیٹر عبدالجبار وحیدی ۱۹۴۶ء کے فسادات کے دوران چونا گلی میں اپنے دفتر کی دہلیز پر پولیس کی اندھا دھند فائرنگ کی زد میں آ کر شہید ہوئے۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی ادارت کے باوجود کانگریس کے ہم خیال 'روزانہ ہند' کے لیے 'عصرِ جدید' کے مقابلے میں ٹکنا محال تھا، لیکن جب وہ آندھی گزر گئی تو بھی خاک وخون کا سیلاب جاری رہا اور اجڑی ہوئی بے یار ومددگار خلقت کا دھارا نامعلوم نئی منزلوں کی تلاش میں اسی راہ سے مشرق کی جانب رواں تھا۔ اسے اپنے پاؤں کے نیچے زمین نہیں نظر آتی تھی، اخبار اور ادب کا کہاں ہوش رہتا! ہاں ابراہیم ہوشؔ کلکتہ میں ثابت قدمی سے موجود رہے جو محمڈن اسپورٹنگ کے قصیدے لکھتے، پڑھتے اور چھپاتے لیکن اب ان کے قصیدے سننے والے ہی حواس باختہ تھے سو ابراہیم ہوشؔ ''ڈوما کالا چان'' کی زبان میں جسے عرفِ عام میں 'کلکتیا' کہتے ہیں، ان کا بکھان کرنے لگے اور اپنے اخبار 'آبشار' میں روزانہ ایک کالم ان کے لیے وقف کر دیا۔

تو میں نے اردو صحافت کا سر پُرغرور بھی دیکھا تھا اور خود میرا سرِ پُرغرور خود کو کسی طرح کمتر درجے کا ہندوستانی ماننے کو تیار نہ تھا۔ چنانچہ بات یوں ہوئی کہ میں ۱۹۵۱ء میں سائیکالوجی میں ایم ایس سی کرنے کی غرض سے کلکتہ یونیورسٹی کے سائنس کالج میں داخلے کا فارم جمع کرآیا۔ میں نئے ہندوستان کی سیاست سے نابلد، یہ سمجھنے کو تیار نہ تھا کہ صرف مسلمان ہونے کی وجہ سے یا بنگال میں غیر بنگالی ہونے کی وجہ سے میں اس شہر میں ناپسندیدہ بھی ہوسکتا ہوں۔ نتیجے کا انتظار کرتا رہا جو میرے علاوہ ہر سمجھ دار پر عیاں تھا، لیکن کسی مایوسی میں مبتلا ہونے کے بجائے میں اس

فکر میں مبتلا ہوگیا کہ اگلے برس پھر کوشش کرنے تک ایک سال کا کیا مصرف لیا جائے۔ یہی وہ فکر تھی جو مجھے 'عصرِ جدید' کے دروازے تک لے گئی۔

اسی کلکتہ میں آزادی سے پہلے بھی میں کالج میں داخلے کے ایک تجربے سے گزر چکا تھا۔ وہ ۱۹۴۶ء کی بات ہے، جب میں کلکتہ کارپوریشن میں کوئی نوکری ڈھونڈنے کے لیے نکلا تھا لیکن کسی نے میرا رخ اندھیرے سے روشنی کی طرف موڑ دیا۔ محمد عثمان صاحب کلکتہ کارپوریشن کے میئر تھے وہ مسلم پریسیڈنسی ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر بھی تھے۔ اس اسکول کی بوسیدہ عمارت آج بھی اپنی جگہ موجود ہے لیکن زکریا اسٹریٹ میں اس کی عظمتوں کی کہانی کسے یاد ہوگی۔ وہ اسکول کے دفتر میں تشریف فرما تھے۔ میں اپنی گزارش کے ساتھ حاضر ہوا۔ میری کم عمری اور ملازمت کی تلاش پر انھیں قدرے حیرت ہوئی اور کچھ استفسارات کے بعد انھوں نے تاکید کی کہ صبح یا شام کو انٹرمیڈیٹ کے کلاس میں داخلہ لے لو پھر کسی کام کا بھی بندوبست کر دیا جائے گا۔ اتنا ہی نہیں انھوں نے اسی وقت میئر کے لیٹر پیڈ پر ایک خط سٹی کالج کے پرنسپل کو لکھا اور مجھ سے کہا کہ وہاں جا کر ایڈمیشن لے لو۔ میرے بہنوئی شاہ محمد امین الدین صاحب مرحوم مجھے لے کر محمد عثمان صاحب کی خدمت میں گئے تھے۔ وہ نیچے اترے اور سیدھے مرزا پور اسٹریٹ کا رخ کیا جو تھوڑی دور پر کالج اسٹریٹ سے ملحق ہے۔ ہم پرنسپل صاحب کے دفتر میں بلا تکلف چلے گئے اور وہ خط پیش کیا۔ اس کو انھوں نے پڑھا اور اسی وقت کلرک کو آواز دی اور داخلے کی کارروائی مکمل کرانے کی ہدایت کی۔ ہم لوگ اس کلرک کے ساتھ ملحقہ کمرے میں آئے۔ داخلہ فارم کی خانہ پُری کی۔ غالبًا چالیس روپیہ فیس وغیرہ اسی وقت جمع کی اور میں شام کے کلاس میں داخل ہوگیا لیکن افسوس ہماری قسمت ہمیں قیامت بداماں آزادی کی طرف لیے جارہی تھی۔ وسط اگست میں ہی کلکتہ کے وہ تاریخی فسادات برپا ہوئے کہ زندگی کی نہ جانے کتنی شمعیں گل ہوگئیں۔ شہر کا حلیہ دیکھتے دیکھتے مسخ ہوگیا۔ مہینوں شہر کے حالات کے اعتدال پر آنے کا انتظار کرتے کرتے آخر صبر کا دامن اور اس شہر کا دامن بھی چھوٹ گیا لیکن محض چند برسوں کے لیے۔ اس وقفے کو زندگی کے گونا گوں تجربات اور نامساعد حالات سے نبرد آزمائی کا میزانیہ کہنا چاہیے۔

پہلا دور

ستمبر کے مہینے کی ابتدائی تاریخیں تھیں۔ یہ عجب اتفاق ہے کہ میری پیدائش ستمبر کے مہینے کی ابتدائی تاریخوں میں سے کسی دن کی ہے، ستمبر کی انہی تاریخوں میں میرا پاؤں صحافت کی دلدل میں پڑا۔ چند برسوں بعد اسی زمانے میں اسی دلدل میں نیچے ایک مضبوط چٹان پر میرا پاؤں ٹک گیا پھر کوئی ربع صدی بعد اسی زمانے میں میرے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں میں استقامت کے اسباب پیدا ہوئے۔ بات یوں ہوئی کہ ایک بزرگ محمد رفیق عابدؔ زاہدی صاحب تھے جو شیخپور سے ملحق موضع زاہدی پور، ضلع بلیا، یوپی کے رہنے والے تھے۔ نشورؔ واحدی کے ہم وطن اور پکے ہم عصر تھے۔ یعنی ان دونوں کی ۱۹۱۳ء کی پیدائش تھی۔ نشورؔ صاحب نے ۱۹۸۲ء میں داعیِ اجل کو لبیک کہا، یہ بزرگ ہنوز بقیدِ حیات ہیں اور اپنے گاؤں میں اطمینان سے جس حد تک آج کے زمانے میں اور ان کی عمر کے اعتبار سے ممکن ہے، زندگی گزار رہے ہیں۔ ان سے ہم لوگوں کی کئی قرابتیں چلی آ رہی ہیں۔ کلکتہ کے روزنامہ 'عصرِ جدید' اور کئی دیگر اخبارات و جرائد میں وہ بیک وقت خوش نویسی کرتے تھے، استادانہ شاعری کرتے تھے، افسانے لکھتے تھے اور ناول بھی تصنیف کیے۔ میرے بہنوئی شاہ محمد امین الدین صاحب نے ان سے میرا ذکر کیا، بس وہ مجھے انگلی پکڑا کر 'عصرِ جدید' کی طرف لے گئے اور تقدیر کے حوالے کر دیا، ان کا ذکر قدرے تفصیل سے آگے آئے گا۔

مرکزی کلکتہ کے مسلم علاقے میں معروف شاہراہ زکریا اسٹریٹ کے قریب ہی اس کے متوازی ایک سڑک بولائی دت اسٹریٹ پر ایک بہت بڑی کئی منزلہ عمارت ہے جس میں محمد جان ہائر سکنڈری اسکول واقع ہے۔ ۱۹۵۱ء میں بھی بالائی منزلوں پر اسکول تھا اور نیچے ایک طرف روزنامہ 'عصرِ جدید' کا دفتر تھا اور اس کے بالمقابل ایک خیراتی ہسپتال تھا۔ دفتر 'عصرِ جدید' کا پہلا کمرہ منیجر صاحب کا تھا۔ ہم لوگ وہاں داخل ہوئے۔ دروازے کے قریب ہی ایک طرف اوسط درجے کی دو میزیں برابر لگی ہوئی تھیں اور دونوں پر دفتری کاغذات لدے ہوئے تھے۔ پہلی میز سے لگی ہوئی کرسی پر منیجر صاحب تشریف فرما تھے۔ مختصر اور منحنی سی شخصیت، معمولی

قمیص، پاجامے اور ٹوپی میں ملبوس اردو پریس کی جسامت، حیثیت اور شخصیت کی بھرپور نمائندگی کررہے تھے۔ رسمی سلام دعا کے بعد میں اور عابدیؔ صاحب (وہ اسی نام سے جانے پہچانے جاتے تھے) منیجر صاحب کے سامنے دو خالی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ برابر والی میز پر اشتہارات سے متعلق کارپرداز تشریف فرما ہوا کرتے تھے۔ وہ مجیدی صاحب تھا جو ابھی آئے نہ تھے اس لیے ان کی کرسی خالی تھی لیکن ان کے سامنے والی کرسی پر یعنی ہم لوگوں کے برابر تیسری کرسی پر ایک وجیہہ نوجوان کچھ اچکے ہوئے بیٹھے تھے۔ 'یہ اختر ملیح آبادی صاحب ہیں' بس اتنا ہی ان کا تعارف تھا لیکن وہ اردو پریس کی عام کیفیت کی عکاسی کررہے تھے یعنی 'عصرِ جدید' میں کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد ان کو رخصت دے دی گئی تھی اور غالباً وہ اپنا حساب کتاب کرنے کے لیے آئے رہے ہوں گے، شاید ان کی خالی جگہ کی خانہ پری کے لیے میں پہنچ گیا تھا۔ عابدیؔ صاحب نے منیجر قاضی اقبال احمد صاحب سے میرا تعارف کرایا۔ ''رضوان اللہ صاحب میرے عزیز ہیں، گریجویٹ ہیں، اعظم گڑھ کے رہنے والے ہیں، انھیں کچھ کام کا موقع دیجیے۔'' منیجر صاحب کے بھنچے ہوئے ہونٹوں میں ذرا جنبش ہوئی، اپنی بڑی بڑی ذہین آنکھوں کو ہم پر جمائے ہوئے چہرے پر کسی تاثر کے بغیر فرمایا: ''جی''۔ بعد میں معلوم ہوا کہ کثرتِ استعمال سے یہی لفظ ان کا پہلا ردِعمل ہوا کرتا تھا۔ کچھ ٹھہر کر ہدایت کی دن میں آیا کریں اور بطورِ مشق کچھ ترجمہ کیا کریں۔ چونکہ وہاں اخبار کے پروپرائیٹر خان بہادر شیخ محمد جان صاحب کے حکم کے بغیر پتہ بھی نہیں ہل سکتا تھا اس لیے منیجر صاحب نے خان بہادر صاحب کی خدمت میں دن کو معمول کی حاضری کے دوران دفتر میں میرے بیٹھنے کی اجازت لے لی ہوگی۔

خان بہادر صاحب کا دفتر قریب ہی ایک اور متوازی سڑک کولوٹولہ اسٹریٹ (موجودہ مولانا شوکت علی اسٹریٹ) پر ایک عمارت کی بالائی منزل پر واقع تھا، چونکہ وہ ایک بڑے تاجر اور سیاسی لیڈر بھی تھے، دلی والی تاجر برادری سے ان کا تعلق تھا اس لیے ان کے دفتر میں ان کے مختلف کاروباری شعبوں کے ذمہ دار موجود تھے جن کے سپریم منیجر شیخ محمد یعقوب صاحب تھے جو اسٹیٹ کے سارے امور کے مختارِ کل تھے۔ منیجر 'عصرِ جدید' صبح دس بجے وہاں حاضری دیتے اور

مغرب بعد خان بہادر صاحب معمولاً 'عصرِ جدید' کے دفتر میں آتے۔ منیجر صاحب کی کرسی پر بیٹھ کر چائے پیتے اس مختصر سی نشست میں چند مقربین شریک ہوتے، مواخذے کے لیے معتوبین بھی اس وقت پیش ہوتے اور سرسری سماعت کے بعد فی الفور قطعی فیصلے سنا دیے جاتے جو دراصل پہلے ہی سے صبح کے دربار میں طے شدہ ہوتے اور فوراً نافذ العمل ہوتے۔ اس کے بعد خان بہادر صاحب وہیں سے اپنی رہائش کے لیے روانہ ہو جاتے۔ ان کی گاڑی باہر کھڑی ہوتی۔

اگلے دن سے میرا معمول یہ طے ہوا کہ میں صبح 'عصرِ جدید' کے دفتر میں آ کر انگریزی روزنامہ 'اسٹیٹسمین' کے اداریے کا ترجمہ کر دیا کروں جو 'عصرِ جدید' کے 'افکار و آراء' کالم میں شائع ہونے لگا۔ اس کالم میں اردو اخباروں کے اداریوں کے اقتباسات شائع ہوا کرتے تھے۔ میرے ترجمے سے ایک ممتاز انگریزی روزنامے کے اداریے کے ترجمے کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا لیکن اس راہ میں نو وارد مسافر کی آبلہ پائی بھی قابلِ توجہ ہے۔ اس مشق پر چار پانچ گھنٹے صرف ہو جاتے۔ حامد محمود نیازی صاحب نیوز ایڈیٹر تھے۔ ان کو دیکھ کر کوئی بھی بلا بتلائے کہہ سکتا تھا کہ وہ لکھنؤ سے تشریف لا رہے ہیں لیکن ان کے باطن میں کیا کچھ تھا اس کا اندازہ کسی کو قطعی نہ ہو سکا جس کا واقعی انکشاف 'عصرِ جدید' اخبار اور کلکتہ شہر اور ملک ہندوستان سے ان کے رخصت ہونے کے برسوں بعد بالکل اتفاقاً ہوا۔ وہ باریک سنہری کمانی اور ہلکے رنگین شیشے والی عینک کے پیچھے کبھی اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں جھکا کر، کبھی بند کر کے، کبھی جھپکاتے ہوئے لیکن مجھ سے نظریں ملائے بغیر میرے ترجمے کو لفظاً اور حرفاً پڑھتے اور کاٹ کپٹ کے رکھ دیتے، پھر میں اس کو دوبارہ نقل کرتا، تب کتابت کے لیے دیتا۔ اس کیفیت میں ایک مہینہ گزر گیا تو عابدیؔ صاحب کی وساطت سے میں نے منیجر صاحب سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ آخر میں کتنے پانی میں ہوں، میرا مستقبل کیا ہے اور اس مشقت کا کوئی صلہ بھی ہے یا نہیں۔ جواب ملا: ''جی''۔ ''خان بہادر صاحب جو کچھ فرمائیں گے بتا دیا جائے گا۔'' سو اگلے دن بتا دیا گیا۔ اخبار کے کم و بیش دو کالم کے برابر یومیہ ترجمے کی اجرت تیس روپیہ ماہانہ یعنی ایک روپیہ یومیہ۔

اس ایک ماہ کی مدت کے دوران دیگر ساتھیوں سے بھی تھوڑا بہت ربط ضبط ہو چکا تھا لیکن بے تکلفی کی حد تک نہیں۔ اردو کے دوسرے اخباروں اور کارکنوں سے بھی کچھ دید شنید ہوگئی۔ اس برادری اور اس پیشے سے میرا تعلق کچھ اچٹا اچٹا سا تھا کیونکہ میں نے اخبار نویسی کو آئندہ مستقل پیشے کے طور پر تو قبول نہیں کیا تھا بلکہ ایک سال کی وقت گزاری اور خانہ پری کے طور پر اختیار کرلیا تھا۔ اور میری نظر اگلے برس یونیورسٹی پر لگی ہوئی تھی جس کا میں نے کسی سے انکشاف نہیں کیا نہ یہی کہ میں بڑے پاپڑ بیل کر اور کئی نوکریاں چھوڑ کر آیا ہوں۔ اس وقت سید محمد مصطفیٰ صابری صاحب 'عصرِ جدید' کے ایڈیٹر تھے اور ایڈیٹوریل لکھا کرتے تھے چونکہ وہ خان بہادر صاحب کے بچوں کے اتالیق بھی تھے، بلکہ پہلے اتالیق بعد میں ضرورت پڑنے پر ایڈیٹر بھی نامزد کردیے گئے اس لیے وہ ماسٹر صاحب بھی کہے جاتے تھے۔ سہارنپور کے رہنے والے تھے گورے چٹے چوڑے چکلے، ادھیڑ عمر، قمیص، سیدھا پاجامہ، نیوکٹ کالا جوتا اور رامپوری کالی ٹوپی ان کا مستقل پہناوا تھا۔ وہ پابندِ صوم وصلوٰۃ تھے، گو داڑھی پابندی سے شیو کرتے تھے اور مونچھیں باریک تراشی ہوئی ہوتیں، بڑے زندہ دل آدمی تھے اور بے تکلف لوگوں کے ساتھ تو منہ پھٹ ہونے کی حد تک بے تکلف ہوجاتے۔ ان کے کام کے اوقات نمازوں کے اوقات سے وابستہ تھے۔ عموماً ظہر کی نماز کے بعد دفتر میں آتے اور عصر کے وقت تک رہتے۔ کولہ ٹولہ کی مسجد میں عصر کی نماز کے بعد، جہاں خان بہادر صاحب بھی نماز پڑھتے، عموماً وہ خان بہادر صاحب کے صدر دفتر یا سکریٹریٹ میں چلے جاتے جو اسی سڑک پر ذرا آگے تھا۔ شام کو چائے وہیں نوش کرنے کے بعد پھر 'عصرِ جدید' کے دفتر میں آجاتے اور مغرب تک کچھ کام کرتے جس کی نوعیت وقت، ضرورت کے مطابق بدلتی رہی۔ چونکہ وہ خان بہادر صاحب کے بچوں کے اتالیق تھے اور یوں بھی ان کی دہلی والی برادری سے قربت رکھتے تھے اس لیے ان کے مقربین کے حلقے میں شامل ہوتے۔

سنا تھا کہ ان سے پہلے کئی مستند اور تجربہ کار صحافی سیرِ 'عصر جدید' سے فراغت حاصل کر چکے تھے کیونکہ اس اخبار میں صحافیوں کے قیام کی مدت کا شمار عموماً مہینوں میں ہوا کرتا تھا نہ

کہ سالوں میں، اس کا تعلق اس بات سے تھا کہ ان سے کوئی فروگزاشت ہوتی یا خان بہادر صاحب کے مصاحبین اور مقربین میں سے کسی کو کوکوئی بات ناگوار گزرتی، بس کسی کی چھٹی کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ چنانچہ صابری صاحب سے پہلے شین مظفر پوری، جن کا نام اردو ادب اور صحافت میں محتاج تعارف نہیں، ایک اور تجربہ کار صحافی ولی اللہ، جو ڈھاکہ جاکر گم ہوگئے اور اسرائیل احمد صاحب تھے جنھیں رخصت کیا جاچکا تھا۔ اسرائیل صاحب کا قدرے تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ رنگون سے شائع ہونے والے کسی اردو اخبار میں وہ کام کرتے تھے۔ جب دوسری جنگ عظیم برما کے دروازے پر دستک دینے لگی تو وہ وہاں سے فرار ہوکر کلکتہ آئے اور کسی وقت 'عصرِ جدید' سے وابستہ ہوگئے۔ ان کا قلمی نام 'رنگونی' تھا، وہ 'عصرِ جدید' میں اداریہ لکھتے تھے لیکن کسی قابلِ اعتراض تحریر کی اشاعت کی بنا پر ان کو برخاست کردیا گیا۔ اس کے بعد برسوں تک وہ شام کو شائع ہونے والے مولوی معزالدین کے اخبار 'الحق' کی زندگی کے ضامن رہے۔ جب مولانا سے ان کے تعلقات خراب ہوگئے تو وہ 'آزاد ہند' میں آگئے اور اس اخبار میں اداریہ لکھنے لگے۔ یہ بات ۱۹۵۸ء کی ہوگی، لیکن ۱۹۶۵ء کی ہند پاکستان جنگ کے بعد وہ ڈھاکہ پھر بنگلہ دیش بننے کے بعد وہاں سے کراچی چلے گئے پھر ان کے بارے میں کچھ نہیں سنا گیا۔ وہ کم گو اور کم آمیز تھے اپنے کام سے کام اور اپنے سگریٹ سے مطلب رکھتے تھے۔

'عصرِ جدید' میں کام کے سلسلے میں سب سے پہلے جس شخص سے میرا سابقہ پڑا وہ حامد محمود نیازی صاحب تھا۔ مراتب کے اعتبار سے وہ نیوز ایڈیٹر تھے۔ ان کی لیاقت کے سب معترف تھے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان کی واقعی صلاحیتوں کا کسی کو علم اور اندازہ نہ تھا ان کی تنخواہ ایڈیٹر مصطفیٰ صابری صاحب سے ۵۰ روپیہ زیادہ یعنی ۲۵۰ روپیہ ماہانہ تھی جو کہ بہت بڑی بات تھی۔ صابری صاحب کی تنخواہ دوسو روپیہ ماہوار تھی۔ حامد صاحب کے بعد قابلِ ذکر شخصیت بسنت کمار چٹرجی کی تھی جو حامد صاحب کے چلے جانے کے بعد 'عصرِ جدید' کے نیوز ایڈیٹر ہوئے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے وہ اصلاً بنگالی تھے لیکن ان کے والد جالندھر میں ریلوے سروس میں تھے اس لیے چٹرجی کا بچپن وہیں گزرا۔ وہ زبان، فکر اور پورے رویہ کے اعتبار سے

ایک ترقی پسند پنجابی تھے۔ ڈھیلے ڈھالے لمبے کرتے پاجامے میں کلین شیو لیکن زلفیں کچھ بڑھی ہوئی، دبلے لیکن چھریرے بدن کے صاف رنگ کے جوان، زبان اور اظہار پر ان کو کمال کی قدرت حاصل تھی۔ وہ پہلے دہلی کے کسی اخبار میں کام کر چکے تھے، اپنے والد کے ریٹائرمنٹ کے بعد اہلِ خاندان کے ساتھ اپنے آبائی وطن سیرامپور آ گئے ہوں گے اور پھر کلکتہ آئے ہوں گے۔ رات کو دو بجے کے قریب اخبار کی آخری کاپی بھیجنے کے بعد وہ خود اپنے افسانے وغیرہ لکھنے میں لگ جاتے، پھر کسی وقت اسی عمارت کی بالائی منزل کے ایک کمرے میں جا کر سو رہتے۔ ان کے اس تجرد اور تنہائی میں مولانا عطاء الرحمٰن صاحب شریک تھے۔ وہ اس وقت 'عصرِ جدید' میں کتابت کرتے تھے۔ رات کو کام ختم ہو جانے کے بعد وہ اوپر جا کر اسی کمرے میں سو جاتے۔ یہ دونوں دن بھر سوتے رہتے۔ چٹر جی نہا دھو کر چار بجے کے قریب نیچے اترتے اور سیدھے دھرمتلہ کی راہ لیتے جہاں اکثر ایک چائے خانے میں ابراہیم ہوشؔ، شین مظفر پوری وغیرہ کے ساتھ گل چھرے بازیاں ہوتیں، رات کو ٹھیک ۹ بجے 'عصرِ جدید' کی میز پر براجمان ہوتے۔ کوئی ڈیڑھ دو سال تک ہم دونوں ان اوقات میں شریک کار رہے۔ ۹ سے ۱۲ تک تین گھنٹے ہمیں دنیا کی خبر ہوتی تھی لیکن خود اپنی خبر نہیں ہوتی تھی۔

۱۲ بجنے میں ۵ منٹ باقی رہتے تو ہم دونوں لپک کر ہوٹل میں چائے کی آخری چسکی لیتے۔ اگست ۱۹۵۳ء میں شیخ عبداللہ کی نظر بندی اور چٹر جی کی برطرفی کے درمیان بظاہر کوئی ربط نہ سہی لیکن بہرحال دونوں واقعات کے درمیان ایک براہِ راست ربط تھا۔

'امروز' کا اجراء

ابتدائی چند مہینوں کے دوران عصرِ جدید میں میری مصروفیات یونہی سی رہیں لیکن بہرحال ترجمے کی مشق و مہارت بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ ۱۹۵۱ء میں نومبر کا مہینہ آ گیا اور 'عصرِ جدید' کے بطن سے ایک شام نامہ 'امروز' نمودار ہوا۔ میں اور مصطفیٰ صابری ہم دونوں نے اس نوزائیدہ کی اگوائی کی۔ اوپر کی منزل پر ایک کمرہ 'امروز' کے لیے الگ کر دیا گیا۔ صبح ۷ بجے سے ۱۰ بجے تک میں اور صابری صاحب 'امروز' کے لیے کام کرنے لگے۔ شام کو ہم دونوں بدستور 'عصرِ

جدید' کے لیے کام کرتے رہے۔ 'امروز' کی ادارت کے لیے پہلے اقبال احمد صاحب کا نام لکھا گیا جو 'عصر جدید' کے منیجر تھے۔ کوئی دفتری مسئلہ پیش آیا ہوگا اس لیے کسی اور اقبال کی تلاش شروع ہوئی۔ قرعہ فال اقبال کلکتوی کے نام نکلا لیکن اخبار کی پیشانی پر ان کا نام اقبال اعظمی چھپا۔ کسی تفتیش کے سلسلے میں ایک بار اسپیشل برانچ والوں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ ''اعظمی'' کیوں لکھتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا: ہمارا سلسلۂ نسبت حضرت امام اعظم سے ملتا ہے۔ انھوں نے مٹیا برج میں مرحوم نوابین اودھ کے باقیات میں سے کسی گھرانے سے ایک موہوم سا رشتہ جوڑ رکھا تھا۔ مختصر قد وقامت اور جسامت، کبھی قمیص پاجامے کالی شیروانی میں کبھی صرف قمیص پتلون میں، پان سے شوق بسیار، بڑے زندہ دل عجیب وغریب، قدرے پُراسرار شخصیت کے مالک تھے۔ 'امروز' میں جلد ہی ان کے دن پورے ہوگئے۔ ایک اور اقبال یعنی اقبال اکرامی صاحب نے ان کی جگہ لی۔

اقبال اکرامی صاحب 'امروز' میں آنے سے پہلے 'آزاد ہند' میں پروف ریڈر تھے۔ لیکن اس سے پہلے بھی کلکتہ کے مختلف اخبارات ورسائل سے وابستہ رہ چکے تھے۔ 'امروز' میں آجانے کے بعد آخر دم تک اس کے دم ساز رہے۔ چونکہ 'عصرِ جدید' اور 'امروز' دونوں اخبارات خان بہادر صاحب کی ملکیت میں تھے اور ان کا مینجمنٹ بھی ایک ہی تھا اس لیے اکرامی صاحب 'امروز' کے اداریہ کے علاوہ 'عصرِ جدید' میں 'فکاہات' کے کالم کے لیے بھی مضامین لکھنے لگے۔ مزید براں جب جب 'عصرِ جدید' میں اداریہ لکھنے والے آتے جاتے رہے درمیانی عرصے میں اکرامی صاحب خانہ پری کرتے رہے۔ بہرصورت وہ روزانہ ایک ہی نشست میں ذرا پینترے بدل بدل کر چائے کی چند پیالیوں اور ان گنت بیڑیوں کے مہمیز پر دو مضامین لکھ ڈالتے۔ کبھی کبھی ہم لوگ ازراہِ تفنن کہتے کہ اکرامی صاحب کی تحریریں کمال کی ہوتی ہیں، جس تحریر کو جہاں چاہو ایڈیٹوریل کے کالم میں یا فکاہات کے کالم میں لگادو۔ کبھی کہتے کہ بھائی دو ایڈیٹوریل رکھے ہیں دونوں اخباروں میں ایک ایک لگادینا۔ لیکن اس طرح کی باتوں کا برا ماننا تو دور رہا وہ بالکل سنی ان سنی کرجاتے۔ شام کے دربار میں خان بہادر صاحب بھی ان کی موجودگی سے لطف اندوز ہوتے۔

ڈھیلے ڈھالے کرتے پاجامے میں ملبوس مختصر قد وقامت کے اکرامی صاحب مرنجان و مرنج قسم کے آدمی تھے۔ وہ اعظم گڑھ اور جونپور کی سرحد پر واقع موضع صبرحد کے رہنے والے تھے۔خود انہی کی ایک تحریر کے مطابق وہ ۱۹۳۹ء میں پہلی بار کلکتہ آئے ،لیکن صرف ۹؍دن بعد واپس چلے گئے۔ پھر کچھ دنوں بعد کلکتہ آئے تو ہمیشہ کے لیے کلکتہ کے ہوکر رہ گئے۔ ۱۹۶۵ء کی ہند پاک جنگ کے دوران راتوں رات گرفتار کیے جانے والے اردو اخبار نویسوں میں اکرامی صاحب بھی شامل تھے، پھر کوئی دو مہینے بعد ان کی رہائی ہوئی۔ اپریل ۱۹۸۱ء میں اپنے وطن پہنچ کر ان کا انتقال ہوا۔ اس سے سال ڈیڑھ سال قبل کلکتہ میں ہی ان پر لقوے کا اثر ہوگیا تھا۔ حرمت الاکرام ان کے چھوٹے بھائی تھے۔ان کا ذکر آئندہ صفحات میں آئے گا۔

مہد و لحد:

کلکتہ کو اردو صحافت کی مہد اور لحد دونوں ہی کہا جاسکتا ہے۔ وہ یوں کہ اخبارات نکلتے رہے اور اپنی توانائی اور بساط بھر چل کر دم توڑتے رہے۔ ان میں سے بیشتر ہفت روزہ اور ماہنامے رہے ہیں۔ ابھی ۱۹۵۰ء والے عشرے کی بات ہورہی ہے۔ اس وقت صبح کے روزناموں میں ’عصرِ جدید‘، ’آزاد ہند‘ اور ’روزانہ ہند‘ تھے۔اسی عشرے کے اواخر میں ناظر الحسینی کی زیرِ ادارت ’اخوت‘ کی اشاعت شروع ہوئی جس نے کوئی خاص عمر نہ پائی۔ یہی حال ۷۱-۱۹۷۰ء میں ’سنگم‘ کا ہوا۔ غلام سرور صاحب کے پٹنہ سے شائع ہونے والے اخبار کا یہ کلکتہ ایڈیشن تھا۔ یہ خلافِ توقع بہت جلد بند ہوگیا۔شام کے اخباروں میں ’امروز‘، ’آبشار‘ اور مولانا معز الدین کا ’الحق‘ اور غازی اصلاحی کا ’انگارہ‘ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔’انگارہ‘ اور ’الحق‘ بڑے زور و شور سے بک رہے تھے۔اس عشرے کے اواخر تک دونوں خاموش ہوگئے۔ آگے چل کر وقار مشرقی کی ادارت میں ’غازی‘ کی اشاعت شروع ہوئی۔

انگارہ:

’انگارہ‘ شام کا اخبار تھا اور ’الحق‘ کی طرح اس کی بھی گرم بازاری تھی۔ ۱۹۵۰ء میں

عبدالوہاب غازی اصلاحی کے اس اخبار کی اشاعتِ ثانی شروع ہوئی۔ اس کی پہلی اشاعت ۱۹۳۹ء میں شروع ہوئی تھی لیکن چند ماہ بعد ہی اخبار بند ہوگیا۔ اس کی پالیسی مسلم لیگ کی طرفداری کی تھی جس کا آزادی کے بعد بدلے ہوئے حالات میں چلنا ممکن نہیں تھا لیکن غازی اصلاحی صاحب کی تند مزاجی اخبار میں نمایاں رہی اور اسی وجہ سے انھیں کئی بار گرفتاری اور نظر بندی سے دوچار ہونا پڑا، ان کا اخبار بھی کھلتا بند ہوتا رہا۔ ۱۹۵۸ء میں آخری بار بند ہوگیا۔ اس کے بعد غازی اصلاحی نے 'غازی' کے نام سے شام کا ایک اخبار نکالا جو کھلتا بند ہوتا رہا جسے بالآخر شیخ اکبر علی نے خرید لیا اور ان کے داماد وقار مشرقی اس کے مالک اور ایڈیٹر ہوگئے۔ یہ اخبار پابندی سے نکلنے لگا۔

عبدالوہاب غازی اصلاحی بنیادی طور پر خوش نویس تھے، صحافت میں سیاسی نشیب و فراز کا لحاظ رکھنا اور اسے برتنا ان کے فہم و ادراک سے باہر کی چیز تھی۔ یہی وجہ ان کی اور ان کے اخبار کی ناکامیوں کی ہوئی لیکن اس کے آخری انجام کا تذکرہ اور اس میں مضمر سبق کا بیان ضروری ہے۔ ہوا یوں کہ ۱۹۵۷ء میں مغربی بنگال اسمبلی کے انتخابات ہوئے۔ ریاست میں کانگریس پارٹی حکمراں تھی جس کے ایک ممتاز لیڈر ڈاکٹر بی سی رائے وزیرِ اعلیٰ تھے۔ اس وقت ملک کے عام حالات اور خصوصاً مغربی بنگال کے حالات میں ان کی پالیسی مسلمانوں کے تئیں گوارہ اور بڑی حد تک اعتدال کی تھی۔ بڑا بازار کے حلقے سے ڈاکٹر بی سی رائے کے مقابلے میں کمیونسٹ پارٹی نے کامریڈ محمد اسماعیل کو بطورِ امیدوار کھڑا کر دیا۔ جب انتخابی نتائج آنے لگے تو گنتی میں ڈاکٹر رائے کے ووٹ پیچھے چل رہے تھے بس غازی صاحب نے ایک زوردار سرخی ''کانگریس کی سب سے بڑی توپ لڑھک گئی'' کے ساتھ اپنا شام کا اخبار چھاپ دیا۔ لیکن ڈاک سے آئے ہوئے ووٹوں کو شامل کیے جانے کے بعد ڈاکٹر رائے جیت گئے۔ اس کے ساتھ ہی پولیس نے 'انگارہ' کے دفتر پر چھاپا مارا، اخبار بند ہوگیا اور غازی اصلاحی گرفتار کر لیے گئے۔

اس واقعہ میں ایک بات تو وہی جذباتی اور غیر سنجیدہ صحافتی رویہ والی ہے لیکن دوسری طرف مسلم صحافت کے تئیں حکومت کے عدمِ برداشت کا رویہ ہے ورنہ غیر کانگریسی بنگلہ اخباروں

کی نہ معلوم کیسی کیسی نامعقول تحریروں کو اربابِ حکومت نے برداشت کیا ہوگا۔ اس حقیقت سے میرے اس خیال کی تائید وتصدیق ہوتی ہے کہ آزادیِ وطن کے بعد مسلم صحافت اظہارِ خیال کی آزادی سے محروم ہوگئی۔ گھٹی گھٹی صحافت کا دور شروع ہوا جس میں رہنمائی کی صلاحیت مفقود تھی۔

جرائد کو کلکتہ کی فضا کبھی راس نہ آئی اس کی وجہ غالبًا یہ تھی کہ دہلی اور بمبئی کے پرچوں کی طرح ان کی اشاعت زیادہ نہیں ہوتی تھی اور اشتہارات کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا، چنانچہ بعض بڑے اچھے پرچے بند ہوگئے۔ مثال کے طور پر سالکؔ لکھنوی اور ابراہیم ہوشؔ کی ادارت میں شائع ہونے والا ہفتہ وار 'ایثار' جسے ظؔ انصاری کا عملی تعاون بھی حاصل تھا۔ ایک رائے یہ بھی تھی کہ ان کا وہ تعاون بڑا مہنگا پڑا۔ ۱۹۶۵ء میں ماہ نامہ 'فانوس ڈائجسٹ' عطاء الرحمٰن شاد نے نکالا جو پاکستان سے شائع ہونے والے ڈائجسٹوں جیسا تھا اور ہندوستان سے شائع ہونے والا پہلا ڈائجسٹ تھا اور میں بھی اس کی مشاورت میں شریک تھا لیکن دیکھتے دیکھتے اس کی دھڑکن بند ہوگئی۔ عطاء الرحمٰن نے جوف.س. اعجاز ایڈیٹر 'انشاء' کے بڑے بھائی ہیں، اس ماہ نامے کی اشاعت میں بڑا گھاٹا برداشت کیا۔ ۱۹۵۰ء والے عشرے میں شائع ہونے والے پرچوں میں 'کندن'، 'نباض'، 'ایشا' وغیرہ شامل تھے۔ اتفاق سے ہفتہ وار 'ایشیا' کا اداریہ میں لکھ رہا تھا جس کی اجرت دس روپیہ فی شمارہ طے پائی تھی لیکن جب پرچہ بند ہوا تو تین چار اداریوں کی اجرت باقی رہ گئی تھی۔ عبدالجبار جابرؔ فیروز پوری نے مشورہ دیا کہ یہ پیسے تو مل نہیں سکتے ہاں چیت پور روڈ کے جن دکانداروں کے اشتہارات شائع ہوئے ہیں وہ پیسے کے بدلے کپڑے دینے کے لیے تیار ہیں چاہو تو تم بھی لے لو چنانچہ وہ پینٹ اور شرٹ کے ایک ایک پیس مجھے دے گئے۔

اشتہارات ہی اخبار کی زندگی کی ضمانت بلکہ ان کے لیے آکسیجن ہوتے ہیں، اردو اخبارات ورسائل کے لیے یہ وسائل انتہائی محدود اور برائے نام تھے۔ روز ناموں کو سنیما اور کلکتہ کارپوریشن کے اشتہارات کے علاوہ کبھی کبھی ریاستی حکومت کے اعلانات مل جاتے۔ سنیما کی پبلسٹی سے متعلق ایک شخص نوٹیال صاحب تھے۔ دھرم تلہ میں ان کے دفتر سے روز

شام کو فلمی اشتہارات تقسیم ہوتے وہاں ان روزناموں کا ایک ایک آدمی موجود ہوتا، وہ اپنے حصے کے اشتہارات لے کر چلا آتا۔ وہاں سے قریب ہی اس علاقے میں کلکتہ کارپوریشن کا دفتر بھی ہے، اس لیے ایک ہی شخص ادھر بھی بڑھ کر دیکھ لیتا۔ یوں بھی چونکہ ان اشتہارات کا سلسلہ کمیشن کے ایک داخلی نظام سے جوڑا ہوا تھا اس لیے ان کے حصول کے لیے زیادہ پریشانی کی ضرورت نہ تھی، کارپوریشن کے اشتہاروں کا معاملہ تو بہت ہی دلچسپ تھا۔ چونکہ ان اشتہاروں کے لیے گنجائش کی حدود کا تعین نہیں ہوتا تھا اس لیے ساری عبارت ممکن حد تک بلکہ اس سے بھی زیادہ کشش کے ساتھ لکھی جاتی مثلاً پورے ایک کالم کی چوڑائی میں صرف ''کشش' لکھا جاتا۔

رقابتیں:

اردو روزناموں کے درمیان کئی طرح کی چشمکیں اور شدید رقابتیں جاری تھیں جو ابتذال کی حدوں سے بھی گزر گئی تھیں۔ دراصل یہ رقابتیں شخصی اور ذاتی تھیں جس کی روایت آزادی سے قبل ہی قائم ہوگئی تھی۔ چونکہ ہر اخبار میں طنز و مزاح کے کالم ہوا کرتے تھے مثلاً 'عصرِ جدید' میں 'فکاہات'، 'آزاد ہند' میں 'نمکدان' اور 'روزانہ ہند' میں 'کہنے کی باتیں' اس لیے یہ کالم لکھنے والوں کے لیے اپنے قلم کی جولانیاں دکھانے کے خوب خوب مواقع تھے۔ 'عصرِ جدید' میں مصطفیٰ صابری تھے اور 'روزانہ ہند' میں شین مظفر پوری نے تو 'حرامزادے کی سرگزشت' لکھ کر بدزبانی کی انتہا کر دی۔ آزادی کے بعد ان اخباروں کے درمیان سیاسی رقابت کی بظاہر کوئی خاص وجہ باقی نہیں رہی تھی کیونکہ 'عصرِ جدید' کے مالک خان بہادر شیخ محمد جان صاحب پکے کانگریسی تھے اور اسی پارٹی کے نامزد ایم ایل سی بھی رہے۔ 'روزانہ ہند' کے مالک طیب بھائی ظریف سونا پگڑی گجراتی برادری سے تعلق رکھتے تھے اور تجارت پیشہ کانگریسی تھے۔ 'آزاد ہند' کے بانی مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مولانا آزاد کے مقربین میں سے تھے اس لیے احمد سعید ملیح آبادی کو کانگریس نوازی وراثت میں ملی تھی۔ یوں اپنی فراست سے انھوں نے ریاست میں بائیں بازو کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد اس پارٹی اور حکومت سے بھی رشتے استوار کر لیے۔

یوں بھی کلکتہ کے اردو اخباروں کے لیے حکومتِ وقت کی ہاں میں ہاں ملانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا اس پر بھی جیسا کہ بعد کے حالات و واقعات سے ثابت ہے ان کی جان بخشی اور آبرومندی محال تھی۔ چنانچہ ان حالات میں ان اخباروں کے درمیان سیاسی رقابتوں کا کوئی سوال نہ تھا۔ اگر تھا تو بس اتنا ہی کہ وفاداری میں کون آگے ہے۔

اخباروں کے درمیان ایک دلچسپ چشمک صحافیوں سے متعلق تھی یعنی جب کوئی اخبار نویس ایک اخبار سے نکالا جاتا تو دوسرا اس کو کام سے لگالیتا۔ اس کے کئی فائدے تھے ایک تو یہی کہ وہ اخبارنویس، ڈال کا چھوٹا بندر، نئی ڈال ہاتھ آنے پر جو اجرت بھی پاتا اس پر خاموشی سے راضی ہوجاتا، دوسرے یہ کہ اس کی زبانی حریف کے متعلق کچھ اندر کی باتیں سننے کو مل جاتیں، گویا یہ شٹل کاک کی طرح مستقلاً ادھر سے اُدھر ہوتے رہتے۔ ان اخبارنویسوں میں معدودے چند ایسے تھے جو کسی اخبار سے چپک کر کام کرتے رہے جس کی موجودہ مثالیں 'آزاد ہند' میں سید منیر نیازی اور 'آبشار' میں رئیس جعفری ہیں۔ اخبارنویسوں کی دوسری قسم جو اصلاً ٹیچر تھے ان میں کارپوریشن اسکولوں سے لے کر کالج تک کے اساتذہ شامل تھے۔ مالکان اخبار کے لیے یہی لوگ سب سے زیادہ کارآمد تھے۔ ان میں شام یا رات کو ترجمہ کرنے والے، اداریہ اور دوسرے کالم لکھنے والے یا اسپورٹس رپورٹنگ وغیرہ کرنے والے ہر طرح کے لوگ شامل تھے، اس معاملے میں سب سے کامیاب مثال جاوید نہال کی تھی جو ہر خانے میں فٹ تھے۔ یہ دراصل پروفیسر نہال حسن ہاشمی تھے جو نہایت خاموش اور پرسکون مزاج کے آدمی تھے۔ بعض اخبارنویس بیک وقت دو اخباروں میں ترجمہ یا رپورٹنگ کرتے تھے مثلاً جاوید نہال صاحب کے شاگرد رشید ڈاکٹر مشتاق احمد یا شہزاد منظر جو بعد میں کراچی جا کر 'جنگ' میں ادبی تنقید کا کالم لکھنے لگے۔ انہیں بنگلہ ادب میں بھی خاصا درک تھا۔ کچھ اخبارنویس میرے جیسے بھی تھے جو کسی اخبار میں شام یا رات کو کام کرنے کے علاوہ دن میں کسی اور ادارے کے لیے جز وقتی کام کرتے۔ غرضیکہ اردو اخبارات بڑی حد تک جز وقتی اخبارنویسوں کے سہارے چلتے رہے اور یہی صورتِ حال آگے چل کر ایک بڑے جھگڑے کا سبب بنی۔

خبریں اور مضامین:

صبح کے تینوں اخبارات پی ٹی آئی کی سروس لیتے تھے۔ پہلے تو ہینڈ سروس تھی بعد میں پی ٹی آئی کے ٹیلی پرنٹر ان دفتروں میں لگ گئے۔ ان اخباروں میں اندر کے صفحات کے لیے زیادہ تر خبریں تو مقامی انگریزی اخباروں سے لے کر ترجمہ کی جاتیں کچھ بیرونی معاصرین سے مل جاتیں۔ پی ٹی آئی سے حاصل ہونے والی خاص خاص خبریں صفحہ اول اور آخر پر ہوتیں۔ یہ مشکل کام تھا۔ آخری شفٹ میں چار پانچ کاتب ہوتے اور 'عصرِ جدید' میں تو سارے کاتب واقعی اساتذہ کے درجے کے تھے۔ مترجم صرف دو اور خبروں کا ازدہام جن کو کاٹنا چھانٹنا یعنی ایڈٹ کرنا نیوز ایڈیٹر کا کام تھا اس پر ترجمہ مستزاد تھا۔

ہمارے اخباروں کے لیے مضامین تو عموماً مختلف اخباروں سے لیے جاتے بلکہ ان کے درمیان سال بہ سال گردش کرتے رہتے۔ جلد ہی 'گلوب' اور بعد میں 'نافین' (نیرا اینڈ فار ایسٹ نیوز ایجنسی) نام کی فیچر ایجنسیاں وجود میں آئیں جو انگریزی اور بنگلہ اخباروں کو فیچر فراہم کرتی تھیں وہی اردو اور ہندی اخباروں کو بھی فیچر فراہم کرنے لگیں۔ اتفاق سے مقامی خبروں کا ایک بنگالی رپورٹر چودھری تھا جو انگریزی اور بنگلہ اخباروں کو چھوٹے موٹے واقعات اور وقوعات اور دلچسپ یا اہم عدالتی فیصلوں کی رپورٹیں فراہم کرتا تھا، وہی اپنی انگریزی رپورٹ کی ایک ایک کاپی ہمارے تینوں اخباروں کو بھی دے دیتا لیکن ان اخباروں میں اسپورٹس رپورٹر اپنے اپنے تھے۔ وہ دراصل صرف فٹ بال میچوں کی رپورٹنگ کرتے جو کلکتہ میں ایک مقبول کھیل تھا۔ مسلمانوں میں محمڈن اسپورٹنگ کلب کی روایت باقی تھی چنانچہ اس سلسلے کی دیگر روایتیں بھی جوں توں جاری تھیں۔ یہی حال فلمی تبصروں کا تھا۔ چونکہ مسلمان اچھے فلم بیں یا فلمی شائق ہونے کی شہرت رکھتے تھے اس لیے اردو اخباروں کو فلمی اشتہارات بھر پور ملتے تھے اور اسی وجہ سے ہر فلم کے ریلیز ہونے سے پہلے اس کے پریس پری ویو میں اردو اخباروں کو دو دو پاس ضرور دیے جاتے۔ جس میں سے ایک پاس فلمی تبصرہ لکھنے والے کو ملتا جو کہ بڑی خوش قسمتی کی بات سمجھی جاتی تھی۔ کئی برس تک میں بھی ایسے خوش قسمت افراد میں شمار کیا جاتا رہا۔ سرکاری

ضیافتوں کے دعوت نامے عموماً بڑے صاحبان کے حصے میں جاتے اور ان امور کی رپورٹنگ یونہی سنی سنائی کر دی جاتی۔ یہ قصے طولانی ہیں ان کی مزید تفصیلات میں جانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ابتلا کا مختصراً تذکرہ کر دوں کیونکہ وہ بھی اس وقت مسلمانوں کی عام کیفیات اور سیاسی حالات پر ایک تبصرے کی حیثیت رکھتا ہے۔

ایک برس بعد:

'عصرِ جدید' میں ایک سال گزار لینے کے بعد جولائی ۱۹۵۲ء میں جب کالج کا نیا سیشن شروع ہونے کا وقت آیا تو میں نے پھر یونیورسٹی کا رخ کیا اور ایم ایس سی (سائیکالوجی) میں داخلے کا فارم لایا لیکن خیال ہوا کہ کسی سفارش کے بغیر یہ کام نہ ہو سکے گا۔ لیکن سفارش کس سے کرائیں؟ خیال مدرسہ عالیہ کے پرنسپل مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی طرف گیا، چنانچہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور مدعا بیان کیا۔ ان کا جواب مختصر اور مسکت تھا۔ ''اس وقت تو مولانا آزاد بھی مسلمانوں کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔'' یہ سننے کے بعد میں سیدھے سائنس کالج گیا اور داخلہ فارم جمع کر دیا۔ ظاہر ہے یہ بھی ایک سعی لاحاصل تھی لیکن پھر بھی کچھ حاصل ہوا۔ میں براہِ راست ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ سے ملا اور انھیں بتایا کہ میں نے کس طرح اسی انتظار میں پورا سال گزارا ہے۔ انھوں نے بڑی نرمی سے یہ بات سمجھا دی کہ محدود نشستیں ہونے کی وجہ سے میرا داخلہ محال ہے۔ پھر میری دل شکستگی نے مجھے قائل کر دیا کہ ایک ہندوستانی مسلمان واقعی دوسروں سے مختلف ہے اس لیے جو کام مل جائے اس کو دانت سے پکڑو چنانچہ میں اٹھارہ برس تک 'عصرِ جدید' کی ہڈی کو دانت سے پکڑے رہا اور امکانات کے ناپیدا کنار سمندر میں ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ دو برس بعد ۱۹۵۳ء میں کلکتہ یونیورسٹی میں پوسٹ گریجویٹ جرنلزم کورس شروع ہوا تو ایک بار پھر ہمت کر کے وہاں پہنچ گیا۔ اردو کے پہلے اخبار نویس کو ۱۹۵۴ء میں صحافت کے یونیورسٹی کورس میں داخلہ مل گیا۔ اگلے دو ڈھائی برس کے لیے مصروفیات میں شام کو ۴ بجے سے ۸ بجے تک کا اضافہ ہو گیا۔ بحیثیت مجموعی چار پانچ سال کی اس پُرمشقت مدت میں طبیعت اخباری زندگی سے مانوس ہو گئی اور مزاج میں جو تھوڑی سی انانیت تھی اس کی کسی قدر تسکین کا

سامان بھی اس دنیا میں موجود تھا۔

پتھر کا دور:

لگے ہاتھوں اردو اخباروں کی اشاعت و طباعت کا بھی مختصراً جائزہ لے لیا جائے۔ یوں بھی اس باب میں کہنے کے لیے زیادہ کچھ نہیں ہے کیونکہ اس وقت تک اردو اخباروں کی طباعت پتھر کے دور سے باہر نہیں آئی تھی یعنی ایک خاص قسم کے کیمیکل کی پالش کیے ہوئے پیلے کاغذ پر سارے مواد کی کتابت کی جاتی پھر اس کو چکنے پتھر کی سلوں پر منتقل کیا جاتا اس کے بعد زمانہ قدیم کی یادگار لیتھو مشین پر چھپائی ہوتی۔ ابھی دھات کا زمانہ آنے کو تیس برس کی دیر تھی، یعنی ۱۹۸۰ء کے آس پاس 'اخبارِ مشرق' کی اشاعت سے کلکتہ میں آفسٹ مشین پر اردو اخباروں کی اشاعت کا آغاز ہوا۔ کمپیوٹر کے ذریعے کمپوزنگ کے رواج کو ابھی مزید بیس برس باقی تھے۔ اس کے آغاز کا سہرا بھی 'اخبارِ مشرق' کے سر ہے جس کا دہلی ایڈیشن بھی جاری ہے۔ اس اعتبار سے کلکتہ کے اخباروں میں 'اخبارِ مشرق' کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ لیکن لیتھو مشینوں کے ذریعہ اردو اخباروں کی طباعت کے حق میں یہ بات جاتی ہے کہ ان مشینوں کے سستی اور کم خرچ ہونے کی وجہ سے کم حیثیت اردو اخبارات انھیں خریدنے اور کام چلانے کی جسارت کر سکتے تھے مزید براں یہ حقیقت بھی ہے کہ اخباروں کی اشاعت کم ہونے کی وجہ سے انھیں وقت کی کمی کے دباؤ کا سامنا نہیں تھا اور اگر کہیں یہ مسئلہ درپیش بھی ہوا تو اس کا حل ممکن تھا۔ مثال کے طور پر 'آزاد ہند' میں اسی طرح کی دو مشینیں بہ یک وقت استعمال کی جاتیں وہ یوں کہ ایک فاضل چربہ لے کر اس کو دوسری مشین کے پتھر پر ٹرانسفر کر دیا جاتا اور وہ بھی اس طرح کارآمد ہو جاتی۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس کسمپرسی کے زمانے میں کم خرچ لیتھو مشینوں نے اردو اخباروں کو زندگی کی ضمانت دی اور یہ بھی کہ ان کی اسی خوبی کی وجہ سے ملک کے ہر خطے میں شہر شہر قریہ قریہ اردو اخبارات نکلتے رہے۔

اردو اخباروں میں اخبار نویسوں اور مترجموں سے کہیں زیادہ تعداد کاتبوں کی ہوا کرتی تھی۔ اس وقت تک خوش نویسی ایک معتبر اور معزز فن تھا۔ 'عصرِ جدید' میں تو اس فن کے کئی

اساتذہ موجود تھے لیکن ظاہر ہے اخبار کے لیے کتابت میں وقت کی تنگی کی وجہ سے فن کے مظاہرے کی چنداں گنجائش نہیں ہوتی تاہم اشتہارات وغیرہ کی کتابت میں اس کا موقع ہوا کرتا تھا۔ کاتب حضرات زبان میں بھی اچھی مہارت رکھتے تھے اور ادبی لیاقت بھی۔ ان میں شاعر، افسانہ نگار اور علماء شامل تھے۔ دراصل مدارس میں ایک زائد فن کے طور پر خطاطی کی تعلیم دی جاتی تھی اس لیے مدارس کے فارغین اپنی اس صلاحیت سے فائدہ اٹھانے کے لیے اخباروں کا رخ کرتے اور کبھی کبھی اخباری تحریروں کی ناہمواریاں درست کرنے میں بھی معاون ہوتے۔ اب زبان اور علم کے عمومی انحطاط کے دور میں اس فن اور اس کے ساتھ علمیت کا تصور محال ہے۔ اس زمانے میں یعنی آزادی کے بعد کی افراتفری میں اردو اخباروں کا سرکولیشن بہت کم رہ گیا تھا اس لیے پرانی لیتھو مشینوں پر ان کی چھپائی سے کام چل جاتا تھا لیکن اب یہ معجزہ سامنے آرہا ہے کہ جوں جوں اردو زبان کی سانس ٹوٹنے کی بدشگونیاں کی جارہی ہیں اردو اخباروں کی اشاعت بڑھتی جارہی ہے اور اگر آفسٹ پرنٹنگ نہ اختیار کی گئی ہوتی تو اخباروں کی مانگ کو پورا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

■❖■

باب دوم

۱۹۴۷ء کا انقلاب

مسلم سیاست:

کلکتہ اردو پریس کے اس سرسری تعارف اور اس میں میرے الجھنے کی علت بیان کرنے کے بعد یہ جائزہ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک ۹۰ ربرس کی رہِ دراز طے کرنے کے بعد ہمارا اردو پریس جسے کلکتہ میں مسلم پریس کہنا مناسب ہوگا کہاں پہنچا تھا اور کہاں کھڑا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے آس پاس ملک پر اور ہمارے اخباروں پر بھی جو قیامت گزری اس سے قطعِ نظر بنگال میں وہ سب کچھ سو برس پہلے سے ہوتا آیا تھا۔ جن انگریزوں نے مرشدآباد میں نوابی کا قلع قمع کیا ان سے بنگال کی دیسی صحافت بھی دست وگریباں تھی۔ اس وقت اردو صحافت کتم عدم میں محوِ خواب تھی، جب انیسویں صدی کے دو عشرے گزار کر وہ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی تو اس کے نقوش غیر واضح تھے اور اگلے کئی عشروں تک اسی حال میں بادیہ پیما رہی لیکن شمالی ہند میں اس کے نقوش واضح ہوتے جا رہے تھے اور اس کے اثرات بھی سامنے آ رہے تھے۔ مولانا آزاد اور مولانا محمد علی جوہر کی صحافتی کاوشیں مسلمانوں کے جس طبقے اور حلقے پر اثر انداز ہو رہی تھیں تحریکِ خلافت سے متاثر وہی حلقے رفتہ رفتہ انڈین نیشنل کانگریس کے زیرِ اثر آئے، لیکن بنگال میں اس کی آواز میں کوئی خاص زور نہیں تھا۔ ۱۹۳۰ء کے عشرے میں مسلم سیاست گرم ہوئی تو اس کا رخ اور رجحان مسلم لیگ کی طرف تھا اور ۱۹۴۰ء کے عشرے میں اس کا وہ رنگ گہرا ہوتا گیا۔ ۱۹۴۵ء میں دوسری عالمی جنگ کے اختتام پر اس سیات کی شدت انتہا کو پہنچ گئی۔ اگست ۱۹۴۶ء میں کلکتہ میں مسلم لیگ کے اعلان کردہ ڈائریکٹ ایکشن کے طفیل ہونے

والے فسادات مسلم اکثریتی بنگال میں خاک وخون کی طویل داستان کی تمہید ثابت ہوئے۔

اسی وقت بنگال کی اس صورتِ حال کی طرف اشارہ کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بنگالی مسلمان آبادی کے اعتبار سے تو اکثریت میں تھے لیکن ان کی حیثیت رعیت کی تھی اور ان میں تعلیم کی بھی کمی تھی۔ ہندو بنگالی اقلیت میں تھے لیکن ان کا زمیندار طبقہ غالب تھا، ان میں تعلیم بھی یقیناً زیادہ تھی اور ان کے یہاں دانشوری اور روشن خیالی کی روایتیں راسخ ہوچکی تھیں چنانچہ بنگلہ زبان میں شائع ہونے والے اخبارات انہی کے مفادات کے پاسدار اور انہی کی سوچ کے ترجمان تھے۔ اس کے برعکس مسلم رائے عامہ کی ترجمانی اردو اخباروں کے ذریعہ ہورہی تھی اس پس منظر میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کلکتہ میں اردو روزنامہ 'روزانہ ہند' موجود تھا جو مولانا عبدالرازق ملیح آبادی کی زیرِ ادارت کانگریس پارٹی کی پالیسیوں کا ترجمان تھا لیکن مسلم رائے عامہ پر اس کا کوئی خاص اثر نہ تھا، اس کے مقابلے میں مولانا شائق احمد عثمانی کا اخبار پکا مسلم لیگی تھا۔ مولانا کا جذام کا مرض شدت اختیار کر گیا تو وہ اپنے وطن بہار چلے گئے لیکن آزادی ملتے ہی وہ کلکتہ آئے اور 'عصرِ جدید' کی ساری فائیلیں وغیرہ لے کر ایک چارٹرڈ ہوائی جہاز کے ذریعہ پاکستان چلے گئے۔

ایک پریشان کن سوال:

ایک سوال جو موجودہ مضمون سے براہِ راست متعلق تو نہیں ہے لیکن مجھے ہمیشہ پریشان رکھتا ہے کہ مسلم سیاست پر غالب قائدین نے تشکیل پاکستان، صوبوں کی تقسیم، لاکھوں جانوں کی تلفی اور کروڑوں مسلمانوں کے نقلِ مکانی کے بعد کی صورتِ حال پر کیوں نہ غور کیا؟ برصغیر کا مسلمان تین دھڑوں میں تقسیم ہوگیا۔ ان میں سے سب سے بڑا حصہ ہندوستان ہی میں رہا تو اس کے مستقبل کے بارے میں کیوں نہ سوچا؟ اسلاف کی میراث اور بزرگوں کے آثار و باقیات کے تحفظ کا بار وہ کس کے کاندھوں پر چھوڑ گئے؟ کیا مضمحل فکر پر جذبات اس حد تک غالب آگئے کہ مزید ضبط وتحمل کا یارا نہ رہا؟ بنگالی ہندو اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ ایک مسلم اکثریتی صوبے میں انھیں مسلم رائے عامہ کے دباؤ میں رہنا ہوگا اس لیے وہ خود اسے تقسیم کرکے

اپنے حصے میں اپنی آزادی کو مکمل اور مستحکم کرنا چاہتے تھے لیکن اس تقسیم کی ذمہ داری انھوں نے مسلم سیاست پر ڈال دی۔ اس کھیل کو آخر کیوں نہ سمجھا گیا؟

تقسیمِ ہند کے بعد جو بنگالی مسلمان مغربی بنگال، آسام اور بہار کے مشرقی اضلاع میں رہ گئے وہ بالکل بے زبان ہو گئے۔ ان کے مذہبی اور ذاتی تحفظ کے بنیادی مسائل بقیہ سارے مسلمانوں کے ساتھ مشترک تھے۔ معاشی اور معاشرتی مسائل کا بھی کم و بیش یہی حال تھا جن پر توجہ کا نہ کسی کو ہوش و حواس تھا نہ کوئی سننے والا تھا۔ ان حالات میں کلکتہ کے اردو اخبارات ہی ان کے جذبات اور احساسات کے ترجمان تھے اور ان کے مسائل کو اٹھاتے تھے اس کیفیت کو ایک اعتبار سے ماضی کا تسلسل بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ حکمراں بنگالی مسلمان اور سیاسی لیڈر زبان کی بنیاد پر کوئی تفریق یا امتیاز نہیں برتتے تھے۔ ان میں سے اکثر علی گڑھ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ، اردو تہذیب سے آشنا تھے۔ اس سیاق و سباق کا تذکرہ ضمناً یہاں اس لیے کر دیا گیا کہ اب اصل صورتِ حال، آزادی کے عواقب، اردو پریس پر اس کے اثرات کا تفصیل سے تذکرہ کیا جائے گا۔

بدلے ہوئے حالات:

ہمارے دیسی پریس میں عموماً اور اردو پریس میں خصوصاً یہ روایت چلی آ رہی تھی کہ ایڈیٹر ہی اخبار کا مالک ہوا کرتا تھا اور قانون کی کسی خلاف ورزی کی پاداش بھی وہی جھیلتا۔ دوسرے یہ کہ ایڈیٹر کی تحریریں اخبار کی مقبولیت اور اشاعت میں اضافے کا موجب ہوتیں لیکن بنگال میں مسلم لیگ کی سیاست کے زیرِ اثر مسلم لیگ کی پالیسی کی تائید و حمایت اخبار کی مقبولیت کا سبب ہونے لگی چنانچہ 'عصرِ جدید' کی مقبولیت بڑھتی گئی اور اس کے مقابلے میں کانگریس کی پالیسیوں کے حامی 'روزانہ ہند' کی مقبولیت کم ہو گئی۔ آزادی کی صبح طلوع ہوتے ہی کلکتہ کی اردو صحافت میں واقعی انقلاب آ گیا۔ پیچیدگی صرف اتنی ہی نہیں تھی کہ مسلم لیگ کی سیاست کے لیے کوئی جگہ نہیں رہ گئی تھی بلکہ وہ اصحاب قلم بھی افراتفری کی نذر ہو گئے تھے جن کی تحریروں سے اخبار کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا۔ پڑھنے والے بھی بدحواس تھے۔ دیگر زبانوں، خصوصاً بنگلہ اور

انگریزی اخباروں کا معاملہ یوں تھا کہ بھرپور آزادی کا احساس ان کے غبارے میں ہوا بھرتا جا رہا تھا۔ جو کچھ افراتفری اور بے سمتی تھی وہ اگلے دو تین برسوں میں پالیسی کی بنیادوں پر مستحکم ہوگئی اور ایک نئی توانائی کی سرشاری سارے تکدرات پر غالب آ گئی۔

جب صحافت صنعت بن گئی:

لیکن اسی وقت دنیائے صحافت میں ایک نئی تقسیم کے نقوش روز بروز زیادہ واضح ہوتے گئے۔ ایڈیٹر مالک تو رہا لیکن اخبار ایک صنعت بنتا جا رہا تھا جسے اکیلے اپنے بل بوتے پر چلانا کسی مالک کے لیے ممکن نہ تھا۔ اس کے علاوہ اس صنعت میں جو شرکاء تھے ان کی حیثیت پیشہ ور ملازمین کی ہوگئی۔ بنگال میں سوشلزم کسی نہ کسی شکل میں پرورش پا رہا تھا۔ اس کی چھتر چھایا میں مزدور تحریک پل رہی تھی۔ نئی اخباری صنعت کے ورکر سفید پوش تھے لیکن ان کی اجتماعی قوت اتنی نہ تھی کہ ایڈیٹر اور مالک سے، جو اب سرمایہ دار بن چکے تھے، اپنے استحقاقات تسلیم کرا سکے چنانچہ اخبار نویسوں کی تنظیم نے ٹریڈ یونین تحریک سے اپنا رشتہ جوڑا۔ اس کیفیت نے صحافیوں کے درمیان بھی عجب تفریقیں پیدا کر دیں مثلاً وہ اخبار نویس جو خالصتاً ملازم تھے، دوسرے وہ جو خالصتاً مالک تھے، تیسرے وہ جو مالکانہ حیثیت کے باوجود عملاً سرگرم تھے یا وہ جو چھوٹے اخباروں کے مالک تھے اور زیادہ تر کام خود ہی کیا کرتے تھے اور اخبار کی ملکیت کے باوجود ان کی مالی حیثیت ایسی نہیں تھی کہ ان کا شمار سرمایہ داروں میں ہوتا۔ اخباری صنعت کی اس ناہمواری سے حکومت آگاہ تھی چنانچہ اصل صورتِ حال کی وضاحت اور اس سلسلے میں آئندہ قانون سازی میں معاونت کی غرض سے حکومتِ ہند نے ۱۹۵۲ء میں پہلے پریس کمیشن کی تشکیل کی جس کی رپورٹ ۱۹۵۵ء میں پیش کی گئی۔ اس کے ممکنہ اثرات کا اخباری صنعت کے دونوں خاص فریقوں کو خوب احساس تھا اس لیے دونوں طرف صف آرائیاں ہونے لگیں۔ اس کیفیت سے متاثر ہوئے بغیر اردو اخبارات بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ اس وقت تک بطورِ صحافی میری حیثیت نہ مستحکم تھی نہ مستند، نہ کوئی خاص سیاسی نظریہ رکھتا تھا، نہ ہی بنگال کے حالات کا اندازہ تھا۔ نئی صف آرائیاں دیکھ رہا تھا لیکن اس میں مجھے خود اپنا کوئی مقام نظر نہیں آتا تھا مگر یہاں بھی اتفاقاً

اس چوکھٹ پر میرا پاؤں پڑ گیا جہاں دیر سویر پہنچنا ہی تھا۔

میں نے بتایا نہ کہ حامد صاحب کے جانے کے بعد ۱۹۵۲ء میں بسنت کمار چٹرجی 'عصرِ جدید' کے نیوز ایڈیٹر ہو گئے تھے۔ یہ بھی بیان کر چکا ہوں کہ وہ طبعاً ترقی پسند تھے، بنگال کی آب و ہوا ان کو راس آئی۔ میں اپنا کوئی سیاسی نظریہ یا موقف نہ رکھنے کے باوجود ان کی باتیں تو سنتا ہی رہتا تھا پھر واقعات پر ان کے تبصرے بھی۔ ایک دن وہ مجھے انڈین جرنلسٹس ایسوسی ایشن، ویسٹ بنگال کے دفتر میں لے گئے اور کہا کہ ایک اخبار نویس ہونے کے ناطے تم کو اس تنظیم کا ممبر ہونا ہی چاہیے۔ مجھے اس میں کوئی حرج نہ معلوم ہوا۔ اسی جگہ ایک ممبر شپ فارم لے کر اس کی خانہ پری کی گئی اور اس کے بعد میں اس ایسوسی ایشن کا ممبر بن گیا۔ رفتہ رفتہ اس کی کارگزاریوں سے دلچسپی بڑھتی گئی اور بنگال کے سینئر صحافیوں سے متعارف بھی ہوتا گیا۔

جرنلزم کورس:

اسی وقت کلکتہ یونیورسٹی کے جرنلزم کورس میں داخلہ اور اس کا تذکرہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ۱۹۵۳ء میں یونیورسٹی میں نیا دو سالہ پوسٹ گریجوٹ جرنلزم کورس تو شروع ہو گیا لیکن یہ ڈپلومہ کورس تھا، اس کو ایم اے کی حیثیت نہیں دی گئی۔ دیگر مضامین کی طرح اس نئے مضمون کے اساتذہ بھی نہیں تھے۔ چنانچہ آٹھ پرچوں کی تدریس کے لیے انگریزی اور بنگلہ کے سینئر صحافیوں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ سن رسیدہ ہمندر پرشاد گھوش تھے۔ جو ۱۹۱۴ء میں جاری ہونے والے بنگلہ روزنامہ 'بسومتی' کے بانی تھے۔ وہ بنگالی قوم پرستی کے زبردست علمبردار تھے۔ گاندھی جی کو بابائے قوم تسلیم کرنے سے شدت سے انکار کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہندوستان کو نیشنلزم کا تصور بنکم چندر چٹرجی نے دیا۔ بنگال کے ایک قدیم اور ممتاز انگریزی ماہنامہ 'ماڈرن ریویؤ' کے ایڈیٹر مسٹر چٹرجی، جنھیں اس جریدے کی ملکیت اور ادارت میراث میں ملی تھی، جرائد کی ایڈیٹنگ پر لیکچر دیتے۔ ڈاکٹر ڈی این سین جو کلکتہ یونیورسٹی میں لا کے پروفیسر تھے صحافتی قوانین اور ضوابط کا درس دیتے۔ وہ کئی برس ماسکو میں رہ چکے تھے اسی سے ان کے سیاسی نظریات و افکار کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مسٹر داس گپتا 'ہندوستان

اسٹینڈرڈ' کے ایڈیٹر تھے۔ یہ اخبار بتدریج 'بزنس اسٹینڈرڈ' اور پھر 'ٹیلی گراف' میں مبدل ہوا۔ ایک اور سینئر جرنلسٹ بی بی سین گپتا یو این آئی کی پیش رو خبر ایجنسی یو پی آئی کے بانی تھے وہ ایجنسیوں کی کارکردگی کا درس دیتے۔ اس طرح بنگالی نظریہ سازوں سے میرا واسطہ ایک طرف تو ایسوسی ایشن میں تھا اور دوسری طرف کلاس میں، پھر انہی لوگوں سے عملی زندگی میں پریس کانفرنسوں وغیرہ کے دوران ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

نئی کشمکش کا آغاز:

حکومت ہند نے ۱۹۵۲ء میں جو پریس کمیشن مقرر کیا تھا اس کی رپورٹ ۱۹۵۵ء میں شائع ہوگئی۔ اس رپورٹ میں ہندوستانی صحافت کی تاریخ اور ارتقا کا جائزہ لیا گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اخباری صنعت کو منضبط کرنے کے لیے ضروری مشورے بھی دیے گئے تھے۔ صحافت کو ایک پیشہ تسلیم کرلیا گیا تو اس کا لازمی مطلب یہ تھا کہ مالکوں اور ورکروں کو دو فریق مان لیا گیا ایسے میں ان کے دائرۂ عمل اور حقوق کا تعین لازم آیا۔ اس ضرورت کی تکمیل کے لیے ایک اجرتی بورڈ کی تشکیل تجویز کی گئی۔ صحافیوں اور ان کی تنظیموں کے دباؤ کے تحت حکومت نے فوراً اس بورڈ کی تشکیل کردی۔ اس کے ممبروں اور اس کی مقرر کردہ کمیٹیوں نے ملک بھر کا دورہ کیا اور ہر ایسے شہر پر توجہ مرکوز کی جہاں سے معتد بہ تعداد میں اخبارات شائع ہو رہے تھے۔ اردو اخبارات سے متعلق اسی طرح کی ایک ذیلی کمیٹی ڈاکٹر عبدالعلیم کی سربراہی میں بنائی گئی تھی جس کے ارکان میں 'سیاست' حیدرآباد کے ایڈیٹر عابد علی خاں بھی شامل تھے۔ اس کمیٹی نے کلکتہ کا بھی دورہ کیا اور اردو ایڈیٹروں سے ملاقاتیں کیں جو مالکان ہی تھے۔ بہرحال اخبار نویسوں اور ان کی تنظیموں نے نہ صرف اس اجرتی بورڈ کی کارکردگی میں بھرپور تعاون کیا بلکہ ہر ہر قدم پر ورکنگ جرنلسٹوں کے مفادات کے تحفظ کی کوشش کی۔ ۱۹۵۶ء میں اس اجرتی بورڈ کی رپورٹ شائع ہوگئی اور حکومت اور جرنلسٹوں کی طرف سے بورڈ کی سفارشات کے فوری نفاذ کی کوششیں شروع ہوگئیں۔ اس رپورٹ کے مطابق اول تو شہروں کو بہ لحاظ آبادی بڑے، درمیانی اور چھوٹے زمروں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پھر اخباروں کو بہ اعتبار تعداد اشاعت چھ سات زمروں میں تقسیم کیا

گیا۔ کارکن صحافیوں کی بھی درجہ بندی ان کی ذمہ داریوں اور کام کی نوعیت کے اعتبار سے کی گئی۔ اردو اخبارات ہر لحاظ اور اعتبار سے آخری زمرے میں آتے تھے اور کارکن صحافیوں کی تعداد تو صرف ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی۔ ان کے استحقاقات اور مفادات کے تعین اور تحفظ کا امکان تو دور دور تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ بہر حال ایک بات قطعی طور سے کہی جاسکتی ہے کہ اخباری صنعت میں یہ ایک نئی کشاکش کا آغاز تھا۔ ملازم کی حیثیت پانے والے اخبار نویسوں کے دلوں میں جو جذبات اور احساسات پرورش پا رہے تھے وہ ابل کر سامنے آ گئے اور انھوں نے اپنے حقوق کے مطالبے پر اصرار کے لیے ٹریڈ یونین تنظیموں کی سرپرستی حاصل کر لی اور قانونی تحفظات کی ڈھال بھی لے لی۔

آزادی کے بعد دنیائے صحافت میں مسلسل بدلتے ہوئے منظرنامے میں اردو صحافت سے وابستگان کی حیثیت، کیفیت اور نوعیت کو جو دیگر زبانوں کی صحافت کی بہ نسبت کئی گنی زیادہ پیچیدہ تھیں اب کسی قدر آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔ ایک بات اور ذہن نشین رکھنے کی ہے وہ یہ کہ میں کلکتہ کے تناظر میں گفتگو کر رہا ہوں جہاں ٹریڈ یونین تحریک شاید زیادہ منظّم، شدید اور فعال تھی۔ بڑے بڑے انگریزی اور بنگلہ اخبارات کا مرکز ہونے کے علاوہ ایک بڑا تجارتی اور صنعتی مرکز بھی تھا۔ چنانچہ صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کی تنظیمیں بھی فعال تھیں۔ گویا دونوں طرف کی تنظیمیں اپنے اپنے وابستگان کی سرپرستی اور رہنمائی کے لیے پوری طرح آمادہ اور سرگرم تھیں ایسے میں گنے چنے اردو روزناموں کے مالکان کے لیے یہ بات طبعی تھی کہ وہ بڑے بڑے اخباری مالکوں سے رجوع کرتے اور نئے حالات میں ان سے قانونی رہنمائی حاصل کرتے، گویا وہ صنعتی تقسیم اردو اخباروں میں بھی کارفرما ہوئی۔ لیکن اردو صحافت اور دیگر صحافتوں کے درمیان ایک خاص فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے وہ یہ کہ اردو صحافت میں مالک اور ملازم دونوں ہی مظلوم اور حالات کے جبر کا شکار تھے اور ایک کمزور طبقے کے افراد کے طور پر جو مار پڑی اس کو جھیلنے والے دونوں ہی تھے۔ کئی واقعات بطورِ مثال پیش کیے جاسکتے ہیں کہ جب ان پر بلوائیوں کی یا سرکاری اہل کاروں کی معاندانہ کارروائیوں کی مار پڑی تو مذکورہ بالا تنظیموں میں سے کوئی

بھی ان کی یاوری کے لیے آگے نہ بڑھی۔ ان تنظیموں کی پشت پناہی اسی حد تک محدود رہی جہاں تک مالک اور ملازم کے درمیان تنازعات کا تعلق ہوتا۔

مضمحل صحافت:

صحافت کا خواہ ادارتی شعبہ ہو یا تبصراتی یا رپورٹنگ کا جب تک تحریر میں کاٹ نہ ہو اس فن اور پیشے کا حق نہیں ادا ہوتا، عوام کی بہتیری تمنائیں اور نا آسودہ خواہشیں ہوتی ہیں اور اپنے حکمرانوں اور خوشحال طبقات سے بہت ساری شکایتیں بھی۔ ہر کسی کو نہ قلم کاغذ سے کھیلنے کا فن آتا ہے نہ ان چوکھٹوں تک رسائی حاصل ہوتی ہے جہاں ان کی دادرسی ہو یا کم سے کم ان کا دکھ درد سن ہی لیا جائے۔ ایسے میں وہ اخبار کو ایک ایسا ذریعہ سمجھتے ہیں جو ان کے احساسات کی ترجمانی کرسکتا ہے، ان کی بات آگے بڑھا سکتا ہے اور اس طرح ان کی شکایتوں اور تکلیفوں کے ازالے میں معاون ہوسکتا ہے۔ جس اخبار سے ان کی یہ توقعات پوری ہوتی ہیں اسی کو مقبولیت حاصل ہوتی ہے لیکن جب صحافی کا قلم اپنے جوہر دکھاتا ہے تو اس کا ہدف کوئی فرد یا ادارہ ہوسکتا ہے۔ جس کسی پر اس کی ضرب پڑتی ہے وہ تلملا جاتا ہے خواہ خود اس کی غلطیاں اور کمزوریاں کتنی ہی کیوں نہ ہوں۔ ایسے افراد یا ادارے اس نقصان کو جو ان کی عوامی شبیہ کو پہنچ سکتا ہے ہرگز فراموش نہیں کرتے اور اس کے بدلے اور انتقام کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ایسے میں اخبار کے قارئین اور عوام کا متاثرہ طبقہ صحافی اور اخبار کی پشت پناہی کرتا ہے۔ اگر یہ تائید و حمایت ایسی زوردار ہو جو ہر کسی پر عیاں ہو تو کسی کو ان تحریروں کے لکھنے والوں کو آنکھ دکھانے کی ہمت اور جسارت نہیں ہوتی لیکن اگر ایسا نہ ہو تو صحافی اور ادارہ دونوں ہی دشمن کے نشانے پر ہوتے ہیں اور انھیں ہر طرح کا نقصان پہنچ سکتا ہے۔ چونکہ بیشتر صحافتی تنقیدیں حکومت کے ذمہ داروں پر ہوتی ہیں اس لیے اپنے فرائض میں کوتاہیوں کے ازالے کے بجائے ان کا نزلہ اخباروں پر گرتا ہے۔

اخباروں کے سیاسی اور سماجی نظریات انھیں ایک مستحکم بنیاد فراہم کرتے ہیں کیونکہ ان کی پالیسیوں سے اتفاق رکھنے والے ان کے حمایتی ہوتے ہیں اور کسی فیصلہ کن موڑ پر اصولی

رہنمائی کے لیے انہی کی طرف دیکھتے ہیں۔ ان تمہیدوں کے بعد آیئے دیکھیں کہ آزادی کے بعد کلکتہ کے اردو اخبارات کن حالات سے دوچار تھے، کیسی کیسی کمزوریوں کا شکار تھے اور کن مجبوریوں میں مبتلا تھے۔ ان کی نہ کوئی مستحکم بنیاد تھی نہ حمایتیوں کا کوئی طبقہ، نہ ان اخباروں میں رہنمائی کا جوہر تھا۔کلکتہ سے تین صبح کے اور تین شام کے روزنامے تو پابندی سے نکل رہے تھے، ان کے علاوہ بھی چند ہفتہ وار اور ماہنامے ڈوبتے اتلاتے رہتے تھے۔ اس اعتبار سے کلکتہ اردو اخباروں کی مہد اور لحد دونوں ہی تھا۔ اس کے علاوہ بعض مضافاتی شہروں سے مثلاً ہوڑہ، ہوگلی، آسنسول وغیرہ سے بھی جرائد نکلتے بند ہوتے رہے لیکن ان سب کی کوئی خاص اہمیت یا آواز نہ تھی اور صحافت کے اصل دھارے سے ان کا کوئی خاص تعلق بھی نہیں تھا اس لیے قابلِ ذکر تو وہی پابندی سے شائع ہونے والے روزنامے ہیں جو رفتہ رفتہ اسٹیٹس سمبل بن گئے تھے۔ ان کے قارئین میں بیشتر وہی لوگ تھے جو بہار اور یوپی سے آ کر کلکتہ اور اطراف ومضافات میں بس گئے تھے، مستقل سکونت اختیار کر چکے تھے اور رفتہ رفتہ پہلے سے پاؤں جمائے ہوئے مستحکم مستقلاً آبادلوگوں میں گھل مل گئے تھے اور اب ان کے مفادات اسی سرزمین سے وابستہ تھے لیکن حکومت یا سروسز میں ان کی کوئی خاص نمائندگی نہیں تھی۔ ایک پولیس کا محکمہ اس اعتبار سے استثنائی تھا کہ اس محکمے میں یوپی کے ضلع غازی پور سے تعلق رکھنے والے بڑی تعداد میں روایتی طور پر موجود تھے لیکن ملازمت کے علاوہ ریاست کی سیاست یا دیگر مفادات سے ان کا کوئی خاص تعلق نہ تھا، ان کے رشتے اپنے آبائی وطن سے استوار تھے۔ ان لوگوں کے لواحقین اور متعلقین کلکتہ میں مختلف کام دھندوں سے لگے رہے ہوں گے جن کا ایک ایسوسی ایشن بھی تھا جس کے پیشِ نظر غازی پور کے سماجی مسائل ہوتے نہ کہ کلکتہ کے، مگر یہ سب اردو اخباروں کے قاری تھے لیکن ایسے قاری جن کا اخبار کی سیاست اور اس کی داخلی کارکردگی سے کوئی سروکار نہ تھا۔

اردو قارئین کی ایک بڑی تعداد اسپورٹس کی خبروں کی دلدادہ تھی۔ فٹ بال کلکتہ کا خاص کھیل تھا اور محمڈن اسپورٹنگ ان کی محبوب ٹیم۔ جس دن اس ٹیم کا میچ کسی اور ٹیم سے ہوتا میدان میں بے پناہ بھیڑ ہوتی۔ اگر محمڈن اسپورٹنگ کی جیت ہوتی تو پٹاخے چھوڑے جاتے اور

اگر ٹیم ہار جاتی تو سوگواری کا عالم ہوتا۔ سنیچر کو چونکہ ریس ہوا کرتی تھی اس لیے اس دن کا اخبار ریس کی ٹپس کے لیے کھنگالنے والے بھی تھے اور اتوار کے اخبار میں اس کی رپورٹوں کے منتظر بھی۔ چونکہ مسلمانوں کی سیاسی سرگرمیاں تقریباً مفقود تھیں اس لیے وہ سیاسی اعتبار سے بے ضرر تفریحات کی طرف مائل تھے مثلاً اسپورٹس یا سنیما، جیسا کہ انحطاط پذیر معاشروں میں ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ فلمی صنعت کے کارندوں کی نظر میں مسلمان بڑے اچھے فلم بیں تھے اور ان تک رسائی کا ذریعہ اردو اخبارات تھے اس لیے فلمی اشتہارات کی تقسیم کے معاملے میں اردو اخباروں کے ساتھ کوئی خاص تعصب نہیں برتا جاتا، یوں ان کے چارج کی شرح یقیناً بہت کم تھی، چنانچہ ہفتے کے اواخر میں یہ اخبارات فلمی اشتہارات سے بھرے ہوتے اور عموماً اتوار کو فلمی تبصرے بھی خاصے تفصیل سے شائع ہوتے۔

ان کے علاوہ سنجیدہ تفریحات بھی تھیں جیسے کہ مشاعرے، زندگی کی تلخ حقیقتوں سے فرار کے یہ اچھے مشاغل تھے۔ دہلی اور لکھنؤ کے اجڑے ہوئے درباروں کے باقیات اپنے اپنے خواص کے ساتھ کلکتہ اور اطراف میں راسخ ہو چکے تھے چنانچہ مستند اور معتبر اساتذہ کے مختلف حلقے تھے اور شاعروں کی اچھی خاصی تعداد ان حلقوں سے وابستہ تھی۔ پھر ان کے مداحوں کے حلقے تھے۔ علامہ رضا علی وحشتؔ کے ڈھاکہ چلے جانے کے بعد بھی ان کی روایات برقرار رہیں۔ ان اساتذہ اور ان کے حلقوں کا بطورِ خاص تذکرہ یہاں مقصود نہیں لیکن اردو دنیا میں معروف و متعارف نام لیے جاسکتے ہیں مثلاً جمیلؔ مظہری، پرویزؔ شاہدی، عباس علی خاں بیخودؔ، نوابؔ دہلوی، جرمؔ محمد آبادی وغیرہ اس برادری کو اپنے مشاعروں کی روداد سے زیادہ دلچسپی تھی باقی سیاست سے، جو صحافت کا اوڑھنا بچھونا ہوتی ہے، انھیں کوئی خاص سروکار نہ تھا۔

تذکرہ مسلم اداروں کا:

آزادی کے جلو میں تارکین وطن کا جو سیلاب ہندوستان سے مشرقی پاکستان کی طرف بڑھا وہ کلکتہ کے کئی مسلم اداروں کو بھی اپنے ساتھ بہا لے گیا لیکن یہاں ان کی جڑیں نہیں اکھڑی تھیں پھر ٹوٹے ہوئے تنوں پر نئی کونپلیں پھوٹیں جو بڑھ کر پودوں کی شکل اختیار کر گئیں

لیکن ان نئے پودوں میں نہ پہلے سی توانائی تھی نہ اتنے چھتنار ہی تھے لیکن اس زمانے میں جن لوگوں نے بے یارومددگار انسانوں کی بے پناہی دیکھی ہے اس کا اندازہ کر سکتے ہیں وہ اس خطے میں مسلمانوں کی سخت جانی اور ان کے ایقان پر ایمان بھی لائے ہوں گے۔ سماجی، فلاحی، مذہبی اور تفریحی ادارے ہچکیاں لے رہے تھے اور دم توڑتے نظر آرہے تھے ان کی سانس پھر ٹھیک چلنے لگی۔ سیاسی تنظیمیں یقیناً مفلوج اور معطل ہوگئی تھیں، یوں بھی اپنی افادیت کھو دینے کے بعد بے وقت ہوگئی تھیں، چنانچہ جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا محمڈن اسپورٹنگ کلب تازہ دم ہوگیا۔ اسلامیہ ہسپتال کا نام بدل کر سنٹر ہسپتال کر دیا گیا تھا لیکن پھر اس کو اپنا نام واپس مل گیا۔ اسلامیہ کالج سنٹرل کالج میں تبدیل ہوا لیکن مولانا آزاد کالج کے نام سے پھر حسبِ سابق توانا اور سرگرم ہوگیا۔ مدرسہ عالیہ بدستور برقرار رہا جس کو بچانے کی مولانا آزاد نے خاص طور سے کوشش کی اور اس کی مشاطگی کے لیے مولانا سعید احمد اکبرآبادی کو مامور کیا۔ کلکتہ مسلم یتیم خانہ زندہ رہا اور اس کے تحت ہائی اسکول بھی لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے قائم کیے گئے۔ انجمن مفیدالاسلام برقرار رہی جو ایک رفاہی ادارہ تھا اور لاوارث لاشوں کی تجہیز وتکفین اور تدفین اس کا خاص دائرۂ عمل تھا، مسلسل فسادات کی وجہ سے غالبًا اس کا یہ کام خاصا بڑھ گیا ہوگا۔ مسلم ویلفیئر سوسائٹی غریب اور نادار طلبہ کی تعلیمی کفالت کا حق حسبِ توفیق ادا کر رہی تھی۔ مسلم انسٹی ٹیوٹ ہال نے بھی طرح طرح کی اکھاڑے بازیوں کے لیے اپنے دروازے کھلے رکھے۔ انجمن ترقی اردو بھی سسکتی رہی اس کی نحیف آواز سالکؔ لکھنوی کے بلند آہنگوں کے درمیان سنائی دیتی رہی۔ انجمن قوم پنجابیان جو دہلی والے تاجر طبقے کی تنظیم تھی دھوم دھام سے اپنے سالانہ اجلاس کرتی رہی اور کیرالا مسلم ایسوسی ایشن جیسی تنظیمیں جو برائے نام سہی لیکن موجود تھیں۔

کلکتہ خلافت کمیٹی:

مذکورہ بلا تنظیموں اور اداروں کے علاوہ کلکتہ خلافت کمیٹی خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ جسے ملا جان محمد نے زندہ رکھا تھا۔ زکریا اسٹریٹ میں ایک عمارت کی بلائی منزل پر ایک کشادہ کمرہ معہ ملحقات کلکتہ خلافت کمیٹی کے دفتر کے نام سے تھا۔ وہی ملا صاحب کا مسکن اور ان

کی سرگرمیوں کا محور تھا۔ اس دفتر کو تاریخی خلافت کمیٹی کے باقیات میں شمار کرنا چاہئے لیکن ملا صاحب کی فعالیت نے اس میں جان ڈال دی تھی، انھوں نے طرح طرح کے سماجی کاموں کو خلافت کمیٹی کے دائرۂ کار میں سمیٹ لیا تھا، بالخصوص اسلامیہ ہسپتال کے معاملات لیکن ان کا سب سے بڑا اور قابلِ ستائش کام فسادزدہ علاقوں میں متاثرین کو ریلیف پہنچانے کا تھا۔ کلکتہ کے علاوہ بہار اور اڑیسہ کے فسادزدگان کو، حتیٰ کہ جبل پور کے فسادزدگان کے لئے بھی، بڑے پیمانے پر امدادی سامان لے کر گئے۔ اس معاملے میں بڑے ہنگامے بھی ہوئے ان پر تہمتیں لگائی گئیں جیسا کہ ہر زوال پذیر قوم میں ہوتا ہے کہ آپس میں جنگ وجدال کے سوا کوئی تعمیری کام نہیں رہ جاتا لیکن ملا صاحب پر ان باتوں کا ذرا اثر نہیں ہوتا۔ ان کے آگے پیچھے کوئی تھا بھی نہیں جن کے بارے میں وہ فکرمند ہوتے۔ وہ اصلاً پشاوری تھے خلافت کمیٹی کے رضا کار کے طور پر کسی زمانے میں کلکتہ آئے تھے بس یہیں کے ہو رہے۔

دراصل آزادی سے پہلے کلکتہ میں پشاوری برادری کی خاصی آبادی تھی۔ تازہ پھلوں اور خشک میوے کا سارا کاروبار انہی کے ہاتھوں میں تھا، آزادی کے بعد وہ رفتہ رفتہ پاکستان جاتے رہے اور ان کے روایتی کاروبار پر بھی ان کی گرفت کمزور ہوگئی۔ نیم سیاسی اور مذہبی جماعتیں جیسے کہ جمعیۃ العلمائے ہند اور جماعتِ اسلامی زندہ رہیں اور انھوں نے محدود طور پر اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں جو کہ بڑی حد تک فسادزدگان کے لیے امداد اور ریلیف کے کاموں پر مشتمل تھیں۔ یہ بھی ایک مسلسل کام تھا۔

سراسیمہ قاری:

اس قدر تحریر سے اندازہ ہوگیا ہوگا کہ اردو اخباروں کے مسلم قارئین کے حلقوں میں کس طرح کی سماجی سرگرمیاں جاری تھیں گو پھیکی اور بے جان تھیں۔ ایک اچھی خاصی تعداد اس سراسیمہ آبادی کی تھی جو حالات کے جبر کی وجہ سے اپنی جڑوں سے اکھڑ چکی تھی لیکن اس کو اپنی آئندہ منزل کا نہ کوئی پتہ تھا نہ نشان۔ وہ کلکتہ اور اطراف میں سکونت پذیر تھے اس انتظار میں کہ کوئی ہوا انہیں اگلی منزلوں کی سمت بتائے۔ کوئی مسیحا ان کی چارہ گری کرے۔ وہ اردو اخبارات

کے ایسے قاری تھے جن کی رہنمائی کا کوئی سامان اردو اخباروں میں نہ تھا، ہاں انہیں اپنے حالِ زار کا مرثیہ انہی اخباروں میں پڑھنے اور سننے کو ملتا تھا۔ یہ ایک چلتی پھرتی غیر مستحکم آبادی تھی جو اردو اخباروں کے لئے بھی کسی توانائی کا سرچشمہ نہیں بن سکتی تھی۔ اب ہم کلکتہ اردو پریس کی نوعیت، حیثیت اور اس کے مراحل اور مسائل پر جو گفتگو کریں گے وہ اصل تناظر میں آسانی سے سمجھ میں آسکے گی۔ میں خود اس کا ایک حصہ رہا ہوں۔ اس کے اندر اور باہر ذاتی اور ادارتی ابتلا میں رہا ہوں اس لیے ممکن ہے میری تحریر میں کہیں کہیں معروضیت میں کمی کا احساس ہو لیکن پڑھنے والوں کو یہ احساس بھی ہو جائے گا کہ میں نے راست گوئی کی ڈگر نہیں چھوڑی ہے اور میرے بیانوں میں مبالغہ کی گنجائش نہیں۔ قصے کی ابتدا کے لیے میں نے ۱۹۵۰ء کو نقطہ آغاز تصور کیا ہے۔ اس وقت آزاد ملک میں چمن بندی کی اسکیمیں تیاری کے مرحلوں میں تھیں، نیا دستور نافذ ہوا اور اخباری صنعت کے حال اور مستقل پر بھی بحثیں شروع ہوئیں۔

قصہ بہار میں خزاں کا:

کلکتہ پریس ہر اعتبار سے ہندوستان کا انتہائی زبردست، فکری اور نظریاتی اعتبار سے انتہائی حساس، بیدار اور آتش بار رہا ہے۔ برسوں تک بنگلہ روزنامہ 'آنند بازار پتریکا' ہندوستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا اخبار رہا ہے۔ ہم جس زمانے سے ابتدا کر رہے ہیں اس وقت انگریزی روزناموں میں 'اسٹیٹسمین'، 'ہندوستان اسٹینڈرڈ' اور 'امرت بازار پتریکا' تھے۔ بنگلہ میں 'آنند بازار پتریکا' کے علاوہ 'جوگانتر' اور 'بسومتی' خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف زبانوں میں، بیشتر بنگلہ میں، ہر نوع کے اور ہر مکتبِ فکر کی نمائندگی کرنے والے رسالے اور جرائد موجود تھے۔ ہندی اور اردو اخبارات تو تھے ہی، دو چینی روزنامے بھی تھے جو شام کو نکلتے تھے وہ دونوں الگ الگ کمیونسٹ اور نیشنلسٹ نظریات رکھنے والے چینیوں کی ترجمانی کرتے تھے، اتنی وسیع اور اس قدر پرزور اور پرشور اخباری دنیا میں اردو پریس کی حیثیت اور حقیقت ہی کیا تھی وہ بھی ایسے میں کہ جب صبح کو شائع ہونے والے تین روزنامے ہی شمار میں آسکتے تھے۔ ان میں سے بھی 'روزانہ ہند' کو صرف شمار کیا جا سکتا تھا اصلاً 'آزاد ہند' اور 'عصرِ

جدید' رہ گئے۔ میں جس کلکتہ پریس کا ذکر کر رہا ہوں اس کو آزادی کا نیا مزہ ملا تھا، اس کی نئی توانائی انگڑائی لے رہی تھی، اس میں ایک نیا جوش وخروش تھا لیکن اس کے ساتھ ہی وہاں اختیارات اور دولت کی تقسیم کے سوالات زیر بحث تھے۔قلم آزاد ہوا تو کس کا؟ ایڈیٹر کا یا مالک کا؟ ان دونوں میں سے اخبار کی پالیسی کی باگ ڈور کس کے ہاتھ میں ہو؟ اخبار کی کمائی میں قلمکاروں کا حصہ کتنا ہو؟ وغیرہ وغیرہ،نظریات کا جہاں تک تعلق ہے ہر نظریہ کی ترجمانی کرنے والے اخبارات موجود تھے انتہائی دائیں سے انتہائی بائیں تک اور اعتدال پسند بھی۔

دنیائے صحافت میں اس نئی بہار کی آمد پر اردو صحافت کا چمن بادِ سموم کی زد میں آ گیا۔ اس میں نہ قوتِ نمو تھی نہ اس کی سرپرستی کرنے والے، چونکہ کانگریس پارٹی ریاست میں اور سارے ملک میں برسر اقتدار تھی اس لیے اردو اخباروں کے لیے اسی پارٹی کی پالیسی اور پروگراموں کی ہاں میں ہاں ملانے کے سوا چارہ نہ تھا۔کسی سوال پر اس سے سرِ مو تجاوز کرنا بھی ناممکن تھا۔اخبار کے مالکان نظریاتی طور پر کانگریس کے حامی تھے اور ان کے کاروباری مفادات بھی حکمراں پارٹی سے وابستہ تھے اس لیے ادارتی تحریروں میں یبوست اور ژولیدگی آ گئی۔کبھی نہ ختم ہونے والی یک رنگی کے سوا کسی نیرنگی کی گنجائش باقی نہ رہی۔احتجاج جو کہ ہمیشہ سے اردو صحافت کی خصوصیت رہا تھا دور رہا، کسی آہِ سرد کی بھی گنجائش نہ تھی جبکہ زخموں سے چھلنی قوم کا ایک ایک انگ درد کی دنیا لیے ہوئے تھا۔ دیگر تحریروں کے لیے بھی تو آخر لکھنے والوں کی فراغت اور ذہنی یکسوئی کی شرط تھی وہ ایک سرے سے نابود تھی اس لیے دل ودماغ کی فرحت کا سامان فراہم کرنے والی دیگر تحریریں بھی ناپید تھیں۔ایسے میں ناگزیر تھا کہ ماضی کے قصیدوں یا مرثیوں میں قاری کو مبتلا اور مصروف رکھا جائے۔خبروں وغیرہ کے کالم میں ان اداراوں سے متعلق رپورٹیں پڑھنے کو مل جاتی تھیں جن کا ابھی ذکر ہوا ہے۔لیکن وہاں بھی تو فرسودگی کے سوا کوئی ندرت نہ تھی چنانچہ ہمارے اخبارات مواد کے اعتبار سے روکھے پھیکے غیر دلچسپ تھے، سیاسی اعتبار سے بے زبان اور گونگے تھے۔ بصیرت تو بہت بڑی اور بہت دور کی بات ہے غبار آلود ماحول میں بصارت بھی محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ مالی اعتبار سے بیحد کمزور تھے۔اشاعت زیادہ نہ ہونے کی وجہ

سے اخبار کی فروخت آمدنی کا کوئی خاص ذریعہ نہیں بن سکتی تھی، ہاں اس حوالے سے آمدنی کا ایک ضمنی ذریعہ ضرور تھا وہ یوں کہ اخباروں کو نیوز پرنٹ کا کوٹا منظور کیا جاتا لیکن چونکہ اصل اشاعت تسلیم شدہ اشاعت سے بہت کم ہوتی اس لیے ضرورت سے فاضل نیوز پرنٹ کتابوں کے پبلشر خوشی خوشی خرید لیتے۔ سنیما کے اشتہارات سائز میں تو کافی بڑے ملتے لیکن اردو اخباروں میں اشتہارات کا نرخ بہت کم ہونے کی وجہ سے اس ذریعہ سے ہونے والی آمدنی بھی نسبتاً کم ہو جاتی۔ غرضیکہ اردو اخباروں کا یہ دھندا لسٹم پسٹم چلتا رہا۔

آگے بڑھنے سے پہلے ایک بات اور ابھی صاف کر لی جائے تو بہتر ہے وہ یہ کہ جب ہماری اردو صحافت میں سے سیاست کا عنصر خارج ہو گیا تو اس میں بچا کیا۔ یہ سوال تو ہندوستان کی اردو صحافت کے بارے میں بالعموم کیا جا سکتا ہے لیکن فی الحال موضوعِ بحث کلکتہ کا اردو پریس ہے۔ ہمارے اخباروں میں خبروں کے علاوہ اداریہ ہوتا تھا۔ اس معاملے میں ایک عجیب وغریب روایت چلی آرہی تھی کہ اداریہ کسی بھی موضوع پر ہو لیکن اس کو پورے دو کالم ضرور ہونا چاہئے یوں کچھ تجاوز کر جائے تو مضائقہ نہیں۔ اس کے علاوہ طنز ومزاح کا کالم ہوتا اور مراسلات کا کالم ہوتا۔ 'عصر جدید' میں بالخصوص احادیث کا کالم ہوتا تھا اور افکارِ معاصرین کا کالم بھی۔ سنڈے ایڈیشن میں اور خاص خاص مواقع کی مناسبت سے اِدھر اُدھر سے لیے ہوئے مضامین ہوتے تھے جو پچھلے دس پانچ برسوں کے دوران ہونے والی اشاعتوں سے اقتباسات ہونے کی وجہ سے گردش کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مشاعروں کی روداد ہوتی تھی۔ اس وقت سیمیناروں کا چلن اتنے زور شور سے نہیں تھا جیسا کہ اب ہے۔ مزاحیہ کالموں میں اخباری مالکوں کے درمیان عامیانہ چشمک کے سلسلے پست ترین سطح تک گر گئے تھے۔ اس کام کے لیے دونوں طرف بے لگام لکھنے والوں کے خدمات حاصل کی گئی تھیں مثال کے طور پر ایک طویل سلسلے کا عنوان تھا ''حرامزادے کی سرگزشت'' غالباً اسی صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے شین مظفر پوری نے ایک مضمون لکھا تھا 'اخبار نویسی یا عصمت فروشی'۔ اس ہرزہ گوئی کی ایک نفسیاتی وجہ بھی ہو سکتی ہے وہ یہ کہ لوگوں کے مسائل اور مصائب بیشمار و بے حساب تھے جن کا ازالہ تو دور رہا، انہیں سننے والا

بھی کوئی نہ تھا۔ چنانچہ لکھنے والے اپنی تحریروں میں اپنے دل کے جلے پھپھولے پھوڑتے اور پڑھنے والوں کو بھی کچھ حظ حاصل ہوتا۔

مواد اور وسائل:

مواد کے اعتبار سے ہمارے اردو اخبارات بہت غیر متوازن تھے، اور ہیں۔ اداریوں کے بارے میں تو عرض کر چکا ہوں کہ وہاں پھیلاؤ اور تنوعات کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ ان کی پالیسیاں محض حکومت کی پالیسیوں کے اتباع تک محدود تھیں۔ اس کے علاوہ دیگر موضوعات پر قلم فرسائی کے لیے جن اہلیتوں اور لیاقتوں کی ضرورت ہوتی ہے ان کا حامل کوئی شخص نہ تھا اور جو باصلاحیت لوگ آتے وہ بے آبرو کر کے نکالے جاتے۔ دیگر کالموں میں سے ایک مذہبی کالم، دوسرا معاصرین کی آراء کا اور تیسرا طنز ومزاح کا جو تبرے بازیوں اور فحش کلامیوں تک پہنچ گیا تھا۔ جمعہ کے شمارے میں ایک دو مذہبی نوعیت کے مضامین ہوتے تو وہ مسلسل اقتباسات ہوا کرتے تھے چاہے خود اسی اخبار کی پچھلی فائلوں سے یا کسی دوسرے اخبار سے۔ یوں شعبان سے لے کر ربیع الاول تک مذہبی موضوعات ہی بکثرت چھائے رہتے، اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اب بھی کم وبیش ایسا ہی ہے یوں جا بجا روشنی نظر آ رہی ہے۔ ان کالموں کے لیے اوسطاً اخبار کے چھ صفحات میں سے ایک صفحہ سمجھ لیجئے جس میں چھ کالم ہوا کرتے تھے اب سات آٹھ کالم ہوتے ہیں۔ اسی طرح اوسطاً ایک صفحہ سینما کے اور دیگر اشتہارات کے لئے سمجھ لیجئے جو سنیچر اتوار کو زیادہ ہوتے تو ہفتے کے دوسرے دنوں میں کم ہوتے، اس طرح اوسط برابر رہتا۔ اتوار کو عموماً دو صفحہ کا اضافہ کر دیا جاتا یعنی چھ کے بجائے آٹھ صفحات ہو جاتے، صفحہ اول پر تازہ ترین بڑی خبریں جلی سرخیوں کے ساتھ ہوتیں اور اس سلسلے کا بقیہ مواد آخری صفحہ پر چلا جاتا چنانچہ یہ دو صفحات اور ایک صفحہ ایڈیٹوریل اور دیگر مستقل کالموں کا اور ایک صفحہ اشتہارات کا کل ملا کر یہ چار صفحات ہوئے۔ اس کے بعد دو صفحات کو پر کرنا ہوتا جو اناپ شناپ کسی طرح بھر دئے جاتے۔ کچھ انگریزی اخباروں سے ترجمہ ہوتا کچھ باہر کے اردو اخباروں سے لیا جاتا کچھ ایجنسیوں کا فراہم کردہ مواد۔ یہ ایجنسیاں کیا تھیں؟

ایجنسیاں:

ایک ایجنسی گلوب نام کی تھی۔ دوسری نیر اینڈ فار الیٹ نیوز (نافین) تھی جو زیادہ تر مشرق وسطیٰ کے متعلق فیچر فراہم کیا کرتی تھی جو ہمارے اردو اخباروں کے قارئین کے لئے خاص دلچسپی کا موجب ہوتے۔ اس ایجنسی کے تین چار مضامین یومیہ، ہفتے میں چار پانچ دن آ جاتے۔ اس کے بعد مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے شعبۂ اطلاعات کے فراہم کردہ میٹر ہوتے۔ ان کے استعمال کے فائدے دو چند تھے۔ ایک تو وہی کہ جگہ بھر جاتی تھی، دوسرے سرکاری اشتہارات وغیرہ حاصل کرنے کے سلسلے میں اس کو سرکاری پالیسی کی حمایت اور تشہیر کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جاتا۔ ان کے علاوہ بیرونی ممالک کی انفارمیشن سروسیں تھیں۔ اس میں سوویٹ یونین اور امریکہ کے دفاتر اطلاعات سے ڈھیر سارا میٹر آیا کرتا تھا۔ ان کے علاوہ برطانیہ اور بعض دیگر ممالک کے دفاتر سے بھی کچھ میٹر آتا جو رفتہ رفتہ کم ہوتے ہوتے تقریباً بند ہو گیا۔ سب سے زیادہ مضامین سوویٹ انفارمیشن سروس سے آتے، اس سے کچھ کم یو ایس آئی ایس یعنی امریکن انفارمیشن سروس سے۔ مزید براں سوویٹ انفارمیشن سروس سے شائع ہونے والے جرائد بھی تھے جن میں سب سے نمایاں اور بڑے پیمانے پر تقسیم کیا جانے والا 'سوویٹ دیس' تھا۔ ان پرچوں میں بھی کافی قابلِ استعمال مضامین ہوا کرتے تھے۔ غرضیکہ بلا کسی کاوش کے حسبِ خواہ اور حسبِ ضرورت اخبار کے کالم بلکہ صفحات بھرنے کے لیے ڈھیروں مواد مفت دستیاب ہوتا۔ معلومات افزا مضامین کی اشاعت میں تو اصولاً کوئی حرج نہ تھا لیکن افسوس یہی ہے کہ ان کے بے دریغ استعمال سے اخبار غیر متوازن ہو گئے تھے۔ ایسا کوئی انتظام نہیں تھا کہ انہی مضامین اور پریس میٹر کو تراش خراش کے ذریعہ کم کیا جاتا تا کہ مزید مواد کی کھپت ہوتی لیکن وہاں تو مقصد ہی خالی جگہ کو پر کرنا تھا۔

مواد کے انتخاب کے معاملے میں کوئی پیچیدگی نہیں تھی۔ ہندوستان غیر جانبداری کی پالیسی پر عمل پیرا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ امریکہ کو جتنی گالیاں چاہو دے لو اس پر کسی کو اعتراض نہیں تھا۔ اسی طرح دیگر مغربی ممالک کو بھی جو نصیحت فضیحت چاہو کر لو اس کے لیے کسی حیلے

حوالے یا اس کا کوئی جواز تلاش کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یوں اس کے لیے جواز ویٹ نام سے لے کر مصر و فلسطین اور مغربی ایشیا کے کئی ملکوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ ہاں سویٹ یونین کو ملامت کرنے سے گریز کرو خواہ مسلم جمہوریتوں اور مشرقی یورپ کے ملکوں پر اس کے مظالم کتنے ہی کیوں نہ رہے ہوں۔ اسی طرح پاکستان کو جو کچھ چاہو کہہ سن لو حکومت کو تو اس سے خوشی ہوتی لیکن اردو قارئین کی بڑی تعداد کے لیے شاید وہ قابلِ قبول نہ ہوتا کیونکہ مشرقی ہند کے عموماً اور بہار کے خصوصاً مسلمان بڑی تعداد میں مشرقی پاکستان چلے گئے تھے اس لیے یہاں رہ جانے والوں کو ان چلے جانے والے عزیزوں سے تعلق تھا۔ اس لیے پاکستان سے متعلق اداریہ یا کسی مضمون کی اشاعت کے معاملے میں یہ احتیاط ضرور برتی جاتی کہ اعتدال سے کام لیا جائے لیکن اس سلسلے میں استثنائی دور اور مواقع ضرور آئے۔ ایک تو ۱۹۶۵ء کی ہند پاک جنگ کے زمانے میں دوسرے بنگلہ دیش کی تحریک اور تشکیل کے زمانے میں۔ ان دونوں لڑائیوں کے زمانے میں مسلمانوں کو اندھا دھند گرفتار کیا گیا جن میں بہتیرے اخبار نویس بھی شامل تھے۔ حد تو یہ تھی کہ ۱۹۶۲ء کی ہند چین جنگ کے دوران مسلمانوں کو اندھا دھند گرفتار کیا گیا۔ کوئی پوچھے کہ اس وقت ملک کو مسلمانوں سے کون سا خطرہ لاحق تھا؟ بہر حال حکمراں کانگریس پارٹی نے اس بداعمالی کی سخت سزا بھی پائی کہ مغربی بنگال سے پارٹی کا صفایا ہو گیا۔

ایجنسیوں سے نقصانات:

جیسا کہ ابھی لکھ چکا ہوں، سب سے زیادہ مواد امریکی اور سویٹ اطلاعاتی دفاتر سے آیا کرتے تھے ان کا بڑا حصہ خالص پروپگنڈہ ہوتا۔ مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے دفاتر سے آنے والے میٹر میں زیادہ تر حکومت کی کارگزاریوں اور ترقیاتی پروگراموں سے متعلق میٹر کے علاوہ عوامی اطلاع کے لیے اعلانات اور سرکاری بیانات ہوتے جن کی افادیت مسلم تھی لیکن بیرونی ملکوں کے پروپگنڈہ میٹر نے طرح طرح کے نقصانات پہنچائے۔ ایک تو ہمارے قارئین کی سوچ پر ہی مہر لگا دی بلکہ کسی سوال پر آزادی کے ساتھ سوچنے کی صلاحیت ہی ضبط کر لی۔ کوئی بھی مسئلہ ہو اس کو عموماً سویت یونین کی تائید اور امریکہ کی مخالفت کی روشنی میں دیکھا جاتا، یہ

ایک بڑی غیر متوازن صورت حال تھی۔ ملک میں بھاری صنعتوں کی بنیاد رکھنے میں یقیناً سویٹ یونین نے بڑی مدد کی جس کی مثالیں بھیلائی اور روڑ کیلا کے فولادی کارخانے ہیں، اس کو پنڈت نہرو کے دور میں ہندروس دودستی پر محمول کیا گیا لیکن اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا گیا کہ جس چیز کو اصطلاحاً امداد کہتے تھے وہ درحقیقت ایک طرح کا سودا تھا جس کی قیمت معہ سود کے قسطوں میں وصول کی جاتی تھی اور عوام کی ذہن سازی کے لیے پروپگنڈے کی رعایت الگ مل جاتی تھی۔ امریکہ نے امداد کے نام پر لاکھوں ٹن گیہوں فراہم کیا جس کی رعایتی قیمت ہونے کے باوجود اربوں روپیہ کے برابر تھی یہ ساری رقوم چونکہ ہندوستانی روپیہ میں قابلِ ادائیگی تھیں اس لیے ہندوستان کو اس سے کچھ ریلیف یقیناً ملا اور یہ رقوم ملک کے ایسے ترقیاتی پروگراموں پر صرف کی جاتیں جنہیں متعلقہ حکومتوں کی منظوری حاصل ہوتی لیکن اس وقت اس موازنے کا کسے ہوش تھا کہ اگر رائے عامہ کی تشکیل کے تناظر میں اسے دیکھا جائے تو یہ سودا کتنا مہنگا تھا۔

میں نے اس سارے مسئلہ کو اندر سے اور قریب سے بھی دیکھا۔ ہمارے پڑھنے والے صریح گھاٹے میں رہے۔ ہمارے چند اہلِ قلم ماسکو چلے گئے۔ انھوں نے بلاشبہہ ادبی دنیا میں بڑا کام کیا لیکن سویٹ یونین میں ان کے قدم جمانے کا کوئی سوال نہ تھا، ہندوستان واپس آئے اور پھر تکلیف سے بسر کی، زندگی بے میل ہوگئی۔ ایسے لوگوں میں ڈاکٹر ظ. انصاری کی مثال بڑی نمایاں ہے جنھوں نے سویٹ یونین میں برسوں قیام کے دوران زبان وادب کی بڑی خدمات انجام دیں لیکن زندگی کے آخری ایام بڑی تکلیف سے بسر ہوئے۔ انتقال سے چند روز قبل انھوں نے اپنا یہ بیان اخباروں میں شائع کرایا تھا کہ ''میں اب تک کی اپنی ساری تحریروں سے تائب ہونے کا اعلان کرتا ہوں۔'' ظاہر ہے ان کی وہ تحریریں اکثر وبیشتر کمیونزم اور سویٹ یونین کی نظریاتی تائید میں رہی ہوں گی۔ جو لوگ اتفاقاً یا حالات کے جبر کے تحت امریکہ یا برطانیہ چلے گئے وہاں انھوں نے دولت کمائی، نام کمایا، اپنے بچوں کا مستقبل بنایا اور وہاں سکونت پذیر ہونے کا جو موقع تھا اس کو اپنی صوابدید کے مطابق استعمال کیا۔ سویٹ پروپگنڈے سے متاثر ہمارے قاری امریکہ کے نام ہی سے متنفر تھے حالانکہ اس زمانے میں

امریکہ جانے والوں کے لیے کوئی خاص دشواری نہ تھی۔ مجھے افسوس ہے کہ ہمارے قاری بڑے اچھے اور قیمتی مواقع سے محروم رہے۔ وہاں دولت کما کر وہ خرچ بھی کر سکتے تھے اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دلا سکتے تھے اور حسبِ خواہ اس دولت کو وطن منتقل بھی کر سکتے تھے۔ ان مواقع سے فائدہ اٹھانے کے بجائے انھوں نے منہ موڑ لیا۔ امریکہ کو گالیاں دیتے رہنا زیادہ ضروری خیال کیا۔

رپورٹنگ:

ہمارے اخباروں میں دو طرح کی رپورٹنگ ریگولر تھیں۔ اول اسپورٹس کی۔ جب لوگوں کی فکر پر جمود طاری ہوجاتا ہے یا جب سنجیدہ مسائل ومعاملات پر کھل کر اظہارِ خیال کے مواقع نہیں ہوتے تو فکر راہِ فرار اختیار کرتی ہے اور طبیعت غیر سنجیدہ مشاغل کی طرف مائل ہوتی ہے۔ اقوام کی تاریخ اور خود ہماری تاریخ کے مشاہدوں سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ کلکتہ میں مسلمانوں کی عام بے پناہی اور بے سمتی کے عالم میں جو تھوڑی بہت معاشرتی اور تعمیری کوششیں جاری تھیں ان میں سے کچھ تو میراث کو کسی طرح ڈھوئے پھرنے کا معاملہ تھا مثلاً اسلامیہ ہسپتال، مسلم انسٹی ٹیوٹ، انجمن مفیدالاسلام، محمڈن اسپورٹنگ، مسلم یتیم خانہ، مسلم ویلفیئر سوسائٹی وغیرہ کو لیے چلنا تھا۔ چنانچہ لوگوں کے مختلف گروپ انہیں لیے پھرتے تھے اور آپسی چپقلشوں میں بھی مبتلا تھے جو کہ زوال کی علامات میں سے ایک تھیں۔ ان اداروں سے قطعِ نظر ایک میدان اسپورٹس کا تھا دوسرا مشاعروں کا۔ چونکہ سال کے زیادہ حصے کے دوران فٹ بال میچ ہوتے رہتے تھے اس لیے ان کی تفصیلی رپورٹیں پابندی سے شائع ہوتی تھیں ان کے لئے صفحہ آخر پر حسبِ ضرورت وافر جگہ فراہم کی جاتی تھی۔ غالبًا جاوید نہال نے یہ رپورٹنگ سب سے زیادہ عرصے تک کی اور مختلف وقتوں میں 'عصر جدید'، آزاد ہند' 'روزانہ ہند' کے لیے رپورٹس دیتے رہے مجھے اس بات پر ہمیشہ حیرت تھی کہ میچ دیکھنے یا کم سے کم فٹ بال گراؤنڈ تک جانے اور اسپورٹس کلب میں اکٹھا دیگر رپورٹروں سے تبادلۂ خیال اور اس کے بعد رپورٹ لکھنے کے لیے وہ وقت کس طرح نکالتے تھے اور کہاں سے اتنی توانائی لاتے تھے جبکہ انہیں کالج جانا ہوتا تھا جہاں وہ پروفیسر نہال حسن ہاشمی کے نام سے جانے جاتے تھے۔

ایک اور اسپورٹس رپورٹر شہزاد منظر تھے وہ ہماری اخباری برادری میں ''تبسم'' کے نام سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ 'عصرِ جدید' اور 'روزانہ ہند' کے لیے اسپورٹس رپورٹنگ کرتے تھے اسپورٹس کے علاوہ ادب سے بھی انھیں خاص شغف تھا صرف اردو نہیں بلکہ بنگلہ زبان وادب میں بھی خاصا درک رکھتے تھے۔ وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ ان کا ایک مضمون بعنوان ''شانتی رنجن بھٹا چاریہ'' 'کتاب نما' دہلی کے جنوری ۱۹۹۴ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں انھوں نے شانتی بابو سے دوستی اور قربت کے دونوں اسباب بیان کئے ہیں یعنی اردو اور بنگلہ ادب سے شناسائی اور دوسرے ترقی پسند تحریک سے وابستگی۔ وہ ۱۹۶۵ء میں مشرقی پاکستان چلے گئے۔ لیکن چند ماہ بعد واپس آئے تو شانتی بابو کے مشورہ پر ہی فوراً واپس چلے گئے۔ (اس کی تفصیل آئندہ آئے گی)

لیکن وہ ۱۹۸۰ء کے عشرے میں ایک بار دہلی آئے تھے اور دو ایک روز شمس الزماں کے ہاں قیام کیا تھا وہیں ان سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ ہم لوگوں کو ان کے پاکستان چلے جانے کا علم تو تھا لیکن پھر اس کے بعد ان کا کچھ پتہ نہ رہا پھر جب 'جنگ' کراچی میں ادبی تنقید کا کالم لکھنے لگے تو ان کا سراغ ملا۔ میں ۱۹۸۸ء میں کراچی گیا تو وہاں ان سے بہت مختصر ملاقات ہوئی۔ اس زمانے میں ان کی صحت کافی خراب تھی کچھ ہی عرصہ بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ نام تبسم تھا لیکن بہت کافی ہکلاتے تھے مگر گلا اچھا تھا ہم لوگوں کے اصرار پر اگر کبھی کوئی گانا سناتے تو اس میں بالکل نہیں ہکلاتے۔

فاتح فرخ نے بھی کافی عرصے تک اسپورٹس رپورٹنگ کی لیکن اس کے علاوہ وہ ترجمہ بھی کیا کرتے تھے۔ چونکہ وہ بیحد مضطرب مزاج تھے اس لیے زیادہ عرصے تک کسی ایک اخبار میں نہیں ٹکتے تھے اور غائب ہو جاتے تھے جس کا سبب کبھی نہ معلوم ہو سکا پھر واپس بھی اسی پراسرار طریقے سے آجاتے گویا مستقل گردش میں رہتے۔ ہر اخبار کے دفتر میں ان کے قہقہے سنے جا سکتے تھے، ہر کسی سے ان کی بے تکلفی تھی۔ فاتح فرخ کو نشوں سے دلچسپی تھی۔ وہ خود کہتے تھے کہ میں ہر نشہ کا ذائقہ چشیدہ ہوں۔ گانجے کا کش لگا کر اس کی چلم اڑا سکتا ہوں۔ وہ بھانگ کو

سب سے برا نشہ قرار دیتے تھے اور اس کی وجہ سے پیدا ہونے والی احمقانہ کیفیتوں کو مزے لے لے کر بیان کرتے۔ کچھ ادبی شغف بھی رکھتے تھے اور بہ ایں اعتبار شہزاد منظر (عرف تبسم) سے بڑی قربت اور بے تکلفی رکھتے تھے۔ انہیں موسیقی سے بھی دلچسپی تھی۔ گیتار میں اتنی مہارت رکھتے تھے کہ ڈھاکہ جانے کے بعد وہاں گھل مل گئے۔ خود ان کے بقول بنگلہ دیش کی قیامت میں ان کی محافظت کا سبب بنگالی سماج میں ان کا رچ بس جانا ہوا۔ ۱۹۷۵ء میں جب میں کلکتہ سے دہلی آنے کی تیاریاں کر رہا تھا تو وہ مختصر قیام کے لئے کلکتہ آئے تھے اور مجھ سے کہہ رہے تھے کہ انہیں ''پاکستان ٹائمز'' لاہور، میں کام کا کوئی آفر مل گیا ہے چنانچہ اب وہ لاہور جانے والے ہیں۔ انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ لاہور سے دہلی آئیں گے تو اطمینان سے ملاقات اور گفتگو ہوگی لیکن اس وعدے کی تکمیل کی نوبت نہیں آئی۔ کبھی کبھی حیرت ہوتی ہے کہ ایسے زندہ دل خوش مزاج اور بے غم لوگ جن کی زبان سے کبھی کسی کی حکایت نہ خود اپنے دردسر کی شکایت سنی گئی اتنی جلدی اس دنیا سے کیوں رخصت ہو جاتے ہیں۔

اسپورٹس رپوٹرں کی برادری میں ایک اور نمایاں نام جاوید نہال کے شاگرد رشید مشتاق احمد کا ہے۔ وہ اپنی تعلیم اور تحقیقی مصروفیات کے دوران بھی اسپورٹس رپورٹنگ کرتے رہے اور کالج میں استاد ہو جانے کے باوجود اس شغف سے دست بردار نہیں ہوئے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے شہزادہ منظر کے پاکستان چلے جانے کے بعد وہی 'عصرِ جدید' میں اسپورٹس کا کالم لکھتے رہے۔

اسپورٹس کے بعد دوسری ریگولر رپورٹنگ شہر میں ہونے والے حادثات و وقوعات کی تھی جسے پولیس رپورٹنگ کہہ لیجیے کیونکہ اس سلسلے کی کچھ خبریں پولیس ہیڈ کوارٹر کی نیوز بریفنگ سے کچھ ہسپتالوں یا عدالتوں کے اہم فیصلوں کے متعلق مل جاتیں۔ ایک بنگالی رپورٹر چودھری کے نام سے جانا پہچانا جاتا تھا وہ صبح کے تینوں اردو اخباروں کو رپورٹیں دیتا۔ دراصل وہ کسی انگریزی یا بنگلہ اخبار کا پولیس رپورٹر تھا دہلی پولیس ہیڈکوارٹر اور عدالتوں وغیرہ سے خبریں لے لیتا اور اپنی رپورٹ بنا کر اسی کی ایک ایک کاپی ہمارے اخباروں کو دے دیتا۔ اس کے طور

طریقے اور ظاہری ہیئت سب خاصی دلچسپی کی چیز تھی جس کے اندازے کے لیے صرف اتنا ہی بیان کردینا کافی ہوگا کہ رات کو بدحواسی کے عالم میں جب وہ رپورٹ لے کر آتا تو اس کے منہ میں ادھ جلا سگار تھوک سے بھیگا ہوتا۔اس کی چھوٹی سی کار انگریزوں کے ابتدائی دور کی یاد گار تھی۔ منیجر اقبال صاحب کو اتفاق سے ایک بار اس میں سواری کا شرف حاصل ہوا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ چودھری کی گاڑی میں ایک فرلانگ جانے کے بعد دو فرلانگ تک اس کو ڈھکیلنا پڑتا۔ آخر کار اس کو دو گالیاں دے کر وہ اتر آئے چودھری کے بیان کے مطابق اس نے اپنے ڈرائیور سے کہہ دیا تھا کہ ہم تم کو کوئی تنخواہ نہیں دیں گے جو تیل خرچ ہوگا اس کے دام میں سے تم اپنی تنخواہ نکال لینا۔

بعض اسٹاف رپورٹر بھی تھے۔ مثال کے طور پر 'عصرِ جدید' میں ادریس الحق یا 'آزاد ہند' میں شمس الزماں۔ ریاستی اسمبلی کے اجلاس کے دوران روزانہ رپورٹیں تو نہیں ملتی تھیں لیکن جس روز کوئی خاص بات ہوتی جیسے کوئی نیا بل پیش ہوا یا کسی وجہ سے اسمبلی میں ہنگامہ ہوا تو اس کی مختصر رپورٹ چودھری اپنی معمول کی یومیہ رپورٹ میں شامل کر لیتا چونکہ اس کی رپورٹیں انگریزی میں ہوتی تھیں اس لیے ان کا ترجمہ کیا جاتا اور اخبار میں گنجائش کے مطابق ان کی تراش وخراش اور ایڈٹنگ کی جاتی اس طرح ہر اخبار میں ان کی عبارت میں کچھ فرق آجاتا۔ اس کے علاوہ چھوٹے موٹے جلسوں یا مشاعروں یا کسی ادارے کے جلسوں سے متعلق رپورٹیں متعلقہ مقامی لوگ خود ہی دے دیتے جسے اخبار میں گنجائش کے مطابق کتر بیونت کے بعد دے دیا جاتا۔ ہاں اگر کوئی خاص بڑا جلسہ وغیرہ ہوتا یا کوئی خاص اہم پریس کانفرنس ہوتی تو ایڈیٹر یا مترجموں میں سے کوئی جاتا۔ مثال کے طور پر 'آزاد ہند' میں احمد سعید صاحب خود نہایت فعال تھے، اس لیے زیادہ تر موقعوں پر وہ خود پہنچ جاتے۔ 'روزانہ ہند' میں ۱۹۵۷ء میں رئیس الدین فریدی صاحب کی آمد اور ادارت پر ماموری سے پہلے غلام سرور فگار صاحب تھے وہ پریس کانفرنس وغیرہ میں خود ہی جاتے، ان کے بعد فریدی صاحب نے دفتر کے اندر اور باہر ساری ذمہ داریاں خود ہی اوڑھ لیں اور بڑے انہماک سے چالیس بیالیس برس تک ان کی انجام دہی

کے بعد جب ان کی صحت بہت خراب ہوگئی تو دہلی چلے آئے، جہاں ان کے صاحبزادے صاحبزادی اور داماد سب اکٹھا تھے اور کوئی ایک سال بعد دہلی ہی میں ان کا انتقال ہوا۔

'عصرِ جدید' کی طرف سے ایڈیٹر سید محمد مصطفیٰ صابری صاحب جاتے کبھی کبھی میں بھی چلا جاتا۔ اپنی کئی طرفہ مصروفیات کی وجہ سے میرے لیے وقت نکالنے کا مسئلہ ٹیڑھا تھا تاہم جہاں ضروری سمجھتا کچھ نہ کچھ کرتا۔ ایک بار اقوامِ متحدہ کے آفس میں ایک پریس کانفرنس میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ جدید طرز کے اس آفس کی چمک دمک سے بہت متاثر ہوا۔ یہ واقعہ ۱۹۵۵-۵۶ء کا ہوگا۔ اسی کے بعد امریکی دفتر اطلاعات یو ایس آئی ایس سے میری دلچسپی اور کشش بڑھ گئی۔ حکومت ہند اور ریاستی حکومت کی طرف سے بھی کسی پروجیکٹ سائٹ کے ٹور پر اخباری نامہ نگاروں کو لے جایا جاتا۔ بعض بیرونی ممالک بھی مختلف ٹور پروگراموں کا اہتمام کرتے مثلاً امریکہ، برطانیہ، سویٹ یونین یا جرمنی۔ ایسے پروگراموں میں ہمارے دفتر سے مینجمنٹ کا کوئی شخص یا خان بہادر صاحب کا نامزد کردہ کوئی شخص چلا جاتا۔ اس کیفیت پر مجھے بڑا غصہ آتا اور افسوس بھی ہوتا کیونکہ یہ صریح بے ایمانی اور دھوکا تھا۔ جو ادارہ بھی اس طرح کی دعوت دیتا اس کی اچھی خاصی رقم ہر فرد پر خرچ ہوتی۔ مقصد یہ تھا کہ متعلقہ پروجیکٹ یا پروگرام کی اخباروں میں پبلسٹی ہو۔ ناکارہ لوگ کھا پی کے سیاحت کر کے واپس آجاتے اور ایک لفظ نہ لکھتے اور سمجھتے کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔ ان نااہلوں کو نہیں معلوم کہ وہ اپنے اخباروں اور اخبار نویسوں کے لیے کتنی بدنامی کماتے تھے اس لیے کہ متعلقہ ادارے اس بات پر تو نظر رکھتے ہی تھے کہ کس اخبار نے کیا لکھا یہ سب ان کے ریکارڈ میں درج ہوتا۔ جس اخبار سے انھیں سادی چٹ ملتی اسے وہ اپنی فہرست سے آئندہ کے لیے خارج کر دیتے۔ مزید یہ کہ جو اخبار نویس واقعی مستحق تھے وہ ان مواقع سے محروم ہو جاتے۔ اس کیفیت کو اور اس کے ذمہ داروں کو میں اردو صحافت کے جسم پر کوڑھ سمجھتا ہوں۔ ۱۹۵۸ء میں مولانا معز الدین کا شام کا اخبار 'الحق' بند ہو جانے کے بعد اس کے رپورٹر ادریس الحق 'عصرِ جدید' میں آگئے تھے۔ وہ کلکتہ کے مقامی باشندے تھے اور بنگالی رپورٹروں سے ان کے گہرے تعلقات تھے وہ دن بھر کی مختلف خبریں

اکٹھا کر کے آتے اور شام کو کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ 'عصرِ جدید' کے دفتر میں بیٹھ کر اپنی رپورٹیں لکھ کر دے جاتے۔ آگے چل کر انھوں نے ایک ہفت روزہ 'آرز و ہند' بھی نکالا تھا جو برسوں تک نکلتا رہا۔

جیسا کہ ابھی لکھ چکا ہوں کبھی کبھی مجھے بھی کسی پریس کانفرنس میں جانے کا موقع مل جاتا۔ ۱۹۵۷ء میں امریکی دفتر اطلاعات (یو ایس آئی ایس) سے رابطے کے بعد ان کی پریس کانفرنسوں اور مختلف پروگراموں میں عموماً میں ہی چلا جاتا اور اس کی رپورٹ بھی اچھی طرح دے دیتا، اس طرح 'عصرِ جدید' کا نام روشن ہوتا رہا اور وہاں میری مقبولیت بھی برقرار رہی۔ چنانچہ وہ جب کوئی دعوت نامہ اخبار یا ایڈیٹر کے نام سے بھیجتے تو میرے نام سے بھی الگ ایک دعوت نامہ بھیج دیتے۔ اسی طرح کا ایک موقع مجھے ۱۹۶۳ء میں ملا۔ ان لوگوں کا ایک ہفتے کا ٹور پروگرام تھا جس کے لیے ایک درجن سے زیادہ سینئر رپورٹروں کے ایک گروپ کو لیا گیا تھا۔ آسام، بہار اور مشرقی یوپی میں امریکی امداد سے قائم کیے ہوئے یا جاری کئی پروجیکٹوں میں اس گروپ کو لے جانے کا بڑا مبسوط اہتمام کیا گیا تھا یعنی گوہاٹی تک ہوائی جہاز سے سفر، وہاں سے شیلانگ تک بذریعہ کار پھر کلکتہ واپسی کے بعد وہاں سے دھنباد تک اور وہاں سے بنارس کے لیے ریلوے کی ایک پوری کوچ ریزرو، ایک ہفتے کے اس پروگرام کے دوران ہوٹلوں میں طعام و قیام کا باقاعدہ اہتمام۔ چونکہ اس پروگرام کا دعوت نامہ میرے نام سے آیا تھا اس لیے 'عصرِ جدید' سے کسی اور کو نہیں بھیجا جا سکتا تھا چنانچہ طے پایا کہ مجھے بھی نہ جانے دیا جائے، عذر یہ تھا کہ کام بہت ہے اور مجھے ہفتہ بھر کے لیے خالی نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے چونکہ اس پروگرام کی دوررس افادیت کا اندازہ تھا اس لیے میں نے خان بہادر صاحب کی بڑی خوش آمد کی کہ کسی طرح اجازت مل جائے۔ 'عصرِ جدید' سے ان کے نکل کر گھر جانے کے وقت ان کی کار تک میں نے تعاقب کیا بالآخر انھوں نے اجازت دے کر گلا چھڑایا۔ اٹھارہ سال تک 'عصرِ جدید' میں کام کے دوران یہ واحد موقع تھا جب میں نے خان بہادر صاحب کی اس قدر خوشامد کی۔ نہ معلوم کیوں اس وقت مجھے اس میں کوئی قباحت نہیں محسوس ہوئی۔ اس میں کوئی برائی یا بے اصولی نہ تھی نہ کسی

کی حق تلفی تھی شاید اسی وجہ سے میرے ضمیر پر اس کا کوئی بوجھ نہ تھا۔

اس پروگرام کے دوران جن پروجیکٹوں کو ہم نے دیکھا ان پر تفصیلی رپورٹیں میں نے 'عصرِ جدید' میں لکھیں۔ ان میں سے ایک بنارس کی ڈیزل لوکوموٹیو فیکٹری سے متعلق تھی۔ اس روز اس کارخانے میں تیار کیا گیا پہلا ڈیزل انجن سجا دھجا کر فیکٹری سے باہر آیا اس کے پیچھے فیکٹری کے عملے کی بارات تھی۔ اسی دن وہیں بنارس میں ہم لوگوں کو صدر کینڈی کے قتل کی خبر بھی ملی۔ اس دن ایک بڑا المناک واقعہ ہمارے وطن میں بھی پیش آیا تھا۔ کشمیر میں ایک ہیلی کاپٹر حادثے کا شکار ہوا جس میں ہندوستانی فوج کے پانچ جنرل سوار تھے اور وہ سب جاں بہ حق ہوئے۔ اس روز نیوز ایڈیٹروں کا بھی بڑا امتحان تھا۔ دونوں خبریں اپنی اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت بڑی تھیں تو پھر صفحہ اول پر لیڈ اسٹوری کون سی ہو۔

اس ٹور پروگرام کے سلسلے میں ایک واقعہ کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے جس سے صحافیوں کے لیے ان پروگراموں کی افادیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ مواقع سے پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ ۵۰ء اور ۶۰ء کی دہائیوں میں امریکہ اور سوویٹ یونین بڑے پیمانے پر ہندوستان کو امداد فراہم کررہے تھے۔ دراصل یہ ان بڑی طاقتوں کی طرف سے مستقبل میں بڑی سرمایہ کاری تھی جسے امداد کا نام دیا گیا تھا۔ امریکہ نے اپنے ملک کے قانون پبلک لا ۴۸۰ کے تحت لاکھوں ٹن گیہوں ہندوستان کو فراہم کیا تھا جس کی قیمت اربوں روپئے کے برابر تھی اور ہندوستانی روپئے میں قابلِ ادائیگی تھی وہ بھی قرضے کی قسطوں کی صورت میں اسی رقم سے مختلف پروجیکٹوں کے لیے امدادی رقوم فراہم کی جاتیں۔ ۱۹۷۴ء میں امریکی سفارت خانہ ہندوستان کے لیے امریکی امداد سے متعلق کوئی بروشر تیار کررہا تھا اس سلسلے میں مرتبین کو ایسی رپورٹوں کی تلاش تھی جو ۶۰ء کی دہائی میں امریکی امداد سے قائم ہونے والے پروجیکٹوں کے متعلق اخبارات میں شائع ہوئی ہوں۔ جب یو ایس آئی ایس کلکتہ سے اس علاقے کے اخباروں میں شائع ہونے والی رپورٹیں طلب کی گئیں تو دفتر میں لوگوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اتنے بڑے بڑے اخباروں کی دس دس برس پہلے کی فائلیں کہاں تک چھانیں گے جبکہ مہلت بھی بہت کم

تھی۔ میں نے سنا تو اس کا ذمہ لے لیا۔ میں اپنی رپورٹوں اور دیگر شائع شدہ تحریروں کے تراشے باقاعدگی سے فائل کرتا تھا۔ میں نے وہ فائلیں نکالیں۔اپنی رپورٹیں دیکھ کر مجھے اندازہ ہوگیا کہ انہی مہینوں اور تاریخوں کے آس پاس دیگر اخباروں میں بھی رپورٹیں ہوں گی۔ چنانچہ 'اسٹیٹسمین'، 'ہندوستان اسٹینڈرڈ' اور 'امرت بازار پتریکا' کے دفاتر میں جاکر انہی مہینوں کی فائلیں نکلوائیں، ان اخباروں میں حسبِ خواہ رپورٹیں تلاش کر کے ان کی فوٹو کاپی حاصل کرلی اور دو تین دن میں یہ کام انجام دیا۔مقامی زبانوں کے نمونے کے طور پر اپنی رپورٹوں کے خلاصے کا انگریزی ترجمہ پیش کردیا۔ میری خوب واہ واہ ہوئی۔ اس کوشش اور کاوش کے معاوضے کے علاوہ اردو رپورٹوں کے ترجمے کا معاوضہ بھی ملا۔لیکن اس کامیابی کی حقیقت کا کسی کو پتہ نہ چلا۔

اداریے:

جیسا کہ لکھ چکا ہوں، اداریوں میں زیادہ کچھ کہنے یا لکھنے کی گنجائش نہیں تھی، حالات و واقعات پر صرف سرسری تبصرے کیے جاسکتے تھے۔اکثر و بیشتر ایسا ہوتا کہ کسی بیرونی اخبار کے اداریے کا تراشا لے کر چند سطریں اوپر نیچے جوڑ دی جاتیں۔ میرے خیال سے اس سلسلے میں سب سے زیادہ قابلِ اعتراض بات یہ تھی کہ جو بھی اور جیسے بھی ایڈیٹوریل لکھے جاتے ان میں لکھنے والے کا کوئی پتہ نشان نہیں ہوتا تھا بس جس شخص کا نام اخبار کی پیشانی پر چھپتا تھا وہی ایڈیٹر سمجھا جاتا تھا اور ایڈیٹوریل کو اسی کی تحریر سمجھا جاتا تھا۔ میں اس کیفیت کو سرقے سے بھی بدتر بددیانتی سمجھتا ہوں۔ لکھنے والوں کو اجرت تو صرف مہینے بھر چائے پینے بھر ملتی تھی لیکن نام چھپنے کی سرشاری بھی ان کی قسمت میں نہیں تھی۔مناسب تو یہ تھا کہ اداریہ کے آخر میں لکھنے والے کے دستخط ہوتے خواہ قلمی نام ہی کیوں نہ ہو۔

مجھے اس سوال نے ہمیشہ ایک کرب میں مبتلا رکھا ہے کہ آخر ہم اپنے لکھنے والوں کو جو دانشوری کے کسی نہ کسی زینے اور مقام پر ہوں گے وہ عزت اور احترام کیوں نہیں دیتے جس کے وہ مستحق ہیں۔مزید یہ کہ کسی تحریر سے نام کی وابستگی لکھنے والے میں احساس ذمہ داری بڑھاتی ہے اور وہ اسی کام میں زیادہ خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، پھر یہ کہ وہ قانونی طور پر اپنی

تحریروں کا ذمہ دار بھی ہوگا۔ یہی قانونی ذمہ داری تو بہت سارے جھگڑوں کی جڑ تھی۔

کالم نگاری:

ان اخباروں میں روایتی کالم نگاری کا چلن کبھی نہیں رہا نہ کوئی قابلِ ذکر کالم نگار ہی ہوا۔ حد یہ ہے کہ جو فکاہیہ کالم پابندی سے شائع ہو رہے تھے اور بعض مستقلاً لکھنے والے بھی تھے لیکن ان کے نام بھی نہیں آتے تھے۔ 'عصرِ جدید' میں ''فکاہات''، 'آزاد ہند' میں ''نمکدان'' اور 'روزانہ ہند' میں ''کہنے کی باتیں'' کے زیرِ عنوان کالم تو موجود تھے اور مستقل لکھنے والے بھی لیکن ان کے نام ندارد حالانکہ اردو صحافت کے وسیع تر پس منظر کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ایسے ہی کالم لکھنے والوں نے کیسی کیسی شہرت حاصل کی اور نام کمایا۔ ابھی مجتبیٰ حسین کی ایک معروف اور روشن مثال موجود ہے۔ ان اخباروں میں مختلف ذرائع سے موصول ہونے والے فیچر استعمال کیے جاتے رہے جن کا تذکرہ کیا جا چکا ہے، پھر جب دہلی وغیرہ کے اخباروں میں سینڈی کیٹڈ کالم کا رواج بڑھا تو بھی ان سے کوئی خاص استفادہ نہیں کیا جا سکا جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ان لکھنے والوں کو معمولی معاوضہ دینے پر بھی آمادگی نہ تھی چنانچہ ہم کلکتہ میں اپنے اخباروں کو بند دریچے والی صحافت کہہ سکتے ہیں جو ڈھرے پر چلتے تھے اور ان میں تازہ کاری کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اب ادھر کچھ عرصے سے 'اخبارِ مشرق' نے اس راہ میں ایک پہل کی ہے یعنی خود اپنے کالم رائٹر نہ سہی لیکن دہلی اور بمبئی کے سینڈی کیٹڈ کالم لکھنے والوں کے مضامین شائع کرنے لگا ہے۔ اخبارِ مذکور نے کچھ اور پیش رفت بھی کی ہے جس کا ذکر آئندہ آئے گا۔ ہاں ایک رواج البتہ کلکتہ کے روزناموں میں جاری ہوا یعنی ہر روز کسی خبر سے متعلق چار مصرعوں پر مشتمل ایک تبصراتی قطعہ کی اشاعت۔ اس کی ابتدا تیس بتیس برس پہلے 'آزاد ہند' میں حرمت الاکرام کے قطعات کی اشاعت سے ہوئی۔ انھوں نے کلکتہ سے جانے کے بعد مرزا پور سے بھی اس کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان کے بعد اعزاز افضل اس روایت کے امین ہوئے جسے انھوں نے ۲۰۰۵ء میں آخر دم تک جاری رکھا۔

ایک تہمت کا جواب:

اب اردو پریس پر ایک بڑی تہمت کی تردید اور اس کا جواب دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ تہمت یہ ہے کہ ہمارے اردو اخبارات محض ترجمہ ہوا کرتے ہیں لہٰذا یہ دوسرے درجے کے ہیں اور درخورِ اعتنا نہیں ہیں۔ ان کی زبان معیاری نہیں ہوتی وغیرہ وغیرہ۔ تو میں پوچھتا ہوں کہ کون سا اخبار بلا ترجمہ کے چلتا ہے؟ کیا ماسکو سے آنے والی ساری خبریں انگریزی میں ہی بھیجی اور موصول کی جاتی ہیں؟ کیا چین اور جاپان سے آنے والی خبروں کی ابتدائی رپورٹنگ انگریزی میں ہوتی ہے؟ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یہی حال دنیا کی ساری زبانوں کے درمیان لین دین کا ہے۔ اگر مان بھی لیا جائے کہ خبروں کا بین الاقوامی لین دین انگریزی اور صرف انگریزی میں ہوتا ہے تو ہمارے ہی ملک کی ساری دیسی زبانوں کے اخبار اگر ترجمہ نہیں کرتے تو اور کیا کرتے ہیں۔ ترجمہ کے بغیر دنیا گونگی بہری رہ جائے گی اس لیے اردو اخباروں کے بارے میں یہ کہنا کہ صرف ترجمہ پر چلتے ہیں صریح تہمت ہے۔ پھر رہی اقتباس کی بات تو کیا آج بھی بڑے بڑے اخباروں میں لندن اور نیویارک کے اخباروں کے اقتباسات نہیں ہوتے؟ سو یہ کوئی انہونی بات نہیں فرق صرف اتنا ہے کہ ہم ہر کام پھوہڑ پن سے کرتے ہیں، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ سلیقے کی بھی قیمت ہوتی ہے، ہمارے اخبارات ہر قیمت حتیٰ کہ رشوتیں تک دینے لینے کے لیے تیار ہیں لیکن اس سلیقے کی نہیں۔ آخر اس فن کی قیمت کیوں نہیں؟ جہاں تک زبان کی ناہمواری کا سوال ہے اس کی ایک بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ سارا کام ایسی مار دھاڑ کے عالم میں ہوتا ہے کے پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی مہلت اور فرصت نہیں ہوتی بس جتنا کام ہو وہ ہو جاتا ہے وہ بھی سخت محنت اور مہارت کے بنا پر ہوتا ہے۔ معترضین کو دوران نیوز ڈسک پر بٹھا دیا جائے تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے۔ مزید یہ کہ اب علمی انحطاط عام ہے۔ ۵۰ء کی دہائی کے اخباروں کو اٹھا کر دیکھئے تو اندازہ ہو جائے گا۔ بات یوں بھی ہے کہ ہمارے اخباروں میں پروف ریڈر کو غیرضروری اور زائد سمجھا جاتا تھا۔ جہاں کہیں کسی پروف ریڈر کا انتظام تھا وہ بھی ایڈیٹوریل وغیرہ جیسے خاص مضامین اور خبروں کی سرخیاں پڑھ لیتا۔ اس صورتِ حال کو یوں بھی دیکھئے کے برائے

نام اجرت پر رات کو کام کرنے والا شخص کتنی لیاقت کا حامل ہوگا اور پھر وہ غلطیوں کی اصلاح کہاں تک کرے گا۔

تسلسلِ واقعات:

۱۹۵۲ء کے نصف اول میں کسی وقت کی بات ہے کہ حامد صاحب خان بہادر صاحب کی نظروں سے گر گئے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی اور اس کے لیے کسی خاص سبب کا ہونا بھی ضروری نہ تھا، مصاحبین میں سے کوئی بھی ٹیلی فون پر کہہ سکتا تھا کہ آج کے اخبار میں فلاں خبر یا مضمون یا سرخی سیاسی یا مذہبی مسلک کے خلاف ہے بس متعلقہ شخص کے جھٹکے کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ چنانچہ حامد صاحب کو حکم ہوا کہ اب وہ نصف تنخواہ پر 'امروز' میں کام کریں۔ اس کے ساتھ ہی صابری صاحب کا قلمدان اوپر 'امروز' کے کمرے سے نیچے 'عصرِ جدید' کے دفتر میں آ گیا۔ حامد صاحب نے کوئی ایک مہینے تک اس اہانت کی مزاحمت کی لیکن ۱۹۵۲ء میں ایک باصلاحیت مسلمان نوجوان جس کی کلکتہ میں فیملی بھی ہو کتنی دیر تک مزاحمت کر سکتا تھا؟ اس اثنا میں انھیں کوئی کام نہ ملا چنانچہ انھوں نے ایک سو روپیہ ماہوار پر 'امروز' میں کام کرنا منظور کر لیا۔ میں نے کہا: "حامد صاحب آپ نے تھوک کر چاٹ لیا۔" کہنے لگے: "ٹھیک کہتے ہیں۔ لیکن میں تو بھوکا رہ سکتا تھا بیوی اور بچے کو کیا کروں؟" وہ ایک سو روپئے میں بھی کیا کرتے۔ مگر انھوں نے ایک ہفت روزہ 'کھلاڑی' نکالا جو ہر سنیچر کی صبح کو شائع ہوتا اس میں ریس پر ٹپس ہوا کرتے تھے، اس خصوصیت کی بنا پر وہ دوپہر کو ریس شروع ہونے سے پہلے ہی دھڑلے سے بک جاتا۔ اس میں فلمی تبصرے بھی ہوا کرتے تھے۔ لیکن یہ گاڑی زیادہ دنوں تو نہیں چلی، آخر ایک دن ہم اردو صحافیوں کی ایک نوزائیدہ انجمن کی ایک میٹنگ اس کے سکریٹری چٹرجی نے بلائی۔ ابراہیم ہوشؔ کی زیرِ صدارت اس میٹنگ میں یہ الم ناک فیصلہ کیا گیا کہ حامد صاحب اپنے وطن لکھنؤ جانا چاہتے ہیں لیکن ان کے پاس کرائے کے لیے بھی پیسے نہیں ہیں اس لیے ہم لوگ ضرورت بھر رقم اکٹھا کر کے انھیں دے دیں۔ سو وہ رقم ان کو دے دی گئی۔ حامد صاحب، ان کی بیوی اور ایک بڑا پیارا سا بچہ کلکتہ سے چلے گئے پھر ہم لوگ ان کو بھول گئے۔ لیکن کوئی پانچ چھ برس بعد ایک روز

شام کو دیکھا کہ حامد صاحب مسکراتے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ خوشحالی اور فارغ البالی ان کے پورے وجود پر محیط اور مترشح تھی۔ اس روز رات کا کھانا ہم لوگوں نے ساتھ کھایا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ دراصل ایرو ناٹیکل انجینئر تھے اور ہیں۔ کلکتہ سے جانے کے بعد اپنے عزیزوں کی مدد سے پاکستان جانے میں کامیاب ہوگئے اور وہاں کراچی ہوائی اڈے پر سیول انجینئر کے طور پر برسرِ کار ہیں۔ اب ڈھا کہ جاتے ہوئے جی چاہا کہ کلکتہ کو دیکھتے جائیں، سو چلے آئے۔

حامد صاحب کے زمانۂ عروج میں جبکہ میں نووارد تھا ایک واقعہ یہ ہوا کہ انھوں نے مجھ سے کہا کہ گلوب ایجنسی میں جو اردو فیچر فراہم کرتی تھی (بعد میں اسی کا نام 'نافین' Nafen ہوگیا) ایک اردو مترجم کی ضرورت ہے، میں نے تمہارا نام تجویز کر دیا ہے۔ ڈلہوزی اسکوائر میں اس کا آفس ہے وہاں چلے جاؤ۔ اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ میں وہاں پہنچ گیا۔ لیکن وہاں جو شخص ذمہ دار تھا اس نے بتایا کہ ابھی ذرا دیر پہلے تو ایک اور شخص آیا تھا وہ بھی کہہ رہا تھا کہ مجھے حامد صاحب نے بھیجا ہے۔ میں بیٹھ گیا اور اس سے اصرار کرنے لگا کہ ابھی ٹیلیفون کر کے حامد صاحب سے پوچھئے کہ انھوں نے کس کو بھیجا ہے، میرا نام رضوان اللہ ہے۔ اس شخص نے اصلیت تو سمجھ لی، مجھے اطمینان دلایا کہ آپ جائیے ہم بعد میں ان سے بات کرلیں گے۔ میں سیدھا 'عصرِ جدید' کے دفتر میں آیا، وہیں حامد صاحب موجود تھے۔ میری بات سن کر مسکرائے۔ کہنے لگے بھائی وہ دوسرا شخص بہت ضرورت مند تھا اس لیے میں نے اس کی سفارش کردی۔ میں نے کہا کہ بھائی مجھے تو بتا دیتے، میں وہاں جھوٹا نہ بنتا۔ اس پر انھوں نے معذرت کی لیکن جس وقت کمرے میں ہم یہ گفتگو کر رہے تھے کمرے کے باہر کوئی شخص دیوار سے لگا کھڑا تھا وہ ناظر الحسینی تھے اور وہ واقعہ میرے لیے ان کی پہلی لنگی تھی۔

ناظر الحسینی اس واقعہ سے کچھ عرصے پہلے سے 'عصرِ جدید' میں ترجمہ کر رہے تھے پھر نافین میں کام کرنے لگے لیکن نہ معلوم کیا ہوا کہ ۱۹۵۴ء میں 'آزاد ہند' میں آگئے۔ اگست ۱۹۵۷ء میں شیخ اکبر علی قریشی نے جو کانگریس پارٹی سے وابستہ تھے روزنامہ 'اخوت' جاری کیا اور ناظر صاحب کو اس کا ایڈیٹر مامور کیا۔ اخبار دھوم دھام سے نکلا۔ تقریباً چار سال تک ناظر

صاحب اس کے ایڈیٹر رہے اس کے بعد وقار مشرقی نے اس کی ادارت سنبھالی جو شیخ اکبر علی کے داماد تھے۔ ان کی ادارت میں یہ اخبار ایک برس اور چلا پھر شیخ صاحب نے مسلسل خسارہ برداشت کرنے کے بعد اخبار کی اشاعت بند کرنے کا فیصلہ کیا۔'اخوت' میں قیام کا زمانہ شاید ناظر صاحب کا سب سے زیادہ اطمینان اور عافیت کا زمانہ کہا جاسکتا ہے۔ ورنہ زیادہ تر وہ اس گردش میں ہی مبتلا رہے جو اردو اخبار نویسوں کا مقدر تھی۔ یوں ناظر صاحب ایک اچھے شاعر تھے اور اگر وہ صرف شاعری پر توجہ مرکوز رکھتے تو شاید نام اور پیسہ بھی کما سکتے تھے۔صحافت نے تو انھیں کچھ نہ دیا۔اخباروں کے درمیان خصوصاً 'آزاد ہند' اور 'عصرِ جدید' کے درمیان ٹپے کھاتے رہے۔ اس میں ان کی جذباتیت اور تلون مزاجی کو بھی کسی حد تک دخل تھا۔ ایک بار 'عصرِ جدید' میں دوسرے یا تیسرے قیام کے دوران وہ کسی بات پر بگڑ گئے اور پکار اٹھے یہ 'عصرِ جدید' نہیں 'قصرِ یزید' ہے۔ یہ جملہ اچھل کر فوراً منیجر صاحب تک پہنچا اور دوسرے ٹپے میں خان بہادر صاحب تک پہنچ گیا۔ ظاہر ہے فی الفور ان کو بلڈنگ سے باہر کرنے کا فرمان صادر ہوا۔ کوئی ہفتہ بھر بعد خان بہادر صاحب کا غصہ کچھ کم ہوا تو میں نے منیجر صاحب سے کہہ سن کر ان کی بحالی کا فرمان حاصل کرلیا اور تحریری معافی مانگنے کی شرط کو بھی ہلکا کر کے زبانی معافی کی حد تک کردیا گیا۔لیکن 'عصرِ جدید' میں اٹھارہ برس کی خدمات کے بعد شدید علالت کے بنا پر مجھے طویل رخصت پر جانا پڑا۔ جب واپس آیا تو 'عصرِ جدید' کے دروازے مجھ پر بند تھے۔ اس بارے میں خان بہادر صاحب سے آخری بار گفتگو کے لیے ان کے مرکزی دفتر میں گیا تو واپسی میں جب میں سیڑھیوں سے اتر رہا تھا تو ناظر الحسینی صاحب اوپر جارہے تھے وہ اس وقت حلقۂ مشاورت میں شامل تھے۔ یہ بات ۱۹۶۹ء کی ہے۔ وہ خان بہادر صاحب سے اور ناظر الحسینی صاحب سے میری آخری ملاقات تھی۔

عبدالوہاب غازی اصلاحی کا اخبار 'غازی' خرید لینے کے بعد وقار مشرقی اس کے ایڈیٹر اور مالک و مختار ہو گئے اور اس کو چلاتے ہوئے چار دہائیاں گزار لیں لیکن کلکتہ کی اردو صحافت میں ان کا تعارف ۱۹۵۷ء میں جاری ہونے والے روزنامہ 'اخوت' سے ہوا تھے جسے شیخ اکبر علی

قریشی نے ایک طرح ناظر الحسینی کی سرپرستی کرنے کی غرض سے جاری کیا تھا لیکن ایک مدت کے دوران دو عوامل تقریباً بیک وقت جاری رہے: ایک ناظر الحسینی کی زیرِ قیادت 'اخوت' کا نہ چل پانا جس کی وجہ سے شیخ اکبر علی کو ہزاروں روپیہ ماہانہ کا گھاٹا ہوتا رہا دوسرے غازی اصلاحی کی ملکت میں ان کے اخبار 'غازی' کا لڑکھڑانا اور بالآخر بند ہو جانا۔ ان دونوں عوامل میں شیخ اکبر علی کی حیثیت قدرِ مشترک کی رہی۔ انھوں نے پہلے 'اخوت' کو ناظر صاحب سے لے کر وقار مشرقی کے حوالے کیا لیکن شاید اس کی زندگی کا پیالہ لبریز ہو چکا تھا، یہ تبدیلی بھی اس کو راس نہ آئی۔ اس کے بعد شیخ صاحب نے 'غازی' کو لے کر اس کی باگ ڈور وقار مشرقی کے حوالے کی اس وقت تک وقار مشرقی صاحب نے ایک اردو اخبار کو جاری رکھنے کے گر بھی سیکھ لیے تھے اور اس کے لیے خود کو پوری طرح وقف کر دیا۔

شہاؔب لکھنوی کا ذکر بھی یہیں مناسب معلوم ہوتا ہے۔ سید محمد علی شہاؔب لکھنوی ڈیل ڈول کے اعتبار سے تو لکھنوی نہیں معلوم ہوتے تھے لیکن وہ خود کو لکھنوی لکھتے تھے۔ جہاں تک ان کی شکل وصورت کا تعلق ہے انہی کا بیان نقل کرتا ہوں۔ وہ کہتے تھے کہ جب میری شادی ہوئی تو اس موقع پر کچھ میراثنیں آ گئی تھیں اور ڈھول بجا بجا کر گا رہی تھیں ''سب سید تو گورے گورے یہ سید کیوں کالا رے''۔ ان کی شادی مرشد آباد کے ایک گھرانے میں ہوئی تھی۔ ان کے والد کلکتہ میں ایک بڑے پولیس افسر تھے اور جدن بائی پر ان کی خاص نظرِ کرم تھی چنانچہ شہاب صاحب بلاتکلف کہتے تھے کہ نرگس انہی کی اولاد ہے اور یوں نرگس سے اپنے رشتے کے بیان میں بھی انھیں کوئی تکلف نہیں ہوتا تھا۔ آزادی سے پہلے وہ بنگال کے محکمہ خوراک میں کسی اچھے عہدے پر فائز تھے اور مشرقی پاکستان چلے گئے تھے لیکن ریس کی لت ایسی تھی کہ اس کے لیے وہ ڈھاکہ سے کلکتہ آیا کرتے تھے۔ بالآخر وہاں کی ملازمت چھوڑ کر مستقلاً کلکتہ آ گئے۔ ۱۹۵۷ء کے بعد کسی وقت شہاب صاحب 'عصرِ جدید' میں آئے۔ پہلے ترجمہ کیا کرتے تھے بعد میں اداریہ بھی لکھنے لگے۔ ۱۹۶۲ء میں کلکتہ کارپوریشن کے کونسلر منتخب ہو گئے پھر ان کی ظاہری حیثیت میں نمایاں بہتری آ گئی۔ شہاب صاحب مشاعروں کے شاعر تھے۔ کسی مشاعرے سے ایک روز پہلے

شربت شہتوت کی شیشی لے لیتے تھے اور وقفہ وقفہ سے چکھتے رہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس سے گلا ٹھیک رہتا ہے۔ ۱۹۶۵ء کی ہند پاک جنگ کے دوران جن مسلمان اخبار نویسوں کو راتوں رات گرفتار کیا گیا ان میں شہاب صاحب بھی شامل تھے۔ کوئی دو مہینے بعد جب ان کو وہاں سے رہائی ملی تو 'عصرِ جدید' کے دروازے ان پر بند ہو چکے تھے۔ حالانکہ وہ اور اکرامی صاحب، ایڈیٹر 'امروز' اس تمام عرصے میں ایک ہی جگہ بند رہے اور ایک ہی ساتھ رہا ہوئے مگر اکرامی صاحب کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہوا۔ جس روز شام کو علی پور جیل سے ان دونوں کی رہائی متوقع تھی میں انھیں لینے کے لیے ایک ٹیکسی لے کر پہنچ گیا اس خیال سے کہ شاید ان لوگوں کو لینے والا کوئی نہ ہوگا لیکن گیٹ کے ایک طرف ایک اندھیرے گوشے سے کلیم الدین شمس نمودار ہوئے۔ تب ان کی طالب علمی کا زمانہ تھا اور وہ اکرامی صاحب سے خاص قربت رکھتے تھے انہی کو لینے کے لیے وہ وہاں گئے تھے، ہم لوگ ایک ہی ٹیکسی میں واپس آئے، شہاب صاحب نے ۱۹۸۰ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

■❖■

باب سوم

پریس کمیشن کا قیام

دراصل ابھی ہم ۱۹۵۲ء میں ہیں۔ حامد صاحب کے جانے کے بعد بسنت کمار چٹرجی 'عصرِ جدید' کے نیوز ایڈیٹر ہوگئے۔ اسی زمانے میں حکومتِ ہند نے ایک پریس کمیشن کا تقرر کیا۔ اس کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ ہندوستانی اخبارات کے ہر پہلو کا جائزہ لے کر اپنی سفارشات پیش کرے۔ اس زمانے میں ٹی وی کا کوئی تصور نہ تھا۔ آل انڈیا ریڈیو سرکاری ملکیت میں تھا، اس لیے مسئلہ صرف اخباروں اور ان کے کارکنوں کا تھا۔ اخبارات ایک بڑی اور نفع بخش صنعت کی حیثیت اختیار کرتے جارہے تھے اور سیاست پر بھی بھرپور اثر انداز ہورہے تھے، مزید براں بائیں بازو کی تحریکات بھی پوری آب وتاب سے جاری تھیں جن کے زیرِ اثر ٹریڈ یونین اور کارکنوں کی تنظیمیں تھیں۔ ان حالات میں حکومت پر لازم تھا کہ اخباری صنعت میں کارکن صحافیوں کے لیے بھی کچھ کرے، یوں اخباری مالکوں پر دباؤ کے لیے پریس کے مجوزہ قوانین کے علاوہ حکومت کے پاس دو زبردست حربے تھے، ایک اخباری کاغذ نیوز پرنٹ کا کوٹا اور دوسرے سرکاری اشتہارات۔ یہ دوسرا میدان گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ وسیع تر ہوتا گیا۔ ایک تو مختلف کارپوریشن جو حکومت کی طرف سے نیم سرکاری اداروں کے طور پر قائم کی جارہی تھیں دوسرے وہ صنعتیں جو ایک ایک کر کے قومی تحویل میں لی جارہی تھیں۔ اس طرح حکومت کے زیرِ اثر یا حکومت کی کارروائیوں سے متاثر ہونے والے ورکروں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی تو حکومت میں نوازشات کی تقسیم کی صلاحیت بھی بڑھتی جارہی تھی۔ بالعموم وسعت پذیر صنعتی عمل سے سرمایہ داروں کے حلقے میں ایک صف بندی کا عمل بھی تیز تر ہوگیا لیکن

کانگریس کے زیرِ اثر ورکروں کے تئیں قدرے نرم رویہ تھا اور ٹریڈ یونین تحریکات کے سامنے ان کا زور زیادہ نہیں چل رہا تھا مگر پریس کمیشن کے تقرر نے جیسے ایک کرنٹ دوڑا دیا۔ اس پریس کمیشن نے دو سال کی ملک گیر کاوشوں کے بعد ۱۹۵۵ء میں اپنی مبسوط رپورٹ پیش کی جس میں پہلی بار ہندوستانی صحافت کی مجمل مستند تاریخ بھی شامل تھی۔ اس کمیشن نے صحافیوں کے حالات کا جائزہ لینے، ان کی درجہ بندی کرنے اور درجہ بدرجہ ان کے مشاہروں کا تعین کرنے کے لیے ایک اجرتی بورڈ قائم کرنے کی سفارش کی۔ وہ بورڈ جلد ہی مقرر کر دیا گیا جس کی رپورٹ ۱۹۵۶ء میں حکومت ہند کو پیش کی گئی۔ کارکن صحافیوں نے اپنے استحقاقات کے لیے جس تحریک کی بنا ڈالی تھی اس کی دوسری جست اس رپورٹ کی اشاعت کے ساتھ شروع ہوئی۔

نئے دور کا آغاز:

'عصرِ جدید' میں بسنت کمار چٹرجی نیوز ایڈیٹر ہو گئے لیکن ان کو اداریہ لکھنے سے کوئی واسطہ نہیں تھا وہ کام صابری صاحب کے ذمہ ہوا جو اس کے علاوہ دن میں کچھ ترجمہ بھی کرتے۔ چٹرجی کا رجحان بائیں بازو کی طرف تھا مزید براں جس کسمپرسی اور احساسِ کمتری میں مسلمان عام طور سے مبتلا تھے وہ اس سے آزاد تھے، مجرد تھے اور خاندان والوں سے کوئی خاص واسطہ نہیں رکھتے تھے یعنی بالکل بے فکر تھے۔ ان کے گزارے کے لیے 'عصرِ جدید' کے دو ڈھائی سو روپئے ماہوار کافی تھے، ان کا چھوٹا بھائی کبھی کبھار سیرامپور سے آتا اور کچھ پیسے لے جاتا۔ شام کو ایک آدھ بار چٹرجی کی خان بہادر صاحب کے دربار میں پیشی ہوئی لیکن اس کو انھوں نے کوئی اہمیت نہیں دی جو کچھ کہا سنی ہوتی اس کو خاموشی سے سن کر چلے آتے۔ بعد میں کہتے کہ بھائی اس شخص نے اس کام میں اتنا روپیہ لگایا ہے تو کیا کچھ کہنے سے بھی رہا، بات تو ہماری ہی اوپر رہتی ہے کہ ہمارا لکھا چھپ جاتا ہے۔ لیکن ایک دن وہ اپنے لکھے پر کان سے پکڑے گئے اور بیک بینی و دو گوش باہر کر دیے گئے۔ غالباً ۱۲-۱۳/اگست ۱۹۵۳ء کی بات ہے کہ شیخ محمد عبداللہ کو کشمیر کی وزارتِ عظمیٰ سے برطرف کر کے نظر بند کر دیا گیا۔ چٹرجی نے اس خبر کو صفحہ اول پر لیڈ بنایا اور ایک جلی سرخی لگائی جس میں ان کے لیے ''وطن کے غدار'' کا فقرہ استعمال کیا گیا تھا جیسا کہ

ابتدائی خبروں میں کہا گیا تھا اور انگریزی اخباروں میں بھی کچھ اسی قسم کی سرخی لگائی گئی تھی۔ خان بہادر صاحب کے تعلقات شیخ صاحب سے قریبی تھے۔ انھیں ایک تو اس گرفتاری ہی پر بڑا صدمہ ہوا دوسرے ان کے اخبار میں اس سرخی نے زخم پر نمک کا کام کیا۔ خان بہادر صاحب نے چٹرجی سے جواب طلب کیا تو ان کا کہنا تھا کہ میں نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہی۔ پنڈت نہرو نے اپنے بیان میں جو کہا انہی کے الفاظ سرخی میں ہیں۔ خیر چٹرجی نے مغربی بنگال سکریٹریٹ اور جرنلسٹ ایسوسی ایشن کے کتنے ہی چکر لگائے لیکن سب بے سود رہا۔ بالآخر ہفتہ عشرہ بعد انھوں نے دہلی کا ٹکٹ کٹایا جہاں سے وہ بخوبی آشنا تھا۔ دہلی میں روزانہ 'پرتاپ' سے وابستہ ہوگئے۔ ۱۹۷۰ء میں 'امریکن رپورٹر' کا اردو ایڈیشن شائع ہوا تو چٹرجی اس کے ایڈیٹر ہوگئے مگر ۱۹۷۲ء میں وہ ہفتہ وار بند ہوگیا تو پھر ان کو سویت انفارمیشن سروس میں جگہ مل گئی جہاں وہ آخر دم تک رہے۔ ۸۰ء کے عشرے کے اوائل میں ان کا انتقال ہوگیا۔ کلکتہ میں چٹرجی کے قریبی دوستوں میں طاہر صدیقی تھے جو سپریم کورٹ کے ایک سینئر ایڈوکیٹ کے طور پر ماشاءاللہ اب بھی سرگرم ہیں وہ بھی چٹرجی کے آگے پیچھے کسی وقت 'روزانہ ہند' چھوڑ کر دہلی آگئے اور ہمدرد دواخانہ کے ہفت روزہ 'ہمدرد' کے مدیر ہوگئے اور اسی دوران قانون کی ڈگری اور ڈگر پکڑی۔

'عصرِ جدید' میں چٹرجی کے قیام کے دوران بعض دلچسپ واقعات ہوئے۔ خان بہادر صاحب کا اصرار تھا کہ صفحہ اول پر لیڈ کی خبر کو 'اسٹیٹس مین' کی لیڈ کے مطابق ہونا چاہیے لیکن یہ کیسے ممکن ہوسکتا تھا دوسری پریشانی یہ تھی کہ کون سی خبر کو لیڈ ہونا چاہیے تھا جو نہیں ہوئی یا جو لیڈ کی خبر بنائی گئی وہ اس قدر اہم نہیں تھی۔ اس پریشانی کا حل چٹرجی نے یہ تجویز کیا کہ رات کو دس بجے خبریں اور سرخیاں تجویز کرکے خان بہادر صاحب کے پاس بھیج دی جاتیں اور ان کے فیصلے کے مطابق عمل کیا جاتا۔ اس وقت خان بہادر صاحب کی رہائش مسجد کولوٹولہ کے قریب ہی تھی۔ کچھ روز یہ سلسلہ چلا ایک روز رات میں ایک بجے کے قریب کوئی اہم خبر آگئی جس نے پہلے کی خبروں کا توازن بگاڑ دیا۔ چٹرجی نے پھر ان خبروں کو خان بہادر صاحب کے گھر بھیج دیا۔ اس پر ان کا غصہ کسی قدر فطری تھا۔ چنانچہ اس دن سے وہ سلسلہ بند ہوگیا۔ دوسری پھلجھڑی یہ چھوٹی کہ یہ لوگ

بڑی بڑی سرخیاں لگا کر جگہ بھر دیتے ہیں جو ایک طرح کی کام چوری ہے، چنانچہ نئی ہدایت جاری ہوئی کہ زیادہ سے زیادہ خبریں سنگل کالم کی سرخیوں کے ساتھ دی جائیں اور لیڈ کی خبر بھی سہ کالمی سے زیادہ نہ ہو۔ بس اگلے دن لیڈ کی خبر ڈبل کالم کی بنائی گئی اور اتفاق سے کئی اہم لیڈروں کی تقریریں اور بیانات تھے سب سنگل سرخیوں کے ساتھ لگادی گئیں۔ ''پنڈت نہرو کی تقریر''، ''مولانا آزاد کا بیان'' وغیرہ۔ سارا اخبار سپاٹ ہوگیا۔ بس وہ ہدایت نامہ بھی منسوخ ہوگیا۔ چٹرجی کے خلاف یہ سارے دباؤ بنتے جارہے تھے جو ایک دن دھماکہ خیز ثابت ہوئے۔

لیکن چٹرجی کلکتہ میں ایک پھلجھڑی چھوڑ گئے یعنی مجھے انڈین جرنلسٹس ایسوسی ایشن کا ممبر بنوادیا۔ جب پریس کمیشن کے بعد اجرتی بورڈ کی سفارشات آئیں اور ان کے نفاذ کے سلسلے میں ایسوسی ایشن اور مالکان کے درمیان عام گفت وشنید ہونے لگی تو لازماً ان لوگوں نے اردو پریس کے حالات ومعاملات کے بارے میں مجھ سے رجوع کیا اسی اثناء میں دو ایک لوگ اور بھی ایسوسی ایشن کی میٹنگوں میں جانے لگے تھے جن کے مقاصد غیر واضح تھے اس لیے کہ وہ لوگ نہ ممبر تھے نہ ممبر بنے۔ ایسوسی ایشن میں سارے کے سارے بنگالی تھے ماسوا ایک ہندی جرنلسٹ کے اس لیے ان لوگوں کو اردو پریس کے بارے میں کچھ علم نہ تھا لیکن جب اخباروں کی درجہ بندی اور اسٹاف کی نوعیّتوں کا سوال سامنے آیا تو سارے معاملات کو سمجھنا لازم تھا۔ ایک بات تو بالکل صاف تھی جسے میں نے شروع میں ہی بتادیا تھا کہ کلکتہ اردو پریس میں لے دے کر معاملہ صرف صبح کے تین اخباروں کا ہے یعنی 'عصرِ جدید'، 'آزاد ہند' اور 'روزانہ ہند' اور یہ سب اشاعت کے اعتبار سے سب سے آخری زمرے میں آتے ہیں لیکن اس زمرے میں بھی کارکن صحافیوں کے مناصب اور اسی اعتبار سے تنخواہوں کا تعین تو ضروری تھا۔ غالباً ایسوسی ایشن کی ایگزیکیوٹیو کمیٹی کے دو ایک ممبروں نے ان اخباروں کے مالکوں سے گفتگو کی لیکن ان لوگوں نے ان ممبروں کو منہ نہیں لگایا تو ان لوگوں نے باضابطہ تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا، مگر اس کے لیے ضروری تھا کہ خود اردو پریس میں جو صحافی ہیں ان کی ایک تعداد سامنے آئے، وہاں ایک سرے سے میدان خالی تھا۔ میرے جیسے صرف دو تین آدمی تھے جو صرف اخباروں میں کام

کررہے تھے مثلاً 'عصرِ جدید' میں مصطفیٰ صابری اور اقبال اکرامی محض ایڈیٹر ہی نہیں بلکہ خان بہادر صاحب کے مقربین میں شمار کیے جاتے تھے۔ مطیع الرحمٰن کارپوریشن اسکول میں ٹیچر تھے، صبح کو ایک گھنٹہ 'امروز' میں اور شام کو گھنٹے دو گھنٹے 'عصرِ جدید' میں کام کرتے۔ اور بھی جو لوگ آتے جاتے رہے ان میں جاوید نہال، سجاد نظر اور راز عظیم ٹیچر تھے، ناظر الحسینی اور رئیس جعفری پوری طرح اخباروں میں رہے لیکن ایسوسی ایشن اور نئی تحریکات سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی، یہی کیفیت شہاب لکھنوی کی تھی، شہزاد منظر اور مشتاق احمد اسپورٹس رپورٹنگ کرتے رہے، ادریس الحق باقاعدہ رپورٹر تھے لیکن ان کی کہانی مختلف ہے۔

ایک نو وارد:

۱۹۵۴ء میں نئی تحریکات کا ابتدائی زمانہ تھا، ایک روز دن میں دس گیارہ بجے کے قریب میں 'عصرِ جدید' میں کام کررہا تھا کہ ایک نوجوان خوبرو، چہرے پر ذہانت کی تحریر اور رویہ میں خود اعتمادی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ ''مجھے سید ظفیر الحسن کہتے ہیں، میں پٹنہ سے کام کی تلاش میں آیا ہوں، وہاں اخبار میں کام کا مجھے کچھ تجربہ ہے۔'' یہ تھے ظفیر صاحب جن سے قربت اور دوری کے باوجود آخری وقت تک بے تکلفی اور رفاقت کے رشتے استوار رہے جن میں خلوص کی گھلاوٹ شامل رہی۔ تو میں انھیں لے کر منیجر اقبال صاحب کے کمرے میں گیا اور ان کا تعارف انہی کے الفاظ میں کرایا۔ انھوں نے فرمایا: 'جی' خان بہادر صاحب سے کہہ دیا جائے گا، ویسے آتے رہیں۔ چنانچہ ظفیر صاحب آتے رہے خان بہادر صاحب سے کہہ دیا گیا ہوگا، اجازت مل گئی ہوگی۔ پھر جلد ہی حکم ہوا کہ وہ دن میں محمد جان ہائی اسکول میں پڑھایا کریں جو اسی بلڈنگ کی دو بالائی منزلوں میں تھا۔ وہ دن کو اسکول میں پڑھانے لگے اور رات کو میرے ساتھ کام کرنے لگے۔ ذہنی قربت کی وجہ سے ہماری بے تکلفی بڑھتی گئی۔ جب انڈین جرنلسٹس ایسوسی ایشن سے میری وابستگی کی خبر سرکاری طور پر عام ہوگئی تو ایک روز ایسا ہوا کہ جب میں حسبِ معمول رات کو ۹ بجے شروع ہونے والی شفٹ میں کام کے لیے آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس وقت تک کی پی ٹی آئی کی خبریں جنھیں میں ایڈٹ کیا کرتا تھا اور ان کی سرخیوں اور صفحات کا

تعین کرتا تھا ان کو ظفیر صاحب نمٹا کر اور ضروری ہدایات تحریر کر کے کھانا کھانے کے لیے چلے گئے تھے۔ جب وہ واپس آئے تو میں نے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے ایسا ہی کرنے کی ہدایت کی گئی ہے لیکن وہ سارے معاملہ کو سمجھ گئے اور ساری خبریں میری طرف سرکاتے ہوئے خود کنارے ہوگئے۔ اس کے بعد وہ نیوز ایڈیٹنگ کے قریب نہیں آئے لیکن کام کرتے رہے، مگر انتظامیہ سے ان کے تعلقات کشیدہ ہوتے گئے۔ اسی اثناء میں ان کی شادی ہوگئی۔ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن صاحب کے بڑے بھائی عنایت الرحمٰن صاحب کی صاحبزادی بلقیس ظفیر الحسن نے ان کی باگ ڈور سنبھالی۔

اس سے پہلے پٹنہ سے ایک اور نوجوان وارد ہوئے تھے۔ انھوں نے ایک مہینہ 'عصرِ جدید' میں شام کے وقت کام کیا ہوگا اس کے بعد اجرت وغیرہ معلوم کرنے کے لیے منیجر صاحب کے پاس گئے، معلوم نہیں کیا بات ہوئی یا نہیں ہوئی انھوں نے ایک مہینے کے پیسے لیے اور پھر 'عصرِ جدید' کے دفتر کا رخ نہیں کیا۔ وہ تھے وہاب اشرفی جو اردو ادب کی دنیا میں ڈاکٹر وہاب اشرفی کے نام سے شہرت رکھتے ہیں۔

پہلی جسارت:

۱۹۵۶ء میں اخبار نویسوں کے اجرتی بورڈ کی سفارشات بھی آگئیں۔ میں گھر جانے کے لیے ایک مہینے کی چھٹی کی درخواست کے ساتھ منیجر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور پہلی بار یہ لکھنے کی جسارت کی کہ چھٹی باتنخواہ دی جائے جبکہ ایسی کوئی روایت کہیں نہیں تھی لہٰذا وہ درخواست نامنظور ہوگئی۔ فاتح فرخ اور ظفیر صاحب نے مجھ سے کہا کہ دفتر سے چھٹی لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، تم دو ہفتے کے لیے گھر جاؤ تمہارے حصے کا کام ہم دونوں ایک ایک ہفتہ کر دیں گے۔ چنانچہ میں نے منیجر صاحب کو اس کی اطلاع کر دی اور گھر چلا گیا۔

یونیورسٹی میں جرنلزم کا دو سال کا کورس مکمل ہوگیا تھا اس لیے وہاں بھی سیشن ختم ہوگیا تھا لیکن امتحان میں ابھی ایک مہینہ باقی تھا۔ میں گھر سے واپس آگیا تو فاتح فرخ نے ایک ہفتے کی چھٹی لے لی پھر میں اپنے کام کے علاوہ ان کے حصے کا کام بھی کرنے لگا۔ اسی اثناء میں پٹنہ

سے ظفیر صاحب کی بیگم کی علالت کی خبر آئی چنانچہ ان حضرت نے فوراً پٹنہ کے لیے پہلی ٹرین پکڑی اور اپنے حصے کا کام بھی میرے ذمہ کر گئے۔ غرضیکہ میں دن رات تین آدمیوں کا کام نمٹانے میں لگ گیا۔ یہاں یہ یاد دلا دوں کے ایک شخص کی اوسط کارگزاری چھ کالم یومیہ ترجمہ کے برابر ہوتی تھی یعنی اخبار کے ایک صفحہ کے برابر۔ ان دنوں اخبار کے ایک صفحہ میں چھ کالم ہوا کرتے تھے۔ غالباً ظفیر صاحب اور فاتح فرخ کی کارگزاری چار چار کالم یومیہ تھی۔ اسی اثنا میں ایک دن یونیورسٹی میں ہم لوگوں کی فیئر ویل پارٹی تھی شام کو وہاں کچھ دیر ہوگئی تو کھانا کھانے کے لیے گھر نہیں گیا بلکہ سیدھا 'عصرِ جدید' آ گیا اور کام میں مصروف ہوگیا۔ وہیں میز پر کام کرتے کرتے غش آ گیا۔ اس واقعہ کے بعد تو بہت بیمار رہنے لگا۔ ادھر صابری صاحب کو یہ احساس ہوگیا کہ بحیثیت ایڈیٹر جو تنخواہ ان کو مل رہی ہے، اس سے بہت زیادہ ہونی چاہیے چنانچہ انھوں نے اس میں اضافے کے مطالبے پر اصرار کے لیے ایسوسی ایشن کا رخ کیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کب اور کیسے لیکن وہ ایسوسی ایشن کے ممبر بن گئے۔ اسی طرح مینجمنٹ کے خیال کے مطابق ''بغاوت'' پھیلتی گئی۔ ایک روز شام کو منیجر صاحب اور ظفیر صاحب کے درمیان تلخ کلامی بڑھ کر ہاتھا پائی تک نوبت آ گئی لیکن وہاں موجود لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ اس کے بعد ظفیر صاحب نے کچھ روز 'آزاد ہند' میں کام کیا اور پھر حکومت مغربی بنگال نے پندرہ روزہ 'مغربی بنگال' کی ادارت کے لیے ان کا انتخاب کر لیا۔ سال ڈیڑھ سال پہلے بھی یہ جگہ خالی ہوئی تھی تو اس کے لیے درخواستیں طلب کی گئی تھیں اس وقت جو امیدوار شریک ہوئے تھے، ان میں ظفیر صاحب کے علاوہ میں اور جاوید نہال بھی تھے لیکن ایک صاحب چرن سرن نازؔ تھے جو آگرہ سے آئے تھے انہی کا انتخاب ہوا۔ انٹرویو لینے والے تین حضرات تھے حکومت مغربی بنگال کے دفتر اطلاعات کے ڈائریکٹر مسٹر ماتھر، ڈاکٹر ہیرالال چوپڑہ اور اس وقت 'روزانہ ہند' کے ایڈیٹر غلام سرور فگارؔ۔ آگے چل کر نازؔ صاحب سے ہم لوگوں کی بے تکلفی ہوگئی تو اندازہ ہوا کہ وہ کلکتہ سے بہت بیزار ہیں اور کسی تعلیمی ادارے میں کام کو کر ترجیح دیتے ہیں چنانچہ ہم لوگوں کا قیاس درست نکلا، وہ ایک سال کے اندر ہی اس ملازمت سے دست بردار ہوگئے۔ جب اس خالی جگہ کے

لیے پھر اشتہار شائع ہوا تو ظفیر صاحب نے مجھ سے کہا کہ آؤ پھر چلیں لیکن اس بار میں نے جانے سے انکار کر دیا اور معلوم نہیں امیدواروں میں اور کون لوگ تھے۔ بہر حال ظفیر صاحب لے لیے گئے۔ چند برس بعد وہ حکومتِ ہند کی وزارت اطلاعات کے تحت انفارمیشن افسر کی ایک جگہ کے لیے منتخب ہو گئے تو کلکتہ کو خیر باد کہہ کر بمبئی چلے گئے، اس کے بعد کی کہانی طویل اور رنگا رنگ ہے جو بمبئی میں تیار کی جانے والی ڈاکومنٹری فلموں میں اردو کمنٹری رائٹنگ سے لے کر محکمہ دفاع کے پونا میں واقع جنوبی کمانڈ کے ہیڈ کوارٹر میں پی آر او کی کرسی کو رونق بخشنے اور دہلی میں حکومت ہند کے محکمہ ڈی اے وی پی میں ڈپٹی ڈائریکٹر اور پھر پلاننگ کمیشن کے ماہنامہ 'یوجنا' کے چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے سبکدوشی کے بعد تین سال تک حکومت جموں و کشمیر کو بحیثیت ڈائریکٹر آف انفارمیشن اپنے تجربات سے نوازتے ہوئے ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے۔ ہم لوگ اٹھارہ برس کی دوری اور دو ہزار میل کے فاصلے طے کر کے دہلی میں اکٹھا ہو گئے تھے۔

واپس کلکتہ چلیں۔ ایسوسی ایشن نے جب صابری صاحب کے کیس کی پیروی شروع کر دی تو 'عصرِ جدید' میں ان کی طنابیں کسی جانے لگیں۔ پھر ایسا ہوا کہ میں دو بجے دن میں کچھ دیر کے لیے دفتر میں آتا تو اس وقت صابری صاحب 'عصرِ جدید' کا ایڈیٹوریل لکھتے ہوتے لیکن رات کو دیکھتا کہ کسی اور کا لکھا ہوا ایڈیٹوریل کاپی میں لگا ہوا ہے۔ کچھ روز ایسا ہی ہوتا رہا، حالات کے رخ کا اندازہ تو سب ہی کو ہو گیا تھا۔ ایک روز صبح کو 'عصرِ جدید' کی پیشانی پر مولانا عطاء الرحمٰن قدسی کا نام بطور ایڈیٹر چھپ گیا۔ صابری صاحب سے کہہ دیا گیا کہ اب آپ کی ضرورت نہیں رہی۔ چند دنوں بعد انھوں نے 'آزاد ہند' میں کام شروع کر دیا لیکن اس کے ساتھ ہی ایسوسی ایشن نے لیبر ٹریبونل میں ان کا مقدمہ بھی پیش کر دیا۔ جب وہاں کسی تاریخ پر پیشی کی نوبت آئی تو ظاہر ہے میں بحیثیت نیوز ایڈیٹر سب سے مضبوط گواہ ہو سکتا تھا چنانچہ مجھ سے عدالت میں یہ بیان دینے کے لیے کہا گیا کہ صابری صاحب نے ایڈیٹوریل لکھنا چھوڑ دیا تھا اس لیے انھیں برطرف کر دیا گیا۔ میں نے ایسا کوئی بیان دینے سے انکار کر دیا تو خان بہادر صاحب کے صدر دفتر میں میری طلبی ہوئی اور انھوں نے مجھ سے وہی بات کہی کہ آپ کو ایسا بیان

دینا ہے۔ میں نے صاف انکار کردیا بلکہ یہ بھی کہہ دیا کہ وہ روزانہ میرے سامنے ایڈیٹوریل لکھتے تھے اس کے بعد منیجر صاحب اس کا کیا کرتے تھے مجھے نہیں معلوم۔ پھر تو میں بالکل باغی قرار دے دیا گیا بلکہ بغاوت کی قیادت کے الزام سے بھی مجھے سرفراز کیا گیا۔

سید محمد مصطفیٰ صابری کی شخصیت سنجیدگی اور زندہ دلی کا عجیب مرقع تھی۔ (ان کا ذکر پہلے آچکا ہے) اسی طرح دینی اور دنیوی تعلیم، دینداری اور دنیا داری ان کی شخصیت میں ایک تناسب سے موجود تھے۔ وعظ و نصیحت تو نہیں کرتے لیکن دینی مسائل سے پورا وقوف رکھتے تھے، نماز ہمیشہ پابندی سے مسجد میں باجماعت ادا کرتے لیکن فلموں کے پری ویو سے بھی نہیں چوکتے۔ علم تصوف پر انھیں اتنا عبور تھا کہ ''غالب اور تصوف'' کے زیرِ عنوان ایک کتاب تصنیف کی جسے دارالاشاعت اسلامیہ، کلکتہ نے شائع کیا۔ گورے چٹے، چوڑے چکلے صابری صاحب ہمیشہ قمیص پاجامے اور کالی رامپوری ٹوپی میں ملبوس رہتے۔ ان کی ترچھی رامپوری ٹوپی ان کے مزاج کے تیکھے پن کا مظہر تھی تو قمیص کے دامن سے جھانکتا ہوا ازار بند کا پھندنا ان کی رنگین مزاجی کا نقیب۔ صابری صاحب داڑھی شیو کرتے، مونچھیں بہت باریک تراشی ہوئی جو اتنی بھوری تھیں کہ سنہری معلوم ہوتیں۔ وہ اپنے وقت میں واقعی گبرو جوان رہے ہوں گے۔ انہیں سماع سے بھی شغف تھا جس کا اندازہ ایک واقعہ سے ہوتا ہے۔ صابری صاحب نے 'عصرِ جدید' سے برطرفی اور 'آزاد ہند' سے وابستگی کے بعد جرنلسٹس ایسوسی ایشن کے ایما سے 'عصرِ جدید' سے معاوضہ کا مقدمہ لیبر ٹریبونل میں پیش کیا۔ سال دو سال بعد جب مقدمے کا فیصلہ ہوا تو صابری صاحب کو مبلغ -/1800 روپے ملے۔ کچھ دنوں بعد ایک روز ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا کہ بھائی اتنے روپے کا آپ نے کیا کیا۔ کہنے لگے کہ دو سو روپے میں ایک ہارمونیم خرید کر لایا ہوں۔ خالی وقت میں اپنے کمرے میں بجاتا ہوں اس سے پڑوسی بھی محظوظ ہوتے ہیں (اس وقت تک ٹی وی ہمارے گھروں میں نہیں آیا تھا، ہاں اس کی خبر آ گئی تھی)۔ صابری صاحب نہایت سادہ لیکن کھانے کے شوقین تھے۔ مغربی بنگال کے نیو سکریٹریٹ کی عمارت کی افتتاحی تقریب میں کھانے پینے کے بعد انھوں نے مجھے بتایا کہ میں نے ۱۳ سندیش کھائے

ہیں۔ میرے اظہارِ حیرت پر فرمایا: ''میاں مٹھائی کا خانہ الگ ہوتا ہے وہ خالی رہتا ہے جب مٹھائی ملتی ہے تو بھر دیا جاتا ہے۔'' دسمبر ۱۹۷۸ء میں اپنے وطن میں ان کا انتقال ہوا۔

ایک اور نو وارد:

جس طرح ظفیر صاحب 'عصرِ جدید' کے دفتر میں نمودار ہوئے تھے بالکل اسی طرح دو سال بعد ایک اور صاحب وارد ہوئے۔ یہ حضرت بھی پٹنہ سے تشریف لائے تھے۔ ان کا نام راجیندر بھارتی تھا لیکن 'بھارتی جی' کے نام سے معروف ہوئے۔ یہ شعبۂ اشتہارات کی کارکردگی میں مہارت رکھتے تھے۔ انھیں بھی منیجر صاحب کے دفتر میں لے جا کر میں نے ان کا تعارف کرایا۔ وہ کافی قابلِ قبول ثابت ہوئے کیونکہ ان کا تعلق آمدنی کے وسائل سے تھا۔ بہت جلد انھیں خان بہادر صاحب کے دربار میں شرف باریابی حاصل ہو گیا بلکہ اشتہارات کے سلسلے میں آمد و رفت کے لیے خالی وقتوں میں خان بہادر صاحب کی گاڑی کے استعمال کی بھی اجازت مل گئی۔ ان کی کہانی مختصر ہے اور طولانی بھی کیونکہ وہ جس طرح اچانک نمودار ہوئے تھے، اسی طرح کوئی پتہ نشان چھوڑے بغیر اچانک غائب بھی ہو گئے لیکن میری دنیا کو بالکل بدل کر گئے، شاید قدرت نے ان کو اسی کام پر مامور کیا تھا۔

چونکہ بھارتی جی 'عصرِ جدید' کے لیے اشتہارات حاصل کرنے کی مہم پر تھے اس لیے لازم تھا کہ وہ 'عصرِ جدید' کو کلکتہ کا اہم ترین اردو اخبار ظاہر کریں۔ اس سلسلے میں وہ کبھی کبھی مجھے بھی ساتھ لے جاتے اور میرا تعارف 'عصرِ جدید' کے نیوز ایڈیٹر کے طور پر کراتے۔ اسی طرح ایک روز وہ مجھے امریکی دفتر اطلاعات (یو ایس آئی ایس) میں بھی لے گئے جو شہر کے قلب یعنی دھرمتلہ میں چورنگی روڈ پر واقع تھا۔ وہاں پریس چیف مسٹر ہیرن موئے گپتا سے میرا تعارف کرایا۔ ان لوگوں کو کلکتہ میں اردو پریس سے کوئی خاص واقفیت نہیں تھی۔ اس وقت 'روزانہ ہند' کے ایڈیٹر مسٹر غلام سرور فگار وہاں آتے جاتے تھے اور مسٹر جی ایس فیگر کے نام سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ وہ اپنے اخبار کو سب سے بڑا اردو اخبار بتاتے تھے جبکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ بھارتی جی نے 'عصرِ جدید' کی نہ معلوم کیا کیا ہوا باندھی ہوگی۔ گپتا صاحب اس سے

متاثر تھے۔ ایک دن وہ دفتر 'عصرِ جدید' میں بھی آ گئے۔ بھارتی جی انھیں لے کر آئے اس وقت میں ہی ڈسک پر تھا۔ منیجر صاحب سے بھی ملاقات کرائی۔ بلڈنگ تو صاف ستھری لمبی چوڑی تھی ہی گپتا صاحب کو کیا معلوم کہ 'عصرِ جدید' کا عملہ صرف ایک کمرے میں گُھٹا کرتا ہے۔ اسی واقعے کے بعد گپتا صاحب نے یو ایس آئی ایس میں کچھ کام کرنے کی تجویز پیش کی لیکن اس کے لیے باقاعدہ ٹسٹ کی شرط بھی رکھی۔ خیر! کئی مرحلوں سے گزرنے کے بعد میں نے وہاں جز وقتی کام شروع کر دیا۔ یہ بات ستمبر ۱۹۵۷ء کی ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس مقابلے میں چھ امیدوار تھے جن کے الگ الگ انٹرویو لیے گئے تھے۔

اس ضمن میں ایک لطیفہ بھی سن لیجیے۔ میرے ترجمہ کے ٹسٹ کے لیے اسی دن کے اردو اخبار کے ایڈیٹوریل کا ایک تراشہ دے دیا گیا تھا میں دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ 'عصرِ جدید' کا ایڈیٹوریل ہے جسے پچھلے روز ادریس الحق نے لکھا تھا اس کی زبان تو جیسی تیسی تھی لیکن مضمون بھی مغلق تھا۔ میں بڑے مخمصے میں پڑا کہ اگر ٹھیک ٹھیک متن کا ترجمہ کر دوں تو انگریزی پڑھنے والا اس مضمون کی خامیوں کو میری کمزوری پر محمول کرے گا، اگر متن کو نظر انداز کروں تو نہ معلوم کہاں ٹھہروں۔ دل ہی دل میں ادریس الحق کو کوستا رہا کہ ظالم کو لکھنا نہیں آتا تو لکھتا کیوں ہے۔ بہر حال، میں نے لیپ پوت کر کے کام چلا لیا۔ صورتِ حال ایسی تھی کہ ادریس سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ خیر! میرا اسلیکشن تو ہو گیا لیکن مجھے معلوم ہے کہ دیگر امیدواروں میں سے بعض نے مجھے کبھی معاف نہیں کیا۔

بھارتی جی کا معاملہ یوں ہوا کہ انھوں نے 'عصرِ جدید' کا آئندہ عید نمبر بڑے پیمانے پر نکالنے کی تجویز پیش کی اور یہ کہ ماہنامہ 'شمع' کے سائز پر اور اسی طرح نکالا جائے۔ اس لیے انھوں نے کافی اشتہارات لانے کا بھی وعدہ کیا۔ خان بہادر صاحب کی طرف سے منظوری کے بعد اس اسکیم پر زور و شور سے کام شروع ہو گیا اور وہ تاریخی عید نمبر شائع ہوا لیکن اس کے بعد دو تین ہفتوں کے اندر ہی بھارتی جی غائب ہو گئے پھر ان کا کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔ کچھ روز بعد کھلتے کھلتے بات کھلی۔ بات یہ ہوئی کہ اشتہارات کے معاملے میں ان سے طے پایا تھا کہ ان کو

اشتہارات کی آمدنی میں سے ۲۵ر فیصد کمیشن دیا جائے گا۔ چنانچہ ان کے لائے ہوئے اشتہارات تقریباً دس ہزار روپیہ کے تھے جو کہ اس زمانے میں کلکتہ کے کسی اردو اخبار کے لیے ایک بھاری رقم تھی لیکن جب کمیشن کی ادائیگی کی بات آئی تو ان سے کہا گیا کہ ساڑھے بارہ فیصد لے لیں۔ یہ سن کر بھارتی جی خاموش ہوگئے اور جو اشتہارات وہ لائے تھے ان کے بل بنا کر پارٹیوں سے روپیہ وصول کیا اور ساری رقم لے کر چمپت ہوگئے پھر کسی نے کچھ نہ سنا۔

ایک اور مفقود الخبر :

اسی طرح اچانک مفقود الخبر ہوجانے والی ایک اور شخصیت کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ آزادی اور تقسیمِ وطن کے بعد کئی برسوں تک ہندوستان اور مشرقی پاکستان کے درمیان آمدورفت کے لیے ویزا پاسپورٹ کی کوئی خاص پابندی نہیں تھی۔ لوگ دونوں طرف آتے جاتے رہے۔ ۱۹۵۲ء میں دونوں ملکوں کے درمیان نہرو لیاقت معاہدہ ہوگیا جس کے مطابق دونوں ملکوں کے درمیان آمدورفت کے لیے ویزا پاسپورٹ کے ضابطوں کا نفاذ ہوا، ان کی باہمی کشیدگی میں بھی کچھ کمی آئی۔ دونوں طرف رفوجیوں کے ساتھ اور اقلیتوں کے ساتھ بہتر سلوک کی بات بھی ہوئی۔ چنانچہ سارے ضابطوں کے باوجود ویزا پاسپورٹ کے معاملات میں نرمی برتی جاتی تھی۔ کلکتہ میں پاکستان کا ڈپٹی ہائی کمیشن ہندوستان سے جانے والوں کے لیے آسانی سے ویزا جاری کررہا تھا تاہم دفتری کارروائی کی پیچیدگیاں تو تھیں ہی۔ چونکہ جانے والوں کی تعداد خاصی زیادہ تھی، ان میں بھی زیادہ تر لوگ بہار سے تعلق رکھنے والے تھے اور دیہی علاقوں سے آرہے تھے، چنانچہ ان کی مدد کرنے کے نام پر ایجنٹ میدان میں آگئے اور برائے نام فیس پر کاغذات کی تیاری اور فراہمی میں امداد کا کام علی الاعلان کرنے لگے۔ یہ ۵۴-۱۹۵۲ء کے دوران اس زمانے کی بات ہے جب اقبال کلکتوی صاحب اقبال اعظمی کے نام سے 'امروز' کے ایڈیٹر مقرر ہوگئے تھے۔ صبح ۹ بجے کے قریب جب وہ کلّوں میں پان بھرے ہوئے قہقہوں کے فوارے چھوڑتے ہوئے دفتر آتے تو ان کے آگے پیچھے دو ایک طفیلی بھی ہوتے۔ وہی لوگ پاکستانی ویزا دلانے کا کام کررہے تھے۔

ایک روز ایک صاحب ادھیڑ عمر کے ان کے ساتھ آئے۔ اچھا درمیانہ قد، رنگ گہرا سانولا۔ کالی شیروانی اور جناح کیپ جو کلکتہ میں عام طور سے نہیں استعمال کی جاتی تھی۔ چوڑی موری کا پاجامہ اور کالا بوٹ۔ آنکھوں میں ڈھیر سارا سرمہ، منہ میں پان کے باقیات، خفیف سی داڑھی۔ وہ حضرت کچھ دیر بیٹھے رہے، پھر کچھ کاغذات وغیرہ لے کر چلے گئے۔ اس کے بعد وہ اسی طرح روز آنے لگے۔ ان کو حافظ صاحب کہہ کر مخاطب کیا جاتا۔ رفتہ رفتہ اقبال اعظمی نے غالباً خان بہادر صاحب کی اجازت سے حافظ صاحب کو اس اعلان کی اجازت دے دی کہ پاکستانی ویزا حاصل کرنے میں مسافروں کی سہولت کے لیے ۹ر بی بولائی دت اسٹریٹ میں مشاورتی خدمات مفت پیش کی جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے حافظ صاحب کو کسی سے کچھ لیتے دیتے نہ کبھی دیکھا نہ سنا۔ خان بہادر اور منیجر صاحب سے بھی ان کے تعلقات خاصے بے تکلفانہ ہو گئے۔ تب میں نے ایک روز ان سے پوچھ ہی لیا کہ کیا آپ ۴۳-۱۹۴۲ء میں کانپور میں رہ چکے ہیں۔ انھوں نے بالکل بے خیالی میں کہا ''ہاں'' پھر میں نے پوچھا ''آپ مدرسہ فیض عام کانپور میں پڑھاتے تھے؟'' تب وہ چونکے اور پوچھنے لگے کہ ''آپ کو کیسے معلوم؟'' پھر میں نے جلدی سے اگلا سوال بھی پوچھ لیا ''کیا آپ ۱۹۴۵ء میں لکھنؤ میں ریلوے میں ٹی ٹی تھے؟'' تب انھوں نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے کہا کہ ''آپ حافظ عبدالکریم صاحب ہیں؟'' تب وہ مجھ سے اصرار کرنے لگے کہ اپنے بارے میں بھی بتاؤ۔ تب میں نے انھیں بتایا کہ میں آپ کا شاگرد رہ چکا ہوں اور ۱۹۴۵ء کی گرمی کی چھٹیوں میں کانپور سے گھر جاتے ہوئے لکھنؤ میں ٹرینوں میں سخت بھیڑ بھاڑ میں آپ نے میری مدد کی تھی اور ایک قلی سے میرا سامان ٹرین میں چڑھوایا تھا اور جگہ دلوائی تھی۔ اس دن کے بعد میرے اور حافظ صاحب کے درمیان شاگرد استاد جیسے تعلقات ہو گئے۔

حافظ صاحب بھاگلپور کے رہنے والے تھے۔ قیاس ہے کہ وہ کوئی سال بھر 'امروز' کے دفتر میں رہے ہوں گے۔ ان کا رہنا سہنا بھی اسی کمرے میں ہوتا۔ غالباً کسی ہوٹل میں کھانا پینا ہوتا رہا ہوگا۔ لیکن بے تکلفی کے باوجود ان کی شخصیت اور مصروفیات پر دبیز پردہ پڑا ہوا تھا۔ وہ

کبھی کبھار مشرقی پاکستان اور کبھی بھاگلپور آتے جاتے رہتے۔ اس میں کسی تعجب یا حیرانی کی کوئی بات نہ تھی نہ اس میں کچھ غیر معمولی تھا۔ لیکن ایک بار ایسا ہوا کہ وہ کہیں گئے تو پھر واپس نہیں آئے۔ ہم لوگ بھی بھول بھال گئے۔ لیکن کچھ عرصے بعد ایک شخص کھلنا سے آیا تو اس نے بتایا کہ وہاں حافظ صاحب کا بہت بڑا کاروبار ہے۔ وہ کاسمیٹکس کی کئی بڑی اور مشہور کمپنیوں کے مشرقی پاکستان میں ہول سیل ڈیلر ہیں۔ اس شخص نے بتایا کہ ان کے ظاہری رکھ رکھاؤ میں کوئی فرق نہیں آیا ہے لیکن آپ ان کی حیثیت کا اندازہ نہیں کر سکتے اور یہ کہ مقامی بنگالی آبادی سے بھی ان کے تعلقات بہت اچھے ہیں۔ پھر کچھ عرصہ بعد صرف اتنا سنا گیا کہ وہ کھلنا سے کراچی چلے گئے۔ ان کے قیام کلکتہ کے زمانے میں ہی پاکستانی وزیر اعظم چودھری محمد علی کلکتہ آئے تھے۔ دمدم ہوائی اڈے پر ان کا ہوائی جہاز اترا تو جو لوگ دوڑتے ہوئے جہاز کی سیڑھیوں تک ہار وغیرہ لے کر پہنچ گئے تھے ان میں حافظ صاحب بھی شامل تھے۔ اگلے دن اسٹیٹمین کے صفحہ اول پر وزیر اعظم پاکستان کی آمد کی جو تصویر شائع ہوئی اس میں ان کے جلو میں چلنے والے دو تین لوگوں میں حافظ صاحب بھی شامل تھے۔

ایک جائزہ:

اب یہیں ۱۹۵۷ء کے آس پاس ٹھہر کر کیوں نہ کلکتہ کے اردو پریس میں جاری تحریکات کا ایک جائزہ لے لیا جائے۔ صابری صاحب کے 'آزاد ہند' میں چلے جانے کے بعد 'عصرِ جدید' میں شہابؔ لکھنوی آ گئے۔ وہ اداریے لکھنے لگے۔ رات میں ہم دونوں ساتھ کام کرتے اور ایک تیسرے نوجوان رکن بدر عالم نظامی کا اضافہ ہو گیا، نرم خو، مرنجان و مرنج قسم کے آدمی تھے اور ہیں۔ وہ دن رات گھوم پھر کر 'عصرِ جدید' میں کچھ نہ کچھ کیا کرتے، اخبار کی پیشانی پر بطورِ ایڈیٹر مولانا عطاء الرحمٰن قدسی کا نام چھپتا رہا۔ وہ 'عصرِ جدید' میں 'ارشاداتِ نبوی' کے زیرِ عنوان ایک کالم لکھتے رہے اور اس کی کتابت کرتے رہے۔ چونکہ یہ سلسلہ سال بہ سال چلتا رہا اس لیے سابقہ برس کی 'عصرِ جدید' کی فائل سے احادیث نقل کر دی جاتیں۔ مولانا موقع محل کی مناسبت سے کچھ ترمیم و اضافہ کرتے رہے ہوں گے لیکن ۱۹۵۶ء میں جب خان بہادر صاحب

نے دارالاشاعت اسلامیہ قائم کیا تو مولانا عطاء الرحمٰن صاحب کو اس کا مدارالمہام مقرر کیا۔ یہ اشاعت گھر مسجد کولوٹولہ سے متصل خان بہادر صاحب کے خاندانی تجارتی ادارے ''جیون بخش محمد جان'' سے بھی متصل تھا اور ہے۔ جب اس طرف مولانا کی مصروفیات بڑھ گئیں تو اس کالم کی کتابت کا سلسلہ جاری رکھنا ان کے لیے ممکن نہ رہا۔ چنانچہ یہ کام کسی اور کاتب کے ذمہ کر دیا گیا جنھیں سابقہ فائل سے صرف میٹر نقل کرنا تھا۔ موقع محل کا لحاظ رکھنا ان کا کام نہ تھا۔

صبح کے اخباروں میں 'عصرِ جدید' کے علاوہ 'آزاد ہند' اور 'روزانہ ہند' تھے شام کو 'آبشار' اور 'امروز' کے علاوہ مختلف ہفت روزہ اور ماہنامے بھی طلوع اور غروب ہوتے رہے لیکن دونوں اول الذکر اخبار ہی قابلِ ذکر تھے۔ 'عصرِ جدید' میں خان بہادر صاحب کے سرمائے کے علاوہ اس اخبار سے ان کا سیاسی وقار بھی وابستہ تھا۔ ایڈیٹر وقتاً فوقتاً بدلتے رہے جن کی لیاقت کے باب میں صرف اتنا ہی کافی تھا کہ وہ ایسی کوئی بات نہ لکھیں جو کانگریس کی پالیسی اور جمعیۃ العلماء کے مسلک کے خلاف ہو۔ جو مترجمین تھے ان کے لیے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کی صلاحیت کے علاوہ لازم تھا کہ وہ کم و بیش ایک سو روپیہ ماہوار لینے پر راضی ہوں، مزید یہ کہ ان کا اور کوئی مطالبہ نہ ہو۔ کاتب چونکہ اخبار کے لیے ایک مجبوری تھے اس لیے ان کی تنخواہیں مترجموں کی بہ نسبت بہتر تھیں۔ لیکن 'عصرِ جدید' کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اتنے لائق و فائق خوش نویس کسی اخبار میں کبھی نہیں اکٹھا ہوئے۔ ان میں سے چار تو اپنے فن میں استاد تھے اور ان کے شاگردوں کے حلقے بھی تھے اور ان میں سے کئی ادبی ذوق اور دینی علوم سے آگاہی رکھتے تھے۔

'آزاد ہند' کا معاملہ کچھ مختلف تھا۔ احمد سعید ملیح آبادی اخبار کے مالک تھے اور ایڈیٹر تھے۔ اداریے لکھنے کے لیے ایک شخص کو ضرور رکھتے تھے لیکن کسی خاص موقع پر یا کسی خاص موضوع یا مسئلہ پر اظہارِ خیال کرنا چاہتے تو خود ہی لکھتے۔ انھیں تحریر و تقریر دونوں پر عبور کامل تھا۔ چنانچہ اگر کوئی معاملہ یا مسئلہ اہم ہوتا تو اس پر کئی قسطوں میں بھی لکھ سکتے تھے۔ دن میں گھنٹے دو گھنٹے اور شام کو گھنٹے دو گھنٹے دفتر میں بیٹھتے، صرف بیٹھتے ہی نہیں بلکہ ترجمہ وغیرہ بھی کرتے اور اگر

کسی مترجم کی کمی کی وجہ سے مشکل پیش آتی تو رات کو دیر تک کام کرتے رہتے۔ وہ صحیح معنوں میں ورکنگ ایڈیٹر تھے اور اب تک ہیں۔ ان کی یہ انتھک مشقت نصف صدی سے زیادہ عرصے سے جاری ہے غرضیکہ وہ 'آزاد ہند' کے سیاہ وسفید کے مالک تھے اور جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، وہ کسی معاملے میں ایک رائے قائم کر لیتے تو پھر ٹس سے مس نہیں ہوتے اور ان کے فیصلوں میں کسی مشاورت کو بھی دخل نہیں ہوتا، اس لیے ان کے جن خیالات یا قائم کردہ رائے کو میں اپنے ذاتی علم واطلاع کے مطابق بے بنیاد سمجھتا تھا اس پر بھی وہ بدستور قائم رہتے۔ وہ کسی پر اعتماد کم ہی کرتے تھے لیکن ان کی ایک خوبی غیر معمولی تھی وہ یہ کہ اگر ان کی تحریر میں کہیں خفیف سی بھی لغزش ہوتی اور ان کے علم میں آجاتی تو اس کو بلا چوں و چرا تسلیم کر لیتے اور اس کی اصلاح میں نہ خان صاحبی نہ ایڈیٹرانہ انانیت، کوئی چیز آڑے نہ آتی۔

اس زمانے تک 'آزاد ہند' کی پالیسی کانگریس کی طرفداری کی تھی۔ اس کی بنیادی وجہ تو یہی تھی کہ وہ پالیسی انھیں اخبار کے ساتھ ورثہ میں ملی تھی۔ دوسرے یہ کہ اردو اخباروں کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا کیونکہ ریاست اور مرکز میں کانگریس ہی کی حکومتیں تھیں، اس بیان کی تائید میں یہ حقیقت پیش کی جاسکتی ہے کہ ۱۹۷۰ء کا عشرہ شروع ہونے پر جب مغربی بنگال میں بائیں بازو کی پارٹیوں کی حکومت قائم ہوئی تو 'آزاد ہند' نے ان کی پالیسیوں کی تائید و حمایت کی راہ اختیار کی۔ اس کے کچھ اور اسباب بھی تھے۔ ایک تو یہی کہ کانگریس پارٹی کی حکومت نے کلکتہ اور مغربی بنگال کے مسلمانوں پر اندھادھند مظالم کیے تھے اس لیے اس کی تائید کر کے کوئی اخبار عوامی مقبولیت برقرار نہیں رکھ سکتا تھا، مزید یہ کہ ایک پارٹی ورکر محمد امین صاحب جو اپنی پارٹی کے پندرہ روزہ اخبار 'کسان مزدور' کے ایڈیٹر بھی تھے 'آزاد ہند' کے دفتر میں برسوں سے کام کر رہے تھے وہ آگے چل کر ریاستی حکومت میں مختلف وزارتوں پر فائز رہے اس طرح وہ برسرِ اقتدار پارٹی اور 'آزاد ہند' کے درمیان ایک مضبوط کڑی ثابت ہوئے۔ لیکن اس مجموعی صورتِ حال کے لیے احمد سعید صاحب کی موقع شناسی کی بھی داد دینی چاہیے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس راہ میں وہ شام کے اخبار 'آبشار' کو 'آزاد ہند' کا حریف

سمجھتے تھے، ان کے درمیان کشاکش نے کافی طول کھینچا اور محاذ آرائیاں ہوئیں۔ اس کے دیگر پرانے اسباب بھی تھے جن کا تعلق 'آبشار' کے دو مشترک ایڈیٹروں میں سے ایک ابراہیم ہوشؔ کی ذات سے تھا جو ۱۹۵۰ء میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے بلانے پر 'روزانہ ہند' چھوڑ کر 'آزاد ہند' میں آ گئے تھے اور اخبار کے ایڈیٹر مامور ہوئے۔ مولانا تو حکومتِ ہند کے جریدہ 'ثقافت الہند' کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے دہلی چلے گئے۔ آگے چل کر ہوشؔ صاحب اور احمد سعید صاحب کی نہیں بنی اور وہ ۱۹۵۳ء میں 'آزاد ہند' سے کنارہ کش ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے سالکؔ لکھنوی صاحب کے ساتھ مل کر ۱۹۵۴ء میں 'آبشار' جاری کیا۔ یہ دونوں حضرات چونکہ آزاد خیال تھے اور اپنے ترقی پسندانہ نظریات کی وجہ سے کمیونسٹ پارٹی کی پالیسیوں سے اتفاق کرتے تھے اس لیے ان کے اخبار کو پارٹی کا ترجمان تصور کیا جانے لگا جس کی خود ہوشؔ صاحب نے تردید کی ہے۔ سالکؔ صاحب کی شخصیت بہت دلچسپ تھی، اور ہے، جبکہ کہا جاتا ہے کہ وہ ماشاء اللہ ۹۰ کی سرحد پار کر چکے ہیں لیکن ادبی محفلوں اور مشاعروں وغیرہ سے ان کی دلچسپی برقرار ہے۔ ان کے اسلاف لکھنؤ کے کپور گھرانے سے تعلق رکھتے تھے پہلے تعلیم اور پھر کاروباری سلسلے سے کلکتہ میں رہے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ کاروباری نسبت سے انھیں سرمایہ داروں کی صف میں رہنا چاہیے تھا لیکن وہ ورکروں کی صف میں نظر آتے اور کمیونسٹ پارٹی سے ان کی وابستگی تھی۔ ان کے خیالات تو ترقی پسندانہ تھے لیکن ان کی شاعری کو روایتی اردو شاعری کی اچھی مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

ہوشؔ صاحب عسرت میں پلے بڑھے تھے اور مزاج باغیانہ تھا اس لیے بائیں بازو کی سیاست سے ان کی دلچسپی فطری تھی لیکن ان کا یہ رجحان ۱۹۴۷ء کے بعد نمایاں ہوا۔ اس سے پہلے وہ کٹر مسلم لیگی اخبار 'عصرِ جدید' سے وابستہ تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کلکتہ کے غریب اور پچھڑے ہوئے مسلمان طبقے سے ان کی ذہنی وابستگی ہو گئی تھی اس لیے ان کے ہمدرد اور طرفدار ہو گئے تھے۔ انہی کی زبان میں لکھتے اور بولتے تھے اور جس پارٹی کو ان کا ہمدرد دیکھا اس کی طرف جھک گئے لیکن بائیں بازو کی کسی پارٹی سے انھوں نے باقاعدہ کوئی وابستگی نہیں اختیار کی۔

یہی ذہنی فریم ورک سالک لکھنوی اور ابراہیم ہوشؔ کے درمیاں ایسی مضبوط کڑی بن گیا جو ’آبشار‘ کے دفتر سے لے کر سالکؔ صاحب کے گھر تک ان کے تعلقات پر محیط تھی اور ہوشؔ صاحب کی آخری سانس تک برقرار رہی۔

احمد سعید صاحب کا تعلق ملیح آباد کے زمیندار پٹھان گھرانے سے ہے چنانچہ اسلاف کی علمی میراث اور خاندانی خواص ان کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی تھے۔ اس طرح کانگریس پارٹی سے ان کی ذہنی وابستگی اسی میراث کا حصہ رہی ہوگی لیکن بعد میں ریاست میں حکمراں مارکسی کمیونسٹ پارٹی سے ان کی نظریاتی قربت محض بربنائے مصلحت اور اخباری تجارت کی مجبوریوں کی وجہ سے رہی ہوگی۔ ایسے میں کہ جب ریاست میں کمیونسٹ حکومت اور مرکز میں کانگریسی حکومت ہو اس مخلوط سیاست سے فائدے ہی فائدے تھے۔ اس سیاسی مصلحت میں بظاہر کوئی قباحت نہیں معلوم ہوتی کیونکہ اخبارات کی پالیسیاں بہر حال سیاسی مصالح کے تابع ہوتی ہیں اگر ایسا نہ ہوتو کوئی اخبار بہت دور تک نہیں چل سکتا، جلد ہی ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے، ہاں اگر اس کی پشت پر بہت بڑا سرمایہ یا بہت بھاری بھرکم شخصیت ہوتو اور بات ہے۔ لیکن آزادی کے بعد جس دور کا ہم ذکر کررہے ہیں اس میں اردو اخباروں کی بساط ہی کیا تھی۔ بادِ مخالف کا ایک ہی جھونکا انھیں خس وخاشاک کی طرح اڑا لے جانے کے لیے کافی تھا اور درحقیقت ایسا ہی ہوا۔ ان حالات میں احمد سعید صاحب ’آزاد ہند‘ لے کر جس طرح چلے اس کے لیے ستائش کا لفظ ناکافی ہے۔ دراصل آزادی کے بعد کے تقریباً تین عشروں کو کلکتہ کی اردو صحافت کی تاریخ میں ’آزاد ہند‘ کا یا احمد سعید ملیح آبادی کا عہد کہنا بجا ہوگا۔ احمد سعید صاحب کے نظریات، ان کی اخباری پالیسیوں، مالکانہ رعونت سے اختلاف کے باوجود ان کی سخت کوشی اور محنت کی داد دینی پڑے گی۔ میں نے اس عہد کو تقریباً تین عشروں تک محدود کیوں رکھا جب کہ ’آزاد ہند‘ اور اس اخبار کی احمد سعید صاحب کی ادارت اور ملکیت اب بھی جاری ہے اس کا اندازہ آئندہ واقعات سے ہوجائے گا۔ اسے میں احمد سعید صاحب کی اتنی ساری خوبیوں کے باوجود بصیرت کی کمی پر محمول کروں گا۔ وہ اپنی صلاحیت کار اور کلکتہ سے دہلی تک اپنے اثر ورسوخ

سے جس قدر بنگال کے اردو قاری کو دے سکتے تھے اور جس حد تک ان کی رہنمائی کر سکتے تھے شاید کوئی اور اپنی دولت اور سیاسی مراتب کے باوجود نہیں کر سکتا تھا لیکن وہ ایسا نہیں کر سکے جبکہ اس راہ میں ان کے لیے کوئی مجبوری حائل نہ تھی، کم سے کم مجھے نظر نہ آئی۔ انھوں نے اپنی بہت ساری توانائی کارکن اخبار نویسوں سے محاذ آرائی اور ان کی کمر توڑنے پر صرف کردی جبکہ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اخبار نویسوں میں سے نہ ان کا کوئی دشمن تھا نہ آزاد ہند' کا بدخواہ۔ ابراہیم ہوشؔ اور 'آبشار' سے ان کی چشمک معاصرانہ اور کاروباری تھی اور کارکن اخبار نویسوں کے خلاف محاذ پر دونوں ایک صف میں تھے، یہ اور بات ہے کہ اس محاذ پر ابراہیم ہوشؔ اور سالکؔ لکھنوی خود کبھی نہیں نظر آئے بلکہ منیجر 'آبشار' معین الدین سامنے رہے جو سالکؔ صاحب کے سسرالی اقارب میں تھے چنانچہ اُس رند بلانوش کے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔ (گفتگو کا یہ سلسلہ آئندہ 'آزاد ہند' کے باب میں جاری رہے گا)۔

غلط بیانی سے انکار کی پاداش:

ہم اپنی بات کو ۱۹۵۰ء کے عشرے کے نصف تک لے جا سکے تھے کہ بات سے بات نکلتی گئی اور بہت آگے بڑھ گئی۔ گفتگو کے سرے کو پھر پریس کمیشن اور کارکن صحافیوں کے اجرتی بورڈ کی سفارشات سے جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں نے جب ایک ماہ کی باتنخواہ چھٹی کی درخواست پیش کی تھی تو اسی وقت خطرے کی گھنٹی بج گئی تھی، لیکن جب صابری صاحب کے مقدمہ میں میں نے کسی غلط بیانی سے انکار کر دیا تو میرے خلاف باضابطہ کارروائی شروع ہوگئی شام کو کبھی دوا لینے چلا گیا جو کہ زیادہ سے زیادہ دس منٹ کا وقفہ ہوتا تو اگلے دن نوٹس ملتی کہ آپ کام کے وقت میں غیر حاضر پائے گئے۔ ایک روز منیجر صاحب نے اپنے کمرے میں بلاکر ایک ہدایت نامے پر دستخط طلب کئے جس میں میرے وقت کا تعین صبح دس بجے سے ایک بجے تک اور رات کو نو بجے سے بارہ بجے تک کیا گیا تھا۔ میں نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ آپ بیک وقت ایک شفٹ میں کام لے سکتے ہیں، دن اور رات دونوں شفٹ میں کام نہیں لے سکتے۔ اس حکم نامے میں مصلحت یہ تھی کہ میں صبح کو دو گھنٹے یو ایس آئی ایس میں جو کام کر لیا

کرتا تھا نہ کرسکوں۔ اس کے بعد ایک حاضری رجسٹر پر روزانہ دستخط کرنا لازمی قرار دیا گیا۔ اس میں میرے نام کے سامنے ٹرانسلیٹر لکھا ہوا تھا۔ میں نے کہا کہ اخبار میں ٹرانسلیٹر نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی، میں نیوز ایڈیٹر ہوں، آپ یا تو نیوز ایڈیٹر لکھئے یا میرے نام کے سامنے پوزیشن کا خانہ نہ رکھئے، جو کہ حاضری رجسٹر میں یوں بھی غیر ضروری تھا۔ میں نے اس رجسٹر پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔

اگلے دن خان بہادر صاحب کے سکریٹریٹ میں میرا معاملہ زیرِ غور آیا اور حکم ہوا کہ مجھے نافرمانی اور کارکردگی میں خرابی وغیرہ جیسے الزامات کے ساتھ ایک نوٹس دیدی جائے۔ ظاہر ہے اس طرح کی دو ایک نوٹسوں کے بعد میری برطرفی کے لئے کافی جواز مل جاتا لیکن مجھے اس فرمان کا علم ہوگیا اور قبل اس کے کہ منیجر صاحب وکیل سے مشورہ کر کے، نوٹس کا مسودہ تیار کروا کر بذریعہ رجسٹری بھیجتے (جو کہ بھیجی گئی اور اسے لینے سے میں نے انکار کر دیا) میں نے خود ہی ایک مختصر سا احتجاج نامہ لکھ کر، ٹائپ کر کے منیجر صاحب کے سامنے پیش کر دیا اور اس کی موصولی کے دستخط لے لئے۔ اس میں مختصراً میں نے خان بہادر صاحب کو لکھا کہ ''اخبار کا مینجمنٹ مجھے ہراساں اور پریشان کر رہا ہے جس کی وجہ سے میری صحت پر برا اثر پڑ رہا ہے جو کہ ڈاکٹروں کے ہاں میری دوڑ اور علاج معالجے سے ظاہر ہے، مہربانی فرما کر انھیں اس سے باز رکھئے تا کہ میں یکسوئی کے ساتھ کام کرسکوں۔'' پھر تو جواب در جواب کا ایک سلسلہ چل پڑا۔ تب میں نے ایسوسی ایشن کی ایک میٹنگ میں اس معاملے کو پیش کیا۔ پھر انگریزی اخبارت کے دو سینئر جرنلسٹوں نے خان بہادر صاحب سے ملاقات کی اور کہا کہ اجرتی بورڈ کی سفارشات وغیرہ سے متعلق جو معاملات ہیں ان کو بہ سہولت طے کرلیں اور ساری زائد حرکتیں بند کریں۔ تب نوٹسوں کا سلسلہ رک گیا لیکن پریشان کئے جانے کی دوسری صورتیں جاری رہیں۔ اگر یہ سب کچھ میری ذات تک محدود رہتا تو اس کا ذکر یہاں بے معنی ہوتا لیکن فی الحال اردو اخباروں کی صنعت، اس کے کرتا دھرتا اور اسکی قسمت کے مالکوں کی ساری باتیں سامنے لانا مقصود ہے اس لیے ذاتی باتیں بھی ذاتی نہیں رہ جاتیں، انھیں اجتماعی معاملات اور مجموعی حالات کی روشنی

میں ہی دیکھنا ہوگا۔

میرے لیے کئی طرفہ مشکلیں تھیں۔ میں نے ایسوسی ایشن کے ذمہ داروں سے صاف کہہ دیا تھا کہ اردو اخبارات بہت چھوٹے ہیں، ان کی آمدنی اتنی نہیں ہے کہ وہ بورڈ کی سفارشات کے مطابق ورکروں کو اجرتیں دے سکیں اس لیے ان سفارشوں سے قطع نظر، ان سے کوئی معاملہ طے کرلیا جائے۔ جو بات میں سمجھ رہا تھا وہ زبان پر نہیں لاسکتا تھا کیونکہ ہمارے مالکان تو ہمارے خلاف تھے ہی اگر ہم اپنے ان اندیشوں کا اظہار کردیتے جو ہمیں نظر آرہے تھے تو ہمیں ایسوسی ایشن بھی دھتکار دیتا اور ہم کہیں کے نہ رہتے۔ وہ بات یہ تھی کہ بنگالی صحافیوں میں ایسے لوگ موجود تھے جن کے لیے اردو زبان یا اس زبان کے اخبار کا وجود ہی ناقابل برداشت تھا۔ اجرتی بورڈ کی سفارشات کی آڑ میں تخریب کے لیے ایک بڑا حیلہ ان کے ہاتھ آ گیا تھا۔ اسی لیے میں چاہتا تھا کہ سارے معاملے کو قانونی اڑچنوں میں الجھانے کے بجائے اس سے ہٹ کر کوئی تصفیہ کرلیا جائے۔ بات یوں تھی کہ جو اخبارات سرکاری اشتہارات اور نیوز پرنٹ کا کوٹا حاصل کرنے کے لیے اپنی اشاعت بڑھا چڑھا کر بیان کرتے آئے تھے وہ اس سے انکار کس طرح کرسکتے تھے چنانچہ کلہاڑی ان کی جڑوں پر لگنے والی تھی۔ صرف ایک ظفیر صاحب نے 'عصرِ جدید' کو اس قدر نقصان پہنچایا کہ کسی کو اس کا علم ہونا تو درکنار اس کا گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ 'عصرِ جدید' کے منتظمین اس نکتے کو نہیں سمجھ سکے کہ مالی خسارہ تو برداشت کیا جاسکتا ہے لیکن عزتِ نفس پر آنچ آتی ہے تو کسی بھی شریف آدمی کے لیے اسے برداشت کرنا مشکل ہوتا ہے۔ چنانچہ 'عصرِ جدید' میں اور لوگوں کی طرح ظفیر صاحب کے ساتھ بھی جو بدسلوکی کی گئی اسے انھوں نے فراموش نہ کیا۔ اور جب وہ مغربی بنگال کے انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میں لے لیے گئے تو سب سے پہلے انھوں نے 'عصرِ جدید' کے لیے ریاستی حکومت کے اشتہارات بند کروا دیئے، پھر شاید ریاستی حکومت کی پالیسی کے مطابق مرکزی حکومت کے اشتہارات بھی مثلاً ریلوے کی ٹنڈر نوٹس وغیرہ بند ہوگئیں۔ کلکتہ کارپوریشن کے اشتہارات بند تو نہیں ہوئے جس کے اسباب درون پردہ تھے لیکن متاثر ضرور ہوئے یعنی ایک کالم کا میٹر ۳۶ کالم میں جو لکھا جاتا

تھا (جس کی مثالیں فائلوں میں موجود ہیں) ان پر قدغن لگی اور انھیں اعتدال کی حدوں میں لایا گیا۔ وغیرہ وغیرہ

تصادم کی راہ:

جب اخبار مالکوں سے کوئی گفتگو آگے نہ بڑھ سکی تو انڈین جرنلسٹس ایسوسی ایشن ویسٹ بنگال نے ٹریڈ یونین کی راہ اختیار کی یعنی وہ لیبر کورٹ وغیرہ میں جانے کی تیاری کرنے لگے لیکن اس راہ میں مشکل یہ درپیش تھی کہ کسی ادارے کو صنعتی یونٹ قرار دینے کے لیے وہاں ملازموں کی جس کم سے کم تعداد کا ہونا ضروری تھا وہ کہیں نہیں تھی۔ 'آزاد ہند' میں احمد سعید صاحب ایڈیٹر اور مالک تھے اور خود کو اخبار کا واحد ورکر کہتے تھے جو کہ کسی کے لیے بھی قابلِ یقین بات نہ تھی۔ 'عصرِ جدید' میں مختلف حضرات اسی اثناء میں ایڈیٹوریل لکھتے رہے جیسے کہ شہاب لکھنوی، اقبال اکرامی، ناظر الحسینی۔ یہ سب لوگ اخبار مالک کے آدمی سمجھے جاتے تھے، ان کا ایسوسی ایشن سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ 'روزانہ ہند' میں غلام سرور فگار کا چل چلاؤ تھا پھر وہ اچانک صحافت کے منظر سے غائب ہوگئے اور رئیس الدین فریدی ایڈیٹر ہوئے۔ ظاہر ہے انھیں بھی ایسوسی ایشن سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ خود بہت جفاکش تھے اور دو ایک جز وقتی کارکنوں کی مدد سے کام چلا رہے تھے۔ ان میں سے ایک شمس صاحب تھے جو ادھیڑ عمر کے آدمی تھے ہمیشہ 'روزانہ ہند' میں رات کو ترجمے کا کام کرتے رہے میرے ہی محلے میں رہتے تھے لیکن ان کے بارے میں کبھی یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ اس کے علاوہ دن میں وہ کیا کرتے تھے۔ ان کا تذکرہ بھی کبھی کسی محفل میں نہیں سنا گیا، یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ 'روزانہ ہند' میں کب سے کب تک رہے۔

'عصرِ جدید' میں میں اخبار کو پورا وقت دے رہا تھا اور سارے کام کر رہا تھا۔ رات کو آخری شفٹ کا کام برسہا برس کرتا رہا لیکن اس سے آمدنی اتنی کم تھی کہ گزارے کے لیے بالکل ہی ناکافی تھی۔ ایسے میں دن میں دوپہر سے پہلے جو کام ملا، کرتا رہا۔ دو تین ٹیوشن کرتا پھر جب یو ایس آئی ایس میں ترجمہ کا کام مل گیا وہ بھی اس طور پر کہ جس قدر ترجمہ ہوگا اس کا معاوضہ شرحِ معین کے مطابق مل جائے گا جو کہ ابتدائی برسوں میں بہت کم تھا، دو تین سو روپیہ ماہانہ تھا تاہم

'عصرِ جدید' کی تنخواہ سے زیادہ تھا۔ بہت آگے چل کر اسی ترجمے کے معاوضے کی شرح بڑھ گئی تو زیادہ پیسے ملنے لگے لیکن کام کے اوقات کم وبیش وہی رہے۔ اسی کام کی بنا پر 'عصرِ جدید' کے منتظمین نے مجھے اخبار کا جز وقتی ملازم ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اتنا ہی نہیں یو ایس آئی ایس کے ڈائریکٹر کو 'کانفی ڈنشل' خطوط لکھے جن کا مقصد وہاں سے میرا پتہ کاٹنا تھا لیکن ان کنوئیں کے مینڈکوں کو پتہ نہ تھا کہ دنیا بہت آگے جا چکی ہے۔ یہ عالمی سطح پر کام کرنے والے ادارے آدمیوں کو خوب ٹھونک ٹھٹھا کر رکھتے ہیں پھر ان پر پورا اعتماد کرتے ہیں۔ چنانچہ ڈائریکٹر کو جو تحریریں موصول ہوتیں وہ مجھے دکھائی جاتیں اور اصل صورتِ حال معلوم کرنے کے بعد جو جواب لکھا جاتا وہ بھی مجھے دکھا دیا جاتا۔

یہاں بے اعتمادی کا یہ عالم کہ ہم کسی طرح اخبار کے مستقل کارکن نہ ثابت ہوسکیں۔ چنانچہ ۱۹۶۲ء کی ہند چین جنگ کے زمانے میں، ۱۹۶۴ء کے بھیانک فسادات کے دوران، ۱۹۶۵ء کی ہند پاک جنگ کے دوران جب شہر میں کرفیو لگ جاتا تو ہمارے لیے کرفیو پاس بھی نہ بنوائے جاتے جس کے بغیر ہم رات کو کام ختم کر کے گھر نہیں جاسکتے تھے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ کرفیو پاس کو ملازمت کے پکے ثبوت کے طور پر پیش کیا جاسکتا تھا اس لیے نہ دیا گیا حالانکہ مقامی تھانے کی طرف سے اس کی اجازت تھی، چنانچہ جاڑے کی راتوں میں ایک بستر بند میں لپیٹ کر اپنا بستر 'عصرِ جدید' کے دفتر ہی میں رکھ دیا تھا۔ ہند پاک جنگ کے زمانے میں ایک عرصے تک شہر میں رات کو مکمل بلیک آؤٹ رہتا۔ اگر کسی کھڑکی سے موم بتی کی جھلک بھی دکھائی دیتی تو محلے کے لڑکے پتھر مار کر کھڑکی کے شیشے توڑ دیتے چنانچہ اس زمانے میں رات کو راستہ صرف ٹوٹو کر چل سکتے تھے۔

ایسے میں ایک مرحوم دوست کا تذکرہ نہ کرنا انتہائی ناسپاسی ہوگی۔ ڈاکٹر عبدالمنان مرحوم ہمارے بڑے مخلص اور مہربان دوست تھے۔ 'عصرِ جدید' کی عمارت کی چوتھی منزل پر رہنے والے کرایہ داروں میں سے ایک وہ بھی تھے، وہ ان اندھی راتوں میں ڈیڑھ بجے ایک ڈنڈا لیے ہوئے 'عصرِ جدید' کے گیٹ پر کھڑے رہتے اور جب میں کام ختم کر کے نکلتا تو مجھے گھر تک

پہنچا کر، جو کچھ دور پھل منڈی میں تھا، واپس جاتے۔ جوانی میں قوتِ عمل زیادہ ہوتی ہے اس لیے شدت پسند آدمی ہر راہ میں تیزی اور شدت اختیار کرتا ہے۔ جب وہ عبادت گزاری پر آئے تو تہجد کے وقت مسجد ناخدا کی چھت پر چلے جاتے اور صبح تک اذکار و عبادات میں مصروف رہتے۔ رمضان شریف کا مہینہ دیوبند میں اپنے پیرومرشد کی خدمت میں گزارتے۔ غالباً عبادت گزاری کی یہی کثرت اور شدت ان کے دورۂ قلب کا موجب ہوئی۔ عین عالمِ شباب میں بیوہ اور دو یتیم بچے چھوڑ کر عالمِ فانی سے رخصت ہوئے۔ یہ ۱۹۶۹ء کی بات ہے غالباً اس کے بعد ہی میری شدید علالت میں اس سانحہ کو بھی بڑا دخل تھا۔

کام کے معاملے میں میرا ایک اصول تھا یعنی پکی دیانت داری سے کام کرنا اور چھپا کر کچھ نہ کرنا اس لیے کسی خفیہ کاری میں نہ کبھی ملوث ہوا نہ میری گرفت کی گئی۔ انڈین جرنلسٹس ایسوسی ایشن کے ممبروں میں پکے کمیونسٹ بھی تھے لیکن ان پر یہ بات واضح تھی کہ میں امریکن انفارمیشن سروس میں کام کرتا ہوں، وہ ہماری اقتصادی مجبوری تھی۔ اگر ہمارا اخبار ہمیں باعزت طور پر جینے کا حق دیتا تو ہم کیوں مارے مارے پھرتے۔ خود احمد سعید صاحب اس بات کے شاہد ہیں کہ 'عصرِ جدید' میں میرے اٹھارہ برس قیام کے دوران انھوں نے کئی بار مجھے 'آزاد ہند' میں آجانے کا پیغام دیا لیکن ان سے دوستانہ تعلقات کے باوجود میں نے گریز کیا اور 'عصرِ جدید' میں بھی کبھی کسی پر اس کا اظہار نہیں کیا۔ جب 'عصرِ جدید' کے دروازے مجھ پر بند کر دیے گئے تو بھی میں کسی اور اخبار میں کام کرنے کے لیے تیار نہ تھا مگر احمد سعید صاحب جانتے ہیں کہ کتنے اصرار کے بعد میں اس شریفانہ خیال کے ساتھ 'آزاد ہند' میں گیا کہ دوستوں کی بات زیادہ دیر تک ٹالی نہیں جا سکتی۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود انھیں میرے بارے میں جو غلط فہمیاں ہوئیں اس پر مجھے اس وقت بھی حیرت تھی اور ہے۔

اب پھر اصل معاملے کی طرف لوٹتے ہیں جس کی بات آگے بڑھنے سے پہلے حقائق اور واقعات کی بھول بھلیاں میں گم ہو جاتی ہے۔ جب یہ معلوم ہو گیا کہ اردو اخباروں میں کارکن صحافیوں کی تعداد اتنی ہے ہی نہیں کہ ان کا کیس آگے بڑھایا جائے تو سوال پیدا ہوا کہ ان

کی تعداد قابلِ ذکر کیسے بنائی جائے۔ پروف ریڈر کو ورکنگ جرنلسٹ تسلیم کر لیا گیا تھا لیکن یہاں تو ان کی تعداد بھی صفر کے برابر تھی اس کے باوجود ہمارے اخباروں میں معدودے چند غلطیوں کا ہونا ایک معجزے سے کم نہ تھا۔ اقبال اکرامی صاحب 'آزاد ہند' میں پروف ریڈر تھے وہ 'امروز' میں آ گئے۔ 'عصرِ جدید' میں اقبال سلیم پوری کچھ عرصے تک پروف ریڈر رہے۔ ساٹھ روپے ماہوار پر روز دو بجے رات تک کام کرتے رہے اور کاتبوں سے نوک جھونک بھی ان کی کارگزاری میں شامل تھی اس لیے کہ وہ کبھی کبھی صحیح کو بھی غلط قرار دیتے۔ بالآخر وہی ہوا جو ہونا تھا اور پہلے بھی ہو چکا تھا یعنی ٹی بی کا مرض لاحق ہو گیا۔ انھوں نے روٹھ کر اس دنیا سے منہ موڑ لیا۔ سید ہونے کی وجہ سے انھیں اپنی نسبی برتری کا شدید احساس تھا اور اسی وجہ سے انتہائی مجبوری کی حالت میں بھی دستِ سوال دراز کرنا تو دور رہا کسی اعانت کو بھی وہ اہانت تصور کرتے چنانچہ اس خودداری کی تمازت سے ان کا وجود پگھلتے پگھلتے معدوم ہو گیا۔

اس سے پہلے ہم 'عصرِ جدید' کے ہیڈ کاتب حسن صاحب کا انجام دیکھ چکے تھے۔ وہ ابھی جوانی کی حدوں میں تھے غالباً دو بچے تھے۔ وہ دن میں دو بجے کے قریب آ کر 'عصرِ جدید' کے تخت پر بیٹھتے تو رات کو دو بجے کے بعد ہی گھر جاتے۔ نو دس بجے کے قریب کچھ دیر کے لیے کھانا کھانے کے لیے جایا کرتے تھے۔ وہ لڑکپن میں اپنے ماموں کے ساتھ رنگون میں تھے۔ جب دوسری عالمی جنگ برما میں داخل ہو گئی اور جاپانی فوجیں ہندوستان کے دروازے پر دستک دینے لگیں تو رنگون اور برما کے دوسرے علاقوں میں ہندوستانیوں کے جتھے خوفناک استوائی جنگلوں سے پیدل گزر کر بنگال کی سرحدوں میں داخل ہونے لگے۔ بیشتر لوگ اس ہفت خواں میں مرکھپ جاتے یا جنگلی جانوروں کا لقمۂ تر بن جاتے۔ ایسے ہی ایک قافلے میں حسن صاحب اور ان کے ماموں بھی آ گئے۔ ایک عرصے تک اپنے وطن اعظم گڑھ میں وقت گزاری کے بعد وہ ۵۰ء کے عشرے کے اوائل میں ہی کسی وقت 'عصرِ جدید' میں آ گئے اور کتابت کرنے لگے۔ وہ شخص جو جنگ کی آنچ سے بچ کر، جنگلوں سے پیدل گزر کر وطن واپس آ گیا تھا اس نے 'عصرِ جدید' کے دفتر میں خون تھوک تھوک کر داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس انجام کو پہنچنے سے کچھ پہلے ان

کی تنخواہ وغیرہ کا حساب کر کے جو پیسے انھیں دے دیے گئے تھے وہ ان کو الوداعی سفر میں کام آئے۔ ان کے سوکھے ہونٹوں پر جمی ہوئی پپڑی والا چہرہ یادوں کے کسی صفحے پر اپنے نقوش اس طرح مرتسم کر گیا ہے کہ نصف صدی گزر جانے پر بھی نہیں مٹتے۔ میں کیا کروں!

کاتبوں کی ممبر سازی:

خیر! طے پایا کہ کاتبوں کو بھی سب ایڈیٹر ثابت کیا جائے۔ اصولی بات یہ تھی کہ جب پروف ریڈر نہیں ہیں تو پروف کون پڑھتا ہے۔ اس کا جواب تھا ''کاتب'' گویا کاتب پروف ریڈر بھی تھے اور اتنی لیاقت رکھتے تھے کہ اخبار نویسوں کی تحریروں میں غلطیوں کی نشاندہی اور اصلاح کر سکیں۔ سوان کو بھی اخبار نویس تسلیم کر لیا جانا چاہیے۔ لیبر کورٹ یا کمیشن نے اس دلیل کو تسلیم کر لیا۔ بس اس کا اعلان ہوتے ہی کاتبوں نے ایسوسی ایشن کا رخ کیا اور دھڑا دھڑ ممبر بننے لگے۔ ان کے جن مطالبات پر کبھی کان نہ دھرا گیا تھا ان میں زور پیدا ہونے کے امکانات نمایاں ہو گئے۔ دیکھتے دیکھتے کلکتہ میں اردو کارکن صحافیوں کی گنتی بڑھ گئی۔ جیسا کہ عام طور سے ہوتا ہے تحریکوں کے شروع ہو جانے کے بعد وہ کسی منطقی یا غیر منطقی انجام تک جاری رہتی ہیں اور اس اثناء میں وقت اور حالات کے مطابق ان میں اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں۔ چنانچہ کاتبوں کی تحریک بھی جاری رہی۔

اس سلسلے میں خود اپنا نظریہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ مجھے اردو اخباروں کی کم مائیگی اور ان کی کمزور مالی حیثیت کا علم اور احساس بھی تھا۔ انہیں فلمی اشتہارات تو مل جاتے تھے، کارپوریشن کے اشتہارات بھی مل جاتے تھے لیکن ان کے علاوہ سرکاری اشتہارات بالکل برائے نام اور ٹنڈر وغیرہ کے کبھی کبھار اعلانات تک محدود تھے۔ مسلمانوں کی بڑی صنعتیں نہیں تھیں جو کافی اشتہارات دیتیں۔ ہمدرد اور بعض چھوٹے چھوٹے مقامی دواخانوں کے اشتہارات عموماً ملا کرتے تھے۔ بعض کارخانے جو عید، بقرعید یا کسی اور خاص موقع پر اردو اخباروں کو اشتہارات دیا کرتے تھے ان کی تعداد ہر فساد کے بعد کم ہو جاتی۔ اس سلسلے میں ایک نمایاں مثال نیو انڈیا ربر ورکس کی ہے جو ربر کے جوتے چپل بنانے والی بہت بڑی فیکٹری تھی۔ شہر کلکتہ کے مشرقی

کنارے پر واقع تھی۔ ۱۹۶۴ء کے فسادات میں اس کو جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔ اس زمانے میں فسادات منصوبہ بند طریقے سے ہو رہے تھے جن کا مقصد مسلمانوں کی معمولی اقتصادی طاقت کو بھی پامال کرنا تھا۔ چنانچہ جبل پور میں بیڑی کی صنعت، بھیونڈی اور بعض دیگر مقامات پر ہینڈلوم کی صنعت کو تہس نہس کر دیا گیا۔ ان تباہ کاریوں کا شکار ہونے والے مسلمانوں کی امداد اور بحالی کا ایک بڑا اور مسلسل کام تھا اس میں ہمارے اخبارات حسبِ توفیق تعاون کر رہے تھے۔ ان فسادات کی وجہ سے اقتصادی پامالی کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی تھا کہ مسلمان کسی کاروبار میں سرمایہ لگانے سے عاری تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ کب اس سارے کئے دھرے پر پانی پھر جائے گا یا کب وہ ترکِ وطن یا ہجرت کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ ہر بڑے فساد کے بعد ہجرت کا ایک ریلا تو چلتا ہی تھا۔ بنگلہ دیش کی جنگ آزادی اور اس ملک کی تشکیل کا ایک مثبت نتیجہ یہ نکلا کہ بنگال میں خطِ تقسیم کے مغرب میں تمام مسلمانوں کو یقین ہو گیا کہ اب فرار کے سارے راستے بند ہو گئے ہیں اس لیے جو کچھ پونجی ہے اس کو یہیں کام سے لگانا ہے اور خرچ کرنا ہے۔

تحریک کے نشیب و فراز:

کارکن اردو صحافیوں کی کارکردگی اور اجرتوں سے متعلق قوانین وضوابط پر عمل درآمد کے لیے تحریک دراصل کاتبوں کی تحریک بن گئی۔ ان کی ایک نجی انجمن پہلے سے موجود تھی جو کاتبوں کی اجرت وغیرہ کے متعلق بے چینی کا اظہار کرتی تھی لیکن اس کی سنوائی کہیں نہیں ہوتی تھی، ان لوگوں کے لیے یہ ایک موقع ہاتھ آ گیا کہ وہ اپنی کارروائیاں جرنلسٹس ایسوسی ایشن کی رہنمائی میں جاری رکھیں۔ لیکن ملکی اور قومی زندگی میں ایسے حالات رونما ہوتے رہے جب یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی رہی کہ ''منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک'' جب کوئی بڑا فساد ہوا یا جنگ ہوئی تو کچھ عرصے کے لیے من وتو کا امتیاز ختم ہو جاتا اور معاملات کے کسی سرے کو پھر سے پکڑنا ہوتا۔

ایسا ہی ایک موقع ۱۹۶۲ء کی ہند چین جنگ کے زمانے میں آیا جب غیر متوقع طور پر بیشمار ممتاز اور متمول مسلمانوں کو راتوں رات گرفتار کر لیا گیا۔ یہ گرفتاریاں بالکل بلا سبب تھیں اور

مسلمانوں کے لیے بڑا جھٹکا تھا، ان مسلمانوں کے لیے بھی جو نیشنلسٹ کہلاتے تھے۔ اس کے بعد اگلے برس ۱۹۶۳ء میں میں شدید ذاتی صدمات سے گزرا، ابھی ہم لوگ اس صدمے کے اثرات سے پوری طرح جانبر بھی نہ ہونے پائے تھے کہ فروری ۱۹۶۴ء میں کلکتہ اور مشرقی ہند کے کئی بڑے کاروباری اور صنعتی شہروں اور کارخانوں کے علاقوں میں زبردست فرقہ وارانہ فسادات ہوئے جنھوں نے مسلمانوں کی جڑیں ہلا کر رکھ دیں۔ پھر اگلے ہی برس ۱۹۶۵ء میں ہندوستان اور پاکستان کی جنگ شروع ہوگئی۔ اس جنگ کی پہلی خبر جب آئی تو میں چھٹی پر گھر گیا ہوا تھا فوراً اس خیال سے واپس آیا کہ اخبار میں کام بڑھ گیا ہوگا۔ ایک رات اچانک مسلمانوں کی بڑے پیمانے پر گرفتاری کا دوسرا حادثہ وقوع پذیر ہوا، اس بار کافی اخبار نویس بھی گرفتار کیے گئے۔ اگلے دن صبح کو میں حسبِ معمول یو ایس آئی ایس میں کام پر گیا، کچھ دیر بعد ہی 'عصرِ جدید' میں ہمارے رفیق کار نیاز اعظمی اور ایک نوجوان کاتب فیض وہاں پہنچے اور ان گرفتاریوں کی اطلاع دی، ہمارے یہاں سے مولانا عطاء الرحمٰن، منیجر قاضی اقبال احمد، اقبال اکرامی، شہاب لکھنوی اور دوسرے اخباروں سے بھی کئی لوگ گرفتار ہوگئے۔ ہمارے ان دونوں بہی خواہوں نے مشورہ دیا کہ میں کہیں کھسک جاؤں۔ کچھ توقف کے بعد میں نے ان سے کہا کہ آپ لوگ فوراً یہاں سے چلے جائیں۔ اس کے بعد میں اٹھا اور گھر جا کر اپنی فیملی کا سامان پیک کیا۔ اپنے بہنوئی شاہ محمد امین الدین صاحب سے گزارش کی کہ انھیں گھر پہنچا دیں۔ دراصل ان کو بھی اسی بہانے کھسکانا مقصد تھا، دوسرے یہ کہ معلوم نہیں جنگ کا کیا نقشہ بنے میں اندر رہوں یا باہر کم سے کم بچوں کی فکر سے تو آزاد رہوں گا۔ چنانچہ اسی شام سب کو گھر بھیج کر میں تنہا رہ گیا۔ اللہ نے فضل کیا، جنگ جلد ہی ختم ہوگئی، مجھ پر کوئی آنچ نہ آئی لیکن ذہنی طور پر ہم بالکل پامال ہو گئے تھے۔ کچھ دنوں بعد نظر بندوں کی رہائی بھی ہوگئی، لیکن بہت دنوں تک عام حالات ایسے نہ تھے کہ کسی تنازعہ یا تحریک کو تازہ کیا جاتا۔ لیکن چنگاریاں دبی دبی سلگتی رہیں۔

جیل سے چھوٹنے کے بعد شہاب لکھنوی پر 'عصرِ جدید' کے دروازے بند ہوگئے پھر وہ کلکتہ کے شاعروں کی بھیڑ میں کہیں گم ہوگئے۔ وہ چار سال کلکتہ کارپوریشن کے کونسلر بھی رہ چکے

تھے، اس اثناء میں انھوں نے اور بھی کام دھندوں کے گر سیکھ لیے ہوں گے۔ان کی جگہ ناظر الحسینی 'عصرِ جدید' میں آ گئے، جو ہر لحاظ اور اعتبار سے شہاب صاحب کے جانشین تھے۔ ریاست میں عام انتخابات کی فضا بن رہی تھی جو ۱۹۶۷ء میں ہونے والے تھے۔ کانگریس پارٹی کی حکومت تھی اربابِ اقتدار کو امید تھی کہ گزشتہ برسوں کی مار دھاڑ اور پکڑ دھکڑ کے بعد مسلمان اتنا خائف ہوگا اور اس کے حوصلے اتنے پست ہوں گے کہ وہ سر جھکائے ہوئے پارٹی کی تائید و حمایت کرے گا لیکن ایسا ہوا نہیں۔ مسلم ووٹروں نے اسے مسترد کر دیا اور اس کا سیاسی بن باس تیس برس سے جاری ہے۔

وہ پہلا موقع تھا کہ جب اردو پریس کو یہ احساس ہوا کہ برسرِ اقتدار پارٹی کی مخالفت کی جا سکتی ہے۔ اس کو شکست دی جا سکتی ہے لیکن اس کے بعد جلد ہی دو بڑے اہم اور نازک مواقع ایسے آئے جب مسلم پریس کو شدید جھٹکے لگے۔ ایک تو بنگلہ دیش کی تحریک کے دوران ہند پاک جنگ اور دوسرے ایمرجنسی کا زمانہ مگر طولانی تذکروں سے پہلے بعض مختصر وارداتوں کا ذکر۔ ۱۹۶۷ء کے عام انتخابات کے زمانے میں 'عصرِ جدید' میں آدمی کم تھے اور مجھ پر کام کا دباؤ تھا۔ جس روز لوک سبھا اور ریاستی اسمبلیوں کے نتائج آنے لگے میں دن کا کھانا کھانے کے بعد آ کر نیوز ڈسک پر بیٹھا تو بیٹھا رہ گیا۔ رات کو ۹ بجنے والے تھے اور اس وقت بدر عالم نظامی آنے والے تھے میں بخار اور کمزوری کی حالت میں پسینے سے ڈوبا جا رہا تھا۔ بالآخر وسیم صاحب کو فون کیا اور اپنی کیفیت بتائی وہ اسی وقت بھاگے ہوئے آئے اور آستین چڑھا کر بیٹھ گئے اور مجھ سے کہا کہ آپ جائیے میں دیکھ لوں گا۔ اگلے دن کا 'عصرِ جدید' ان کی کاوشوں سے نکلا۔ انھوں نے دست گیری اور دوستی کا حق ادا کر دیا لیکن 'عصرِ جدید' کے انتظامیہ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ۱۹۶۹ء کی جنوری میں ہی ڈاکٹر منان جیسا ہمدرد دوست، جن کا ذکر کر چکا ہوں، رحلت کر گیا۔ یہ سانحہ میرے لیے ہلاکت خیز تھا۔ میری صحت کی کیفیت پہلے ہی سے خراب ہو رہی تھی وہ اور بگڑ گئی۔ مارچ میں والد صاحب کے سایہ مہر و عاطفت سے محروم ہو گیا۔ میری علالت کے ان تمام اسباب کے باوجود ایک بات یہ تھی کہ 'عصرِ جدید' کے دفتر میں جا کر میری حالت زیادہ خراب

ہو جاتی چنانچہ میں نے رخصت لے لی اور گھر چلا گیا۔ کوئی دو مہینے میں خود کو کافی بہتر محسوس کرنے لگا۔ حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ 'عصرِ جدید' میں میرے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا تھا وہ کسی شخص کو بھی نفسیاتی مریض بنانے کے لیے کافی تھا، دوسرے وہ بند گوشے میں واقع کمرہ جس میں تازہ ہوا کا گزر نہ تھا رات کو کام کی شدت کے اوقات میں دس بارہ آدمی اس میں موجود ہوتے اور بیڑی سگریٹ بھی پھونکتے رہتے یہ کیفیت نہایت مہلک تھی۔ اس میں اٹھارہ برس تک سانس لے کر زندہ رہنا ہی بڑی سخت جانی تھی۔ بہرحال جب میں گھر سے واپس آیا تو 'عصرِ جدید' کے دروازے مجھ پر بند ہو کر دیے گئے۔ میں اخبار کے علاوہ کوئی اور کام سوچ رہا تھا کہ احمد سعید صاحب نے مجھے اچک لیا۔ موازنے کی خاطر ایک بات اور کہنا چاہوں گا کہ وہ یہ کہ دو مہینے جو میں گھر پر رہ گیا اس اثناء میں یو ایس آئی ایس میں ہمارے پریس چیف ڈھارس بندھانے کے لیے وہاں سے مجھے خط لکھتے رہے کہ اپنی صحت کا خیال رکھنا کام کی فکر نہ کرنا، یہاں تمہارا کام محفوظ ہے جبکہ میں اس دفتر میں یومیہ اجرت پر کام کرنے والا ایک ورکر تھا، جبکہ ہمارے ہم مذہبوں نے، دنیا بھر میں اخلاقیات کے دعویداروں نے، یہ کیا کہ جب ان کی دعائیں نامقبول ہونے پر میں زندہ واپس آ گیا تو انھوں نے دروازے بند کر لیے۔

قیامِ 'عصرِ جدید' پر ایک نظر:

'عصرِ جدید' کا باب ختم کرنے سے پہلے کئی باتوں کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اول تو یہی کہ میں نے 'عصرِ جدید' میں ترجمے سے کام کا آغاز کیا اور آخر تک یعنی اگلے اٹھارہ برس تک وہاں میرا اصل کام وہی رہا اس میں نیوز ایڈیٹنگ کا اضافہ ضرور ہوا جس کی اضافی اجرت پچاس روپیہ ماہانہ معین تھی جب زیرِ عتاب آیا یہ رقم کم کر دی گئی۔ جب کسی میٹنگ یا جلسے وغیرہ میں شرکت کرتا تو اس کی رپورٹ بھی تیار کر دیتا۔ مزید براں کچھ مضامین اپنی طبیعت اور مرضی سے بھی لکھا کرتا جس پر کوئی پابندی نہ تھی نہ ان مضامین کی اشاعت کے لیے کسی سے اجازت لینے کی ضرورت تھی بس اتنی احتیاط شرط تھی کہ خان بہادر صاحب کے معروف سیاسی نظریات اور مذہبی عقائد کے خلاف کوئی بات نہ ہو چنانچہ کبھی سنجیدہ مضامین اور کبھی انشائیہ لکھا کرتا۔ اس سلسلے

میں کبھی اپنے نام کو مخفی بھی رکھنا چاہتا کیونکہ کوئی غیر معیاری چیز اپنے نام سے منسوب نہیں کرنا چاہتا تھا۔اسی ضرورت کے تحت ایک قلمی نام ''علمی'' اختیار کرلیا تھا جو وقتاً فوقتاً تخلص کے کام بھی آنے لگا (بعد میں بلکہ بہت بعد میں میں نے اس نام یا تخلص کو ترک کردیا)۔کبھی کبھی کتابوں پر تبصرے بھی لکھے۔

ان تحریروں کے علاوہ ایک کام یہ بھی کرتا تھا کہ ہر سال کے اختتام پر اس سال کے اہم قومی اور بین الاقوامی واقعات کو تاریخ وار مرتب کر کے دو قسطوں میں شائع کرتا ایک قسط ملکی امور پر اور دوسری قسط عالمی امور پر۔اس کو لکھنے میں کافی وقت اور محنت تو صرف ہوتی ہی تھی لیکن یہ ایسا کام تھا جس کے لیے سال بھر پیشے سے میری عملی وابستگی اور حاضری ضروری تھی اس کے لیے میں خاصی کاوش کرتا تھا۔روزانہ رات کو کام ختم کرنے کے بعد ایک کاپی میں جو میری میز کی دراز میں رکھی رہتی، اس روز کے قابلِ ذکر واقعات درج کرتا اور اگر کوئی خاص تراشہ ہوتا تو اس کو بھی کاٹ کر کسی کاغذ پر چسپاں کر کے محفوظ کر لیتا۔آخر سال کے قریب انہی اجزاء کو مرتب کرتا۔ان تراشوں کے کئی پلندے اکٹھا ہو گئے تھے جن میں سے بعض چیزیں آج واقعی نایاب معلوم ہوتی ہیں لیکن وہ سب کسی نہ کسی طور، کچھ میرے قیام کلکتہ کے دوران ہی اور کچھ میرے دہلی چلے آنے کے بعد، ضائع ہوگئیں۔اس تراش خراش کا کام میں رات کو اخبار کا کام ختم کرنے کے بعد ہی کیا کرتا تھا۔اس کے علاوہ بھی جو کچھ نثر یا نظم لکھی وہ اکثر و بیشتر رات کو پریس سے گھر آنے کے بعد ہی لکھی کیونکہ دن میں نہ فرصت تھی نہ اتنا سکون ۔لیکن افسوس کہ سب محنت ناقدروں کے درمیان رائیگاں گئی۔

اس تمام اثناء میں سال ڈیڑھ سال کا وہ وقفہ جو چٹر جی کے ساتھ گزرا کام کے اعتبار سے عظیم الشان تھا۔رات کو گھڑی کی سوئی ۹ پر پہنچی نہیں کہ ہم دونوں کام کی میز پر جم جاتے ساری دنیا کی خبریں ہمارے سامنے ہوتیں اور ہم دنیا و ما فیہا سے بے خبر۔۱۲/ بجتے بجتے ہم لوگ سارے کام کو دھن پھٹک کر رکھ دیتے۔اس کے بعد ایک عرصہ ایسا آیا کہ میرے ساتھ فاتح فرخ اورظفیر الحسن ہوتے اس زمانے میں رات کا کام ایک ایسی پر کیف تفریح تھا کہ شام ہی سے اس

کا انتظار رہتا۔ فاتح فرخ کے لچھے دار قہقہے اور ظفیر صاحب کے ٹھٹھے باہر تک سنائی دیتے اس کا نقطۂ عروج اس وقت آتا جب شہزاد منظر اپنی اسپورٹس رپورٹ لے کر داخل ہوتے، ایک عرصے تک صابری صاحب اس شفٹ میں میرے شریک رہے۔

'عصرِ جدید' میں میرے لیے بعض تفریحات تو تھیں لیکن وہ اتنی آسانی سے دستیاب تھیں کہ تفریح کے لیے کسب کے لطف سے خالی تھیں۔ ایک تو وہی پریس ٹور، دوسرے سنیما اور اس قبیل کے پروگرام۔ ہر فلم کے عوامی شو سے پہلے ایک خصوصی شو اخبار نویسوں کے لیے ہوا کرتا تھا اس میں عموماً 'عصرِ جدید' کے پاس پر میں اور صابری صاحب جایا کرتے تھے۔ اگر فاضل پاس آ گئے تو اور لوگ بھی چلے جاتے اس کے بعد فلم ریویو مجھے یا صابری صاحب کو لکھنا ہوتا تھا لیکن شہاب صاحب کی صورت میں ایک اچھا متبادل دریافت ہو جانے کے بعد، وہ بھی ایسے میں کہ جب مجھ پر نظرِ عنایت نہیں رہ گئی تھی، مجھے اس سعادت سے محروم کر دیا گیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اپنے معاملات میں کچھ مصروف اور کچھ الجھا ہوا ایسا تھا کہ ان تفریحات میں میرے لیے کوئی کشش نہیں رہ گئی تھی۔ دو تین برس تو اپنے خول میں ایسے مگن تھے کہ باہر دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کرتے تھے پھر ۱۹۶۳ء کی جنوری میں بھائی امان اللہ کے انتقال کے ساتھ غموں کا بھی نقطۂ عروج آیا اس کے بعد ہمارے گھر میں ریڈیو نام کی کوئی چیز نہیں رہی۔ میں نے اس سانحہ کے بارہ تیرہ برس بعد دہلی میں اتفاقی طور پر پہلی فلم دیکھی اور میرے دوسرے بھائی مطیع اللہ نے آج تک کوئی فلم نہیں دیکھی۔

واقعی جسے تفریح کہتے ہیں اس طرح کی کوئی چیز میری زندگی میں تھی ہی نہیں۔ ذمہ داری اور احساسِ ذمہ داری اور مصروفیات نے اتنی مہلت ہی نہیں دی لیکن یہ بات دراصل طبیعت اور مزاج کی ہے ورنہ آدمی وقت نکال ہی لیتا ہے۔ بقول شخصے وقت کبھی نہیں ہوتا وقت نکالنا پڑتا ہے۔ میرے دوستوں کا بھی کوئی ایسا حلقہ نہ تھا جس میں گھنٹے دو گھنٹے صرف کئے جاتے زیادہ سے زیادہ امجدیہ ہوٹل میں جمنے والے گروپوں میں کبھی کبھی شامل ہو جاتا۔ جہاں عمر اور پیسے سے قطعِ نظر ہم مذاقوں کی نشستیں ہوتیں مثلاً ش مظفر پوری اور ابراہیم ہوش جیسے سینئر

ہوتے تو کچھ ہم عمر اور کچھ نسبتاً کم عمر بھی۔ یہ فہرست خاصی طویل ہے لیکن اس کا ایک قابل ذکر پہلو بھی ہے۔

مخبری: خفیہ محکمہ کا ایک انسپکٹر جو دو بے کے نام سے مشہور تھا زکریا اسٹریٹ کے ہوٹلوں کا چکر کاٹتا رہتا اور وہاں بیٹھنے والے گروپوں کے پاس منڈلایا کرتا آس پاس کے مسلم محلوں میں بھی چلتا پھرتا نظر آتا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر خفیہ محکمہ کے کسی شخص کی اس طرح شناخت ہوتو یہ اس کی لیاقت نہیں عدم لیاقت ہے۔ اخباری حلقے میں بعض کارکن ایسے تھے جن کے بارے میں لوگوں کا خیال تھا کہ وہ مخبری کرتے ہیں جس کے پیسے انہیں ملتے ہیں۔

ایک شخص بہت ہی پراسرار تھا وہ کھادی کے کرتے پاجامے اور چپل میں کولوٹولہ اور زکریا اسٹریٹ کے علاقے میں مستقل چلتا ہوا نظر آتا۔ چوڑا چکلا بدن، گندمی رنگ، کلین شیو اور ادھیڑ عمر۔ اردو اخباروں کے دفاتر میں بھی جھانکتا پھرتا۔ جب میں ڈاکٹر غزنی کے بچوں کو ٹیوشن پڑھاتا تھا تو روز شام کو ان کے ہاں بھی جھانکتا اور وہ اس کو ایک روپیہ دے دیا کرتے تھے۔ ایک بار میں نے ان سے دریافت کیا تو کہنے لگے کہ بیکار آدمی ہے دواخانے میں آنے والے خطوں کا جواب لکھ دیا کرتا ہے تو اس کو ایک روپیہ روز دے دیتا ہوں۔ وہ شخص دو ایک بار میرے پاس بھی اس طرح پہنچا کہ جیسے کسی اشتہار کا ترجمہ کر رہا تھا اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو پوچھنے کے لیے آ گیا ہو۔ میں اس کا نام بھی نہیں جانتا تھا نہ کبھی جاننے کی ضرورت ہی محسوس کی۔

ایک بار ایسا ہوا کہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی صاحب حکیم محمد زماں صاحب کے مطب میں تشریف فرما تھے اتفاق سے میں بھی اسی وقت پہنچا۔ یہ ان سے نیاز حاصل ہونے کا آخری موقع تھا۔ مصافحہ کرنے کے بعد میں ایک طرف بیٹھ گیا تو دیکھا کہ وہی شخص حکیم صاحب کے مطب کے باہر چوکھٹ بازو سے لپٹا جھانک رہا تھا۔ ذرا دیر بعد دبے پاؤں داخل ہوا اور چھوٹا سا ایک بنڈل مولانا کی طرف کھسکا کر الٹے پاؤں واپس ہوا۔ مجھے یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوئی۔ اگلے دن حکیم صاحب سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ شخص پان لایا تھا اور مولانا کے عقیدت مندوں میں سے ہے۔ دیوبند میں تھا تب بھی ان کے لیے پان لایا کرتا تھا،

بات آئی گئی ہوگئی۔ میں نے اسے مسلمان ہی سمجھا اور سمجھتا رہا۔ اس سے مختلف سمجھنے کی کوئی وجہ بھی نہ تھی۔

بہت عرصہ بعد ایک روز میں نے کولوٹولہ اسٹریٹ پر غزنی فارمیسی کے سامنے اس شخص کو پہلی بار بش شرٹ اور پینٹ میں بظاہر بہت خوش سامنے سے آتے دیکھا اور اس کی پیشانی پر پہلی بار لال ٹیکہ بھی لگا دیکھا۔ وہ بڑی تیزی سے میرے قریب سے گزر گیا پھر میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تب میرا تجسس بڑھا اور ادھر اُدھر لوگوں سے پوچھنا شروع کیا تو حسب ذیل کہانی معلوم ہوئی۔

جنگِ آزادی کے دوران علمائے دیوبند کافی سرگرم اور سربکف تھے۔ انگریزوں کے خلاف محاذ آرائی میں کتنے ہی علماء کو اذیت ناک سزائیں دی گئیں اور کتنے ہی جاں بحق ہوئے جن کی فہرست طویل ہے۔ آزادی کے قریب کے زمانے میں ایک موقع ایسا آیا کہ اکابر علماء جو اسکیمیں بناتے ان سب کی اطلاع انگریزوں کو مل جایا کرتی وہ حیران تھے یہ مخبری کس طرح ہورہی ہے۔ بالآخران کی نظر اس یتیم بچے پر گئی جو دارالعلوم بند میں لا کر داخل کیا گیا تھا اور چھوٹے موٹے کاموں سے لگا دیا گیا تھا جیسے چائے، پان، پانی وغیرہ لانا۔ اس طرح اس کی تعلیم اور پرورش دونوں ہورہی تھی۔ وہ علماء کی ہر نشست میں اندر باہر آتا جاتا رہتا۔ جب اس کی شناخت کر لی گئی، جو بہت دنوں بعد ہوئی، تو اس کو وہاں سے ہٹادیا گیا۔ اس کے سپرد جو بھی خدمات رہی ہوں اس سے قطعِ نظر علماء کے قرب کی وجہ سے اس کو ان سے ایک لگاؤ ہو گیا تھا۔ چنانچہ اپنے قیام کلکتہ کے دوران جب اس کو حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی آمد کا پتہ چلا تو پان کا ہدیہ لے کر حاضر ہوا تھا۔ میں نے جب اس کو ٹیکہ لگائے ہوئے بش شرٹ میں دیکھا تھا اس وقت وہ باضابطہ خدمات سے سبکدوش ہو چکا تھا۔

لطائف: اخباروں میں کاتبوں کے لطائف تو بہت مشہور ہیں 'عصرِ جدید' میں بھی بہت کچھ دیکھنے اور سننے میں آیا مثلاً ایک خوش نویس ابراہیم صاحب نے مجھ سے کہا کہ یہ ظفیر صاحب نے مضمون کا کیسا عنوان لکھا ہے ''وفاحسین''؟۔ ظفیر صاحب سامنے ہی بیٹھے تھے میں

نے سلپ لے کر ان کے سامنے بڑھا دی تو انھوں نے ایک زوردار لاحول پڑھی اور فلک شگاف ٹھٹھا لگایا۔ ارے یہ ''وضاحتیں'' لکھا ہوا ہے۔

ایک بار محمد علی پارک میں جمعیۃ علماء کا کوئی جلسہ ہونے والا تھا، خان بہادر صاحب مغربی بنگال جمعیۃ العلماء کے صدر تھے چنانچہ اس جلسے کا اعلان 'عصرِ جدید' میں اشاعت کے لیے دیا گیا اور خان بہادر صاحب نے ہدایت کی کہ اس کو کسی اچھے کاتب سے جلی لکھوایا جائے اور نمایاں طور پر شائع کیا جائے۔ چنانچہ وہ اعلان کتابت کے لیے استاد رفیع کو دیا گیا جنھیں شرف استادی کی بنا پر دوسرے کاتبوں کی اجرت کی بہ نسبت ۲۵ ؍روپیہ ماہانہ زیادہ ملتا تھا۔ استاد نے وہ اعلان لکھ دیا۔ منیجر صاحب نے بہ نفسِ نفیس اس کا پروف پڑھا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اسے خان بہادر صاحب کو بھی دکھایا۔ اگلے دن جب اخبار میں چھپا ہوا دیکھا گیا تو مقام محمد علی پارک میں ''پارک'' کی ''ر'' غائب تھی اور ''محمد علی پاک'' رہ گیا تھا۔ شکر ہے ہم لوگوں میں سے کسی نے پروف نہیں پڑھا تھا ورنہ نوکری سے اسی وقت ہاتھ دھونے ہوتے۔ اس لغزش کی پاداش میں استاد رفیع کی ۲۵ ؍روپیہ ماہانہ کی اضافی تنخواہ سلب کر لی گئی۔

خان بہادر صاحب کو بڑی فکر تھی کہ کتابت 'آزاد ہند' جیسی ہونی چاہیے۔ انھوں نے پوچھا ''فکاہات'' کون لکھتا ہے۔ معلوم ہوا عابدی صاحب۔ ان کو طلب کیا گیا اور حکم ہوا 'آزاد ہند' کے ''نمکدان'' کی طرح لکھا کریں۔ انھوں نے فرمایا وہ ''پاشاں پاشاں'' لکھا ہے۔ خاں بہادر صاحب نے کہا وہ کیا ہوتا ہے۔ اب عابدی صاحب نے فن خطاطی اور اقسامِ خط پر لکچر شروع کیا۔ ذرا دیر بعد خان بہادر صاحب نے کہا وہ سب میں کچھ نہیں جانتا جو خط بھی ہو بس ''نمکدان'' جیسا ہونا چاہیے۔

ایک روز ہدایت موصوف ہوئی کہ سرخیاں کم لگائی جائیں اور بڑی بھی نہ ہوں۔ چنانچہ ہیڈ کاتب حسن صاحب نے مجھ سے کہا کہ رضوان صاحب اگر آپ ایک دن تکلیف کریں تو روز روز کی مصیبت ٹل جائے گی۔ چنانچہ اس روز یہ کیا گیا کہ پارلیمنٹ میں پنڈت نہرو کی کسی تقریر کو دو کالم کی لیڈ بنایا اس کے بعد پورے اخبار میں ساری سرخیاں سنگل کالم کی تھیں۔ عالم یہ

ہوا کہ صفحہ اول پر سنگل کالم کی سرخیاں کچھ اس طور تھیں ''مولانا آزاد کی تقریر'' پنڈت پنت کا بیان وغیرہ وغیرہ۔ اگلے دن خان بہادر صاحب اخبار کا یہ نقشہ دیکھ کر بہت برہم ہوئے اور اپنا حکم منسوخ کر دیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس روز سارا اخبار ٹھوس میٹر سے بھرنے میں مترجم اور کاتب سب کے چھکے چھوٹ گئے۔

ان تمام تلخیوں اور ترشیوں کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ 'عصرِ جدید' کا ماحول اور کام کرنے والوں کے آپسی تعلقات اتنے خوشگوار تھے کہ خارجی تلخیاں کافور ہو جاتی تھیں۔ کام کا سارا عرصہ ایک تفریح سا بنا رہتا تھا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ 'عصرِ جدید' نے جہاں بہت کچھ لیا، صحت کا قیمتی سرمایہ لے لیا، زندگی کا رس چوس لیا وہیں بہت کچھ دیا بھی۔ زندگی کے تجربات کا بیش بہا خزانہ عطا کیا، آئندہ زندگی کی رزم گاہ کے لیے تربیت کا میدان فراہم کیا۔ زندگی کی آسائشوں کے عوض سخت کوشی سے لذت آشنا کیا۔

دو شخصیات:

کلکتہ کے مسلم سماج میں دو شخصیات کے ملتے جلتے ناموں کی وجہ سے ایک طرح کا کنفیوزن رہا ہے۔ اس کنفیوزن کی ایک وجہ ان کی ہم عصری بھی رہی ہے۔ لیکن ان کے درمیان فرق ان مطابقتوں سے بہت زیادہ ہیں۔ ایک ملک التجار، دوسرا قلاش، ایک دانشکدوں اور اشاعت گھروں کا بانی اور مالک دوسرا قلم کاغذ کے تمام رشتوں سے یکسر عاری، ایک کے افراد خاندان سے گھر بھرا پُرا، دوسرا تنِ تنہا بے نیازِ آشیانہ وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے ایک خان بہادر شیخ محمد جان ہیں اور دوسرے ملا جان محمد۔

خان بہادر شیخ محمد جان اپنے اصل نام کے بجائے صرف خطاب سے ہی معروف تھے۔ ان کا تعلق خوشحال تجارت پیشہ دلی والی برادری سے تھا جن کی انجمن قوم پنجابیان کے نام سے ایک تنظیم بھی تھی۔ خان بہادر صاحب کی ہمہ جہت شخصیت تھی جس میں کاروبار اور املاک کے بندوبست کے علاوہ بہتیری معاشرتی، تعلیمی اور سیاسی سرگرمیاں شامل تھیں۔ وہ کانگریس پارٹی سے نظریاتی تعلق رکھتے تھے، جمعیۃ العلمائے کلکتہ کے صدر رہے۔ ان کی ذاتی املاک کلکتہ

سے دہلی تک پھیلی ہوئی تھیں ان میں سے ایک بولائی دت اسٹریٹ میں وہ بہت بڑی چار منزلہ عمارت بھی تھی جس کی زیریں منزل میں ایک طرف اخبار 'عصرِ جدید' اور 'امروز' کے دفاتر تھے تو دوسری طرف ایک خیراتی شفاخانہ جو غالباً پنجابی برادری کے صرفے سے چلتا تھا اور اس عمارت کی بالائی منزلوں میں محمد جان ہائر سکنڈری اسکول کے کمرے تھے لیکن یہ سب اس عمارت کے عقبی قطعے میں تھے، سامنے کے بلاک میں جس کا رخ سڑک کی طرف تھا نیچے دکانیں تھیں اور اوپر کرائے داروں کی رہائشیں۔

لیکن محمد جان ہائر سکنڈری اسکول کے قیام کے علاوہ خان بہادر صاحب کا ایک بہت بڑا کارنامہ ۱۹۵۶ء میں دارالاشاعت اسلامیہ کا قیام تھا۔ مولانا عطاء الرحمٰن قدسی اس کے مدارالمہام مامور ہوئے جنھوں نے اس ادارے کو زبردست فروغ دیا اور اب تک اس کارِ خیر میں منہمک ہیں۔ خان بہادر صاحب نے ایک پروجیکٹ پر خطیر رقم صرف کی جس کے تحت احادیث اور ایسی دینی کتابوں کی بازیابی اور اشاعت کا اہتمام کیا گیا جو نایاب اور مفقود تھیں اور کثیر لاگت کی وجہ سے کوئی ناشر ان کی اشاعت میں ہاتھ لگانے کی جسارت نہیں کرتا تھا اور یہ بات بھی تھی کہ ان کتب کی فوری فروخت کے ذریعہ آمدنی کا امکان بھی نہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی مشہور تاج کمپنی کے طرز پر ہر سائز اور ڈیزائن کے قرآن شریف کی اشاعت بھی جاری رہی جو الگ الگ مسلم ممالک اور علاقوں کی ضرورتوں کے مطابق چھاپے اور فراہم کیے جاتے۔ ہر سال حج کے زمانے میں قرآن شریف کی بہت بڑی تعداد سعودی عرب بھیجی جاتی اور مولانا عطاء الرحمٰن صاحب خود بھی جاتے۔

خان بہادر صاحب ایک عرصے تک مغربی بنگال کے ایم ایل سی بھی رہے۔ ان کی اس قدر دولت و ثروت اور دائرۂ عمل کی وسعت و تنوع کی وجہ سے سیاسی اثر و رسوخ کی توسیع اور برقراری ایک لازمہ تھا۔ اس کا سب سے بڑا وسیلہ اخبار ہوتا ہے چنانچہ ۱۹۵۰ء میں روزنامہ 'عصرِ جدید' کی ملکیت کا حصول اور ۱۹۵۱ء میں شام کے اخبار امروز کا اجراء اسی ضرورت کی تکمیل تھی۔ کولوٹولہ اسٹریٹ پر (جواب مولانا شوکت علی روڈ کہلاتی ہے) مسجد کولوٹولہ سے متصل

وہ عمارت ہے جس میں خان بہادر صاحب کے آبائی اور مشترک ادارہ جیون بخش محمد جان کا صدر دفتر ہے اس سے متصل دارالاشاعت اسلامیہ ہے اور اس کے بعد والی ایک لمبی چوڑی بلڈنگ کی بالائی منزل پر خان بہادر صاحب کا مرکزی دفتر ایک سکریٹریٹ کے طرز پر قائم تھا۔ ایک لمبے ہال میں داخل ہونے پر کیشئر، ٹائپسٹ اور مختلف کلرکوں کی میزیں تھیں، آخری میز جنرل منیجر کی تھی۔ سب سے آخر میں خان بہادر صاحب کا کیبن تھا جس کے دروازے کے پاس ایک حاجب ایک اسٹول پر بیٹھا ہوتا جس کا قد نارمل سے ذرا کم تھا۔ کبھی کبھی میں سوچتا کہ خان بہادر صاحب نے اپنے مقربین کے انتخاب میں ان کے قد کا خاص خیال رکھا ہے یا یہ بات محض اتفاقی ہے کہ ان میں سے کئی ایک ذرا دبتے ہی قد و قامت کے تھے۔

خان بہادر صاحب بلاشبہ ایک مخیّر شخص تھے لیکن ایک بات پر مجھے کل بھی حیرت تھی اور نصف صدر گزر جانے کے بعد آج بھی حیرت ہے کہ اخبار سے وابستہ کارکنوں کے ساتھ ان کی وہ خیرخواہی کیوں بصارت اور بصیرت سے عاری تھی۔ اگر اس میں قصور ان کے مشیروں کا تھا تو نااہل مشیروں پر اعتماد بذاتِ خود دوراندیشی پر ایک تبصرہ ہے۔ اپنے وقت کے بہترین صحافیوں کی خدمات 'عصرِ جدید' کو حاصل تھیں، ان میں سے بیشتر ایسے تھے کہ کسی معاشرے کے لیے باعثِ افتخار ہوتے لیکن ان کی جس طرح مٹی پلید کی گئی اور انھیں جس طرح بے آبرو کیا گیا اس کا تذکرہ نہایت تکلیف دہ ہے۔ 'عصرِ جدید' کے صرف ایک ایڈیٹر مصطفیٰ صابری صاحب نے برطرفی کے بعد اپنی چھ سات برس کی ملازمت کے لیے گریجویٹی کا مطالبہ کیا تو اس میں ناکامی کے بعد انھیں انڈین جرنلسٹ ایسوسی ایشن کی پناہ میں جانا پڑا اور لیبر ٹریبونل کے فیصلے کے بعد انھیں اٹھارہ سو روپے ملے۔ اس کے علاوہ کوئی اور مثال نہیں ملتی۔ خود میں نے اٹھارہ برس 'عصرِ جدید' میں ہر طرح کی ذمہ دارانہ خدمات انجام دیں اور صحت کی اس حد تک خرابی کی حالت میں مجھے کام کرنے سے روک دیا گیا کہ اپنی زندگی کی نہ مجھے امید تھی، نہ میرے اہل و عیال کو اور اسی اثنا میں والد صاحب کا بھی انتقال ہوا۔ ایک پیسہ گریجویٹی وغیرہ کے نام پر بھی نہ دیا گیا۔ مجھے خان بہادر صاحب کے اس حکم کی اطلاع ملی تھی کہ ''مقدمہ قائم کرنے دو جب فیصلہ ہوگا تو دیا

جائے گا۔'' لیکن میں نے اس بارے میں نہ ایسوسی ایشن سے رجوع کیا نہ عدالت سے۔ ہاں یہ عہد ضرور کرلیا تھا کہ اب کبھی اردو اخبار میں کام نہ کروں گا لیکن کچھ عرصے کی خاموشی کے بعد احمد سعید صاحب کے اصرار نے مجھے 'آزاد ہند' میں کھینچ لیا۔

ملا جان محمد کا تذکرہ خلافت کمیٹی کے ضمن میں موجود ہے یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ ان کی شخصیت خان بہادر شیخ محمد جان سے مختلف تھی۔ اپنے زمانے میں تو کلکتہ میں دونوں حضرات کو الگ الگ جانا پہچانا جاتا تھا۔ لیکن کلکتہ کے باہر کے لوگوں کو اس فرق کا علم نہ تھا۔ میں نے ایسی تحریریں دیکھی ہیں جہاں ان دونوں شخصیات کی شناخت گڈ مڈ ہوگئی ہے۔ ملا صاحب پشاوری برادری سے تعلق رکھتے تھے، ان کا دائرۂ عمل خلافت کمیٹی کے تحت چند سالانہ کارروائیوں کے علاوہ فساد زدگان کے لیے ریلیف کے کاموں پر محیط تھا لیکن عام طور سے وہ اپنا زیادہ وقت اسلامیہ ہسپتال میں صرف کرتے، غریبوں اور ضرورت مندوں کی امداد اور ان کے دوا درمن کے انتظام میں مصروف رہتے۔

چند دیگر اصحاب:

رفیق عابد زاہدی: ان کا وطن موضع زاہدی پور ضلع بلیا، یوپی ہے۔ اپریل ۱۹۱۳ء میں ان کی پیدائش ہوئی۔ خود ان کے بیان کے مطابق نشور واحدی صاحب کی تاریخ پیدائش بھی وہی ہے جن کا وطن موضع شیخ پور قریب ہی واقع ہے۔ ان کے درمیان قریبی خاندانی رشتے بھی تھے۔ نشور صاحب ان کو رفیق بھائی کہتے تھے لیکن وہ نشور یا نشور صاحب کہتے تھے۔ کلکتہ کی اخباری دنیا میں وہ عابدی صاحب کے نام سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ اب عابدی صاحب اپنے وطن میں ہیں اور بینائی کی خرابی کی وجہ سے پڑھنے لکھنے کے مشاغل سے معذور ہوگئے ہیں۔ (دو یا تین سال قبل وطن میں سو برس کی عمر میں انتقال ہوا)۔

میں نے اپنے ایک عزیز تسکین واحدی صاحب کی معرفت ان کے حالات معلوم کیے۔ ان کی بے قیاس صلاحیتوں کا تو میں خود شاہد ہوں اور ان کی بے نیازی اور گمنامی پر حیران بھی ہوں۔ خوش نویسی میں ان کا استادانہ مقام تھا۔ اس قدر زود نویس کہ کوئی اور کاتب ان کے

پایہ کا نہ تھا۔ شام اور رات کی شفٹ میں کام کے لیے آنے والے 'عصر جدید' کے کاتبوں میں وہ سب سے آخر میں مسکراتے ہوئے خراماں خراماں آتے۔ جو کارگزاری معین تھی اسے سب سے پہلے مکمل کر لیتے اور اسی اثناء میں جتنی گفتگو دوسرے کاتب کرتے سب میں وہ بھی شریک ہوتے۔ کوئی کتاب بغل میں دبائے ہوئے آتے، افسانہ، ناول، کوئی شعری مجموعہ۔ کام کے دوران کام چھوڑ کر ٹیک لگائے ہوئے اسے پڑھتے۔ پھر خود بھی نظم نثر جو کچھ لکھنا ہوتا لگے ہاتھوں اس کی براہِ راست کتابت کرتے جاتے پھر رات میں کام ختم کر کے سب سے پہلے چلے جاتے۔ میانہ قد، مضبوط جسامت، گندمی رنگ، قمیص پاجامے میں ملبوس اور چپل کبھی قمیص اور لنگی پہنے ہوئے بھی آتے، نہایت سبک خرام، چہرے پر نہ کبھی کبیدگی یا افسردگی کے آثار نمایاں ہوئے نہ کوئی حرفِ شکایت کسی طرح ان کی زبان پر آیا۔ نہایت پرسکون اور مطمئن۔ جس خطے اور خاندان سے ان کا تعلق ہے، شاید ان کے ذاتی خواص میں طمانیت، قناعت اور ایک طرح کا طبعی اور روحانی سکون شامل ہیں، وہیں سے مستعار ہیں۔ نشؔور واحدی صاحب میں بھی یہ خواص نمایاں تھے اور بھی کئی بزرگوں اور عزیزوں کو اسی شان بے نیازی کے عالم میں میں نے دیکھا ہے۔ عابدؔی صاحب کو پان کے علاوہ کچھ اور کھاتے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ ایک جگہ میں نے لکھا ہے کہ جب عابدؔی صاحب کسی سے ہم کلام ہوتے ہیں تو ان کا مخاطب سرخ رو ہوتا ہے۔

۱۹۶۵ء کے قریب جب عابدؔی صاحب کلکتہ کو آخری بار الوداع کہہ کر بمبئی چلے گئے تو دارالاشاعت اسلامیہ کے مختار کل مولانا عطاء الرحمٰن قدؔسی کا کہنا تھا کہ کلکتہ کے مارکیٹ میں کتابت کا جتنا کام تھا اس کا نصف عابدؔی صاحب سمیٹ لیتے تھے۔ بمبئی میں قیام کے دوران وہ مکتبہ جامعہ، دہلی کا کام بڑی حد تک انجام دیتے رہے۔ غالباً ۱۹۸۰ء میں وہ مکتبہ کے منیجر شاہد علی خاں صاحب کی درخواست پر اپنے وطن سے بمبئی واپس جاتے ہوئے دہلی آئے لیکن کوئی مہینے بھر قیام کے بعد بہت اکتا گئے تو شاہد صاحب نے بڑے آرام اور اہتمام کے ساتھ ان کو بمبئی پہنچایا۔ ان کے بڑے بیٹے شفیق 'انقلاب' بمبئی میں خوش نویس تھے۔ اب وہ بھی ریٹائر ہو کر وطن آ گئے ہیں۔

ابراہیم ہوشؔ نے بڑی صراحت سے لکھا ہے کہ میرا پہلا مضمون ہفتہ وار 'سروش' کلکتہ میں چھپا تھا جس کے ایڈیٹر رفیق عابدی صاحب تھے (اس پرچے کا سالِ اشاعت ۱۹۴۳ء درج ہے) لیکن خود عابدیؔ صاحب نے جن اخبارات اور رسالوں کا ذکر کیا ہے، ان میں 'سروش' شامل نہیں ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہوشؔ صاحب کی ایک تحریر کا اقتباس پیش کیا جائے۔ انھوں نے ایک خودنوشت بعنوان ''یادوں کے جھروکے سے'' لکھی تھی جو روزانہ 'اقراء' کلکتہ میں قسط وار شائع ہوئی۔ ۳؍اکتوبر ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں وہ لکھتے ہیں۔

''تلاش بسیار کے بعد میری نظر پھر ایک ہفتہ وار جریدے پر پڑی جس کا نام 'سروش' تھا اس اخبار کا دفتر جونا گلی یعنی فیرس لین اور سری ناتھ بابو لین کے نکڑ پر ایک گلی کے اندر مکان میں واقع تھا۔ چنانچہ ایک روز میں ایک مضمون لکھ کر 'سروش' کے دفتر پہنچ گیا، دفتر کیا تھا، بس ایک چھوٹا سا کمرہ تھا، جو رہائش اور دفتر دونوں کا کام دیتا تھا، جب میں اپنا مضمون لے کر 'سروش' کے دفتر پہنچتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک صاحب اکڑوں بیٹھے ہوئے پیلے رنگ کے کاغذ پر کچھ لکھ رہے ہیں۔ میں نے ان صاحب سے دریافت کیا کہ 'سروش' کے ایڈیٹر صاحب کہاں ہیں تو انھوں نے فرمایا کہ فرمایئے میں ہی 'سروش' کا ایڈیٹر ہوں۔

'بنگال پنچ' میں مضمون چھپنے کے بعد اب میری جھجھک بہت دور ہوچکی تھی اور میں ایڈیٹر یا اخبار کے دفتر سے اتنا مرعوب اور ہراساں نہیں رہا تھا جتنا پہلے تھا چنانچہ جب ان صاحب نے کہا تھا کہ میں ہی 'سروش' کا ایڈیٹر ہوں تو میں نے بلاتکلف اپنا مضمون ان کے ہاتھوں میں تھما دیا اور کہا یہ 'سروش' میں اشاعت کے لیے ہے، اسے دیکھ لیجیے اور قابل اشاعت ہوتو شائع فرما کر میری ہمت افزائی کیجیے۔

ایڈیٹر صاحب نے وہ پیلا کاغذ جس پر وہ لکھ رہے تھے، ایک طرف رکھ کر میرا مضمون پڑھنا شروع کیا اور کہا کہ بیٹھ جایئے میں ابھی آپ کا مضمون پڑھ کر بتائے دیتا ہوں کہ یہ شائع ہوسکتا ہے یا نہیں۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے کسی لڑکے کو آواز دی اور جب وہ آیا تو اس سے کہا کہ وہ دو پیالی چائے لے آئے۔

ایڈیٹر صاحب کی اس خوش اخلاقی سے میں بے حد خوش ہوا۔ اور میرے دل میں ان کی بے پناہ عزت بڑھ گئی۔ میرا مضمون پڑھ لینے اور چائے پینے کے بعد انھوں نے مجھ سے مضمون کے بارے میں گفتگو شروع کردی۔ ان کی یہ گفتگو میری بڑی حوصلہ افزائی کا باعث ہوئی کیوں کہ اب تک کسی ایڈیٹر نے مجھ سے میرے مضمون کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی اور نہ اس جملے سے آگے بڑھا تھا کہ ٹھیک ہے، مضمون شائع ہونے کے قابل ہوگا تو چھپ جائے گا۔

'سروش' کے ان ایڈیٹر صاحب کا نام تھا ''رفیق عابدی زاہدی'' جب تک 'سروش' نکلتا رہا، میرے مضامین اس میں شائع ہوتے رہے اور زاہدی صاحب سے میرا ربط ضبط اور خلا ملا بھی بڑھتا رہا، گو میں عمر میں ان سے بہت چھوٹا تھا بلکہ یہ کہیے کہ وہ جوان اور میں ان کے مقابلے میں طفلِ نادان تھا۔ لیکن انھوں نے کبھی بھی مجھ سے ایسا برتاؤ نہیں کیا جس سے میرے اندر یہ احساس پیدا ہو کہ بڑوں سے ملنے میں مجھے حفظِ مراتب کا خیال رکھنا اور بے تکلفانہ گفتگو سے احتراز کرنا چاہیے۔ 'سروش' کچھ دنوں نکلنے کے بعد بند ہوگیا لیکن رفیق عابدی زاہدی صاحب کلکتہ کے آسمانِ صحافت سے غائب نہیں ہوئے۔ بلکہ ان کا نام ہر جگہ لیا جاتا رہا۔''

عابدی صاحب نے اپنے جاری کردہ حسبِ ذیل اخباروں کے نام بیان کیے ہیں 'رفیق' (بلیا) 'نقاش' (کلکتہ) 'ایمن' (گورکھپور) روزانہ 'اتفاق' اور 'دلکشا' (کانپور)۔ ۱۹۴۸ء کے بعد وہ پھر کلکتہ واپس آئے۔ اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ پہلے کلکتہ میں قیام کر چکے تھے جس کا تذکرہ انھوں نے نہیں کیا لیکن ہوش صاحب نے اسی اثنائے قیام کا ذکر کیا ہے۔

کلکتہ میں ۱۹۴۹ء میں روزانہ 'کارواں' سے وابستہ رہے۔ اس کے علاوہ 'عصرِ جدید'، 'امروز'، 'ہند'، 'آوازِ مشرق'، 'آزاد ہند' میں کتابت کرتے رہے۔ اسی اثناء میں 'آئینہ' (بہار) کے لیے مضامین بھی لکھتے رہے۔ انھوں نے کلکتہ کے اخبار 'انگارہ' کا بھی ذکر نہیں کیا جہاں وہ ایک ناول 'معرکۂ شام' قسط وار لکھ رہے تھے۔ (بعد میں وہ ناول کتابی شکل میں بھی کلکتہ سے شائع ہوا) ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ 'انگارہ' کے دفتر میں جاتے اور کتابت والا کاغذ، مسطر دو کالم اٹھاتے اور بلا کسی مسودے کے دو کالم لکھ کر اٹھ جاتے اور منھ بھر پان دبائے مسکراتے ہوئے 'عصرِ جدید'

کے دفتر چلے آتے۔ اگلے دن کا کالم وہیں سے شروع کرتے جہاں گزشتہ روز چھوڑا تھا۔ وہ اپنے سارے مضامین اور تصنیفات کی براہِ راست کتابت کر دیا کرتے۔ یہی کیفیت نظموں اور غزلوں وغیرہ کی بھی تھی جو فی البدیہہ کہا کرتے۔

انھوں نے اپنی حسب ذیل تصانیف بیان کی ہیں۔ نہہ سپہر، معرکۂ شام، زبیر ابن ازبر، حورِ کامل اور نواب واجد علی شاہ۔ میکدہ (مجموعہ غزلیات) اور درود درما (نظم برنگِ اقبالؔ)۔

۴۳-۱۹۴۲ء میں کانپور میں جب میرے لڑکپن کا زمانہ تھا رفیق عابدیؔ صاحب بلیا اور گورکھپور ہوتے ہوئے کانپور آ گئے اور وہاں سے اخبار نکالنے لگے تھے۔ اس وقت میں نے ان کے بارے میں یہ سنا تھا کہ بلیا میں جعفر علی خاں اثرؔ کلکٹر تھے اور شعر و شاعری کا ذوق رکھنے والا جو حلقہ ان کے گرد اکٹھا تھا اس میں رفیق صاحب بھی شامل تھے۔ کلکٹر صاحب نے اپنا مجموعہ کلام اشاعت کی غرض سے ان کے حوالے کیا۔ انھوں نے کتابت کے دوران کہیں کہیں اصلاح کی ضرورت محسوس کی تو ازراہِ تعلق اس کو درست کرتے گئے۔ دیوان چھپ جانے کے بعد اس کو لے کر کلکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے اسے دیکھنے کے بعد کسی چپراسی کو بلایا اور کہا کہ اس کی ساری جلدیں باہر لان میں اکٹھا کر کے اس میں آگ لگا دو۔ پھر رفیق صاحب سے کہا کہ ''تعلقات کا اتنا حق ادا کر رہا ہوں کہ بلیا چھوڑنے کے لیے آپ کو ۲۴ گھنٹے کی مہلت دے رہا ہوں۔ فوراً ضلع چھوڑ دیجیے۔'' اسی واقعہ کے بعد وہ بلیا سے گورکھپور اور وہاں سے کانپور آئے اور پھر پورے برصغیر میں نہ جانے کہاں کہاں کی سیر کرتے رہے اور آخر کار ''پھر آ گئے اسی مرکز پہ جس جگہ سے چلے۔''

ابراہیم ہوشؔ کا تذکرہ اجمالاً کیا جا چکا ہے لیکن کلکتہ کی اردو صحافت میں سب سے زیادہ پرشور صحافی کے بارے میں اتنا ہی کہنا کافی نہیں ہے، گو ان کا تذکرہ جس وسعتِ بیان کا طالب ہے اس کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ میرے سامنے جو صحافی موجود تھے ان میں سب سے زیادہ سینئر ہوشؔ صاحب تھے۔ سب سے زیادہ اخباروں میں اور وقت اور زمانے کے مطابق ہر طرح کی صحافتی تحریروں کا جتنا تجربہ ہوشؔ صاحب کو تھا اس اعتبار سے ان کا ہم پلہ کوئی نہ تھا۔

انھوں نے کئی اخباروں کی ادارت کی، اداریے لکھے، ترجمہ کرتے رہے اور برسوں اسپورٹس رپورٹنگ بھی کی لیکن ۱۹۵۴ء میں 'آبشار' کے اجراء کے بعد، جس کے شریک ایڈیٹر سالکؔ لکھنوی تھے، ابراہیم ہوشؔ اور 'آبشار' ہم معنی ہوکر رہ گئے۔ یہ اخبار ۲۹ر برس تک ہوشؔ صاحب کی ادارت وقیادت میں نکلنے کے بعد ۱۹۸۳ء میں مفلسی کا شکار ہوکر خاموش ہوگیا۔ پانچ سال بعد اس کی اشاعتِ ثانی شروع ہوئی لیکن فالج زدہ اور مفلوک الحال ابراہیم ہوشؔ ایک عرصے تک اپنے وجود کو گھسیٹتے گھسیٹتے عاجز آکر اس سے دو ہفتہ قبل ابدی نیند سو گئے تھے۔ فرقہ واریت مخالف اور سیکولرزم حامی ایک تنظیم ''ڈیماکریٹک فورم فار نیشنل انٹگریشن'' نے 'آبشار' کا احیاء کیا اور یہ رئیس احمد جعفری کی ادارت میں صبح کے اخبار کے طور پر نکلنے لگا۔ لیکن ابراہیم ہوشؔ نے رہ عام سے ہٹ کر 'آبشار' کو جو ایک رنگ اور ایک نام دیا تھا وہ کہاں!

ہوشؔ صاحب انتہائی منہ زور اور ہنگامہ خیز صحافی تھے کتنے ہی گڑے مردے اکھاڑے، کتنے ہی سوئے فتنے جگائے، کتنے ہی مباحثوں اور مناظروں کی تحریک کی۔ 'آزاد ہند' کے ابتدائی برسوں میں اس اخبار کے کالموں کو اپنی ہنگامہ خیز تحریروں کے لیے استعمال کیا پھر 'آبشار' کے اجراء کے بعد تو ان کو من مانا میدانِ کارزار مل گیا۔ اس میں ان کا ایک مخصوص کالم 'کلکتیا اردو' میں ہوا کرتا تھا۔ ''ڈوما کالا چان'' دو خاص کرداروں کی زبانی وہ حالات اور واقعات پر اپنے مخصوص انداز میں تبصرے کیا کرتے تھے۔ اسی کلکتیا زبان میں ان کی ایک تصنیف ''جندگی کا میلا'' بھی شائع ہوئی تھی۔ وہ مزاج کی افتاد کے اعتبار سے تو کمیونسٹ تھے اور ان کا اخبار پارٹی کی پالیسیوں کی ترجمانی بھی کرتا تھا لیکن نہ تو وہ خود کمیونسٹ پارٹی کے ممبر تھے نہ ان کا اخبار پارٹی کا باضابطہ ترجمان تھا۔ ۱۹۵۹ء میں ہفت روزہ 'آثار' ہوشؔ صاحب کی ادارت میں جاری ہوا اور ظاہری ہیئت کو بدل بدل کر چند برسوں تک ہچکیاں لینے کے بعد وہ اچھا خاص ادبی پرچہ بند ہوگیا۔

کام کے معاملے میں میرا ہوشؔ صاحب سے کبھی سابقہ نہیں رہا لیکن جب ملتے ایک بے تکلف دوست کے طور پر ملتے اور ہمیشہ دلچسپ باتیں، قہقہوں سے بھرپور باتیں ہوتیں۔

ہوشؔ صاحب کہنے کے لیے یا دکھانے کے لیے نہیں بلکہ دل سے کمیونسٹ تھے، وہ جانتے تھے کہ میں امریکی دفتر اطلاعات کے لیے کام کر رہا تھا لیکن کبھی کسی طرح کی معمولی سی کراہت یا گریز ان کے رویہ سے نہیں مترشح ہوا بلکہ ۱۹۷۵ء کے اوائل میں جب کمیونسٹ ورکروں سے لے کر لیڈروں تک نے میرے خلاف طوفان برپا کیا تو ہوشؔ صاحب نے ان کو لتاڑا اور ایک صاحب کو تو ڈانٹ کر دفتر سے نکال دیا تھا۔ شراب ہوشؔ صاحب کی سب سے بڑی کمزوری تھی لیکن اس باب میں انھوں نے نہ تو اوروں کی طرح کسی پردہ داری کی کوشش کی نہ کسی ندامت کا اظہار کیا۔ کئی مواقع پر اپنی بلانوشی کی وجہ سے وہ ''دست بہ دستِ دیگرے پا بہ دستِ دیگرے'' باہر بھی کئے گئے تھے۔ ایک بار گرانڈ ہوٹل میں ایک ڈنر کے موقع پر اتفاق سے وہ میرے دائیں طرف بیٹھ گئے۔ ڈنر شروع ہونے سے پہلے ہی وہ تقریباً آؤٹ ہو چکے تھے۔ بیرے کو ایک بوتل لا کر میز پر رکھنے کی تاکید اور پھر تادیب کر چکے تھے۔ میز پر سامنے بیٹھے ہوئے دو بنگالی ایڈیٹروں کو ''سارا مکھن کھا جانے پر'' برا بھلا کہتے جا رہے تھے۔ شاید وہ بھی اس حال میں نہیں تھے کہ ان کی باتوں کو سنتے سمجھتے۔ تھوڑی دیر بعد جب کچھ فلمی اور غیر فلمی شخصیات نے باہوں میں باہیں ڈال کر ہال کے بیچ رقصِ بے ہنگام شروع کیا تو ہوشؔ صاحب مجھے کہنیانے لگے کہ چلو ہم لوگ بھی کولہے مٹکائیں۔ میں تو آہستہ سے وہاں سے کھسک لیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ محفل ختم ہونے پر بیروں نے انھیں باہر لا کر ایک ٹیکسی میں ڈال کر گھر کا پتہ بتا دیا۔ ان لوگوں کے لیے یہ کوئی نئی بات بھی نہیں رہی ہوگی۔ ایک اور موقع پر ہوشؔ صاحب بار مین سے مزید ایک جام کا مطالبہ کرنے لگے۔ وہ نوجوان تھا اور خفیف سی داڑھی بھی تھی۔ اس سے وہ پوچھنے لگے کہ تم جماعتِ اسلامی کے ممبر ہو کیا؟ وہ بیچارہ کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا، میں سمجھ گیا کہ اب اس کے آگے میرے پھنسنے کی باری آنے والی ہے، اس لیے میں کھسک لیا۔ بعد میں معلوم ہوا کے ان کا انجام وہی ہوا جو ہوتا آیا تھا۔

ہوشؔ صاحب کے انتقال کے بعد میں نے ایک تاثراتی مضمون بعنوان ''ہوشؔ خاموش'' لکھا تھا اس کے آخری پیراگراف نقل کرنا چاہتا ہوں۔ ''حق معرفت کرے عجب آزاد مرد تھا۔'' ۱۹۴۷ء سے پہلے مولانا شائق احمد عثمانی کا 'عصرِ جدید' مسلم لیگ کا ترجمان تھا۔ اس

سے ہوشؔ کی وابستگی کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ نظریاتی طور پر نہ سہی لیکن وہ اس طرف مائل تھے۔ پھر 'روزانہ ہند' اور 'آزاد ہند' سے وابستگی کا مطلب یہ ہو کہ وہ عمداً یا مجبوراً کانگریس کی ترجمانی کرنے والے اداروں سے ہم آہنگ ہو گئے۔ لیکن ۱۹۵۴ء میں 'آبشار' کی اشاعت کسی اور سمت میں اشارہ کرتی ہے۔ اس اخبار کی پالیسی ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کی ترجمانی کے مترادف تھی اور ہونا بھی چاہیے تھا کیونکہ اس اخبار کی اشاعت میں سالکؔ لکھنوی صاحب کا مالی اشتراک شامل تھا۔ ان کے اشتراکی نظریات کا اخبار کی پالیسی پر اثر انداز ہونا بالکل فطری بات تھی۔ سالکؔ صاحب ہفت روزہ 'آثار' کی ادارت میں بھی شریک تھے۔ ان باتوں کا ایک مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ ہوشؔ صاحب بالکل آزادہ منش تھے اور ہر نظریہ سے خود کو ہم آہنگ کر لینے میں کوئی تردد نہیں محسوس کرتے تھے یا مجبوراً پیش آمدہ حالات سے سمجھوتہ کرلیا کرتے تھے۔ روایات سے عاری کاسموپولیٹن شہروں میں اور ملک کے انقلاب بداماں حالات میں عام آدمی کے لیے جو زندگی کے مسائل سے کسی طور پر نپٹنا چاہتا ہو حالات سے سمجھوتہ کر لینا کوئی بہت غیر متوقع بات نہ تھی۔ ہر شخص میں آدرش بن کر ٹوٹ جانے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ لچک بھی جینے کا ایک سلیقہ ہے۔ جب واحد نصب العین جینا ہو تو زندگی کوئی بھی ڈھب اختیار کرسکتی ہے۔ اب دیکھنے کی بات یہ رہ گئی ہے کہ اس عالم بے اختیاری میں گزر جانے والے کے قلم سے کیا کچھ سرزد ہوا۔ تاریخ کو لکھا جاسکتا ہے، پڑھا جاسکتا ہے لیکن اسے اپنے من مانے طریقے سے ترتیب نہیں دیا جاسکتا۔ باصلاحیت صحافیوں کا بے حوصلہ ہوجانا بھی اردو صحافت کی تاریخ کا ایک باب ہے، جو لوگ اس کی بہتر توضیح کر سکتے ہیں انھیں ضرور سامنے آنا چاہیے۔''

گزرتے ہوئے وقتوں پر جب نظر کرتا ہوں تو ہوشؔ کی کئی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ رات کو 'آزاد ہند' کی سیڑھیوں سے اترتے ہوئے جب وہ اس اخبار میں نیوز ایڈیٹر تھے ایک تصویر میں پتلون کے پائنچے الٹے ہوئے احمد سعید ملیح آبادی کے ساتھ، غالباً اس وقت وہ جیل سے باہر آئے تھے، ہوٹلوں میں چائے کی پیالی پر ہلکی پھلکی بحثیں، 'آبشار' کے دفتر میں غل غپاڑے اور دوستوں کے ساتھ ٹھٹھے، گرانڈ ہوٹل کے ڈنر میں آپے سے باہر اور آخری منظر وہ کہ

بارش کے بعد کلکتہ کی سڑکیں زیرِ آب ساری سواریاں ٹھہری ہوئی، لوگ پانی میں سڑاپ سڑاپ آتے جاتے۔ چترنجن ایونیو کی ایک زیرآب فٹ پاتھ پر پتلون کے پائنچے چڑھائے ہوئے ابراہیم ہوشؔ ایک ٹانگ کو جو فالج سے کسی قدر متاثر ہوگئی تھی اپنے وجود کے ساتھ چلنے پر مجبور کرتے ہوئے۔ گردوپیش سے بالکل بے نیاز دفتر ’آبشار‘ کی طرف گامزن۔ کبھی نہ کبھی پہنچ ہی جائیں گے۔ کھڑے رہنے سے تو کبھی نہیں پہنچیں گے۔

ابراہیم ہوشؔ کا آخری قہقہہ جس کی گونج اب تک میرے کانوں میں ہے۔ میں پٹنہ میں شیںؔ مظفر پوری سے ملتا ہوا کلکتہ پہنچا۔ ’آبشار‘ کے دفتر میں ہوشؔ صاحب سے ملا۔ شیںؔ صاحب ان کے لنگوٹیا یار۔ ہم نوالہ وہم پیالہ رہ چکے تھے اس لیے ان کا ذکر ضروری معلوم ہوا۔ میں نے کہا: ’’ہوشؔ صاحب! شیںؔ صاحب تو بالکل صوفی ہوگئے باتسبیح و مصلیٰ۔‘‘ کہنے لگے: ’’کیا اس نے داڑھی بھی رکھ لی ہے؟‘‘ میں نے کہا: ’’ابھی نہیں۔‘‘ بس ایک زوردار قہقہہ لگایا: ’’اچھا تو بال بال بچا ہے۔‘‘

وہ قہقہہ خاموش ہوگیا۔ ڈوما اور کالا چان خاموش ہوگئے۔ کلکتیا اردو کی نثر و نظم خاموش ہوگئیں۔ مشرق میں اردو صحافت کی تاریخ کا ایک ورق گم ہوگیا۔

ہوشؔ صاحب کی خودنوشت سوانح حیات روزنامہ ’اقراء‘ کلکتہ میں ۱۹۸۳ء میں مسلسل قسط وار شائع ہوئی۔

قیصر شمیم صاحب اول تا آخر استاد ہیں۔ اسکول سے کالج اور یونیورسٹی تک استادی کی اس کے ساتھ ہی وقتاً فوقتاً منھ کا مزہ بدلنے کے لیے صحافت سے بھی شغل فرماتے رہے اور اس سلسلے میں ’ہوڑہ ٹائمز‘، ’آزاد ہند‘ اور ’کسان مزدور‘ میں قلم فرسائی کی لیکن ان کا اصل میدان استادی کا رہا ہے۔ چنانچہ صحافیوں کی بھی استادی کی، اپنے ہونہار شاگردوں کو رموز صحافت سے آشنا کر کے اس فضائے بسیط میں بلند پروازی کی راہ دکھائی اور سب سے بڑھ کر شاعری کے میدان میں استادی کے درجے سے کم پر راضی نہ ہوئے۔ ان کے شاگردوں کا ایک وسیع حلقہ ہے۔ یوں تو قیصر شمیم اپنی ذات میں ہی انجمن ہیں لیکن کسی واقعی انجمن کا شوق انھیں شروع سے

دامن گیر رہا، چنانچہ ان کی سرپرستی میں پھولنے، پھلنے، پھیلنے والا ہوڑہ رائٹرس ایسوسی ایشن اپنی عمر کی چار دہائیاں مکمل کر چکا ہے اور اپنی عمارت میں مستحکم ہوجانے کے بعد نئی منزلوں کی طرف گامزن ہے۔ یہ ایسوسی ایشن ہوڑہ اور کلکتہ کے اردو، ہندی اور بنگلہ ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کا اچھا اور مثالی سنگم رہا ہے۔ انھوں نے مغربی بنگال اردو اکاڈمی کے وائس چیئرمین کی حیثیت سے بھی ادب وصحافت کے میدان میں قائدانہ کردار ادا کیا۔

سید حرمت الاکرام بنیادی طور پر شاعر تھے اور میری ہی طرح کئی سرکاری ملازمتوں کے خارزار سے دامن چھڑاتے ہوئے ۱۹۵۴ء میں کلکتہ آئے لیکن فرق یہ ہوا کہ صرف چھ برس میں اس شہر سے بھی دامن چھڑا کر اپنے وطن مرزا پور واپس ہوگئے مگر ان کا دل وہیں اٹکا رہ گیا، ہماری طرح یا مرزا غالبؔ کی طرح، وہ اس شہر کے قصیدے لکھتے پڑھتے رہے۔ ابتداً کوئی ایک برس 'روزانہ ہند' میں رہے اس کے بعد 'آزاد ہند' میں آگئے وہاں ترجمہ اور فکاہیہ مضامین کے علاوہ انھوں نے روزانہ ایک قطعہ لکھنے کی روایت شروع کی جسے مرزا پور جانے کے بعد بھی جاری رکھا۔ ان کے بعد اعزاز افضل اس روایت کے امین ہوئے جسے انھوں نے ۲۰۰۵ء کی جنوری آتے آتے آخری وقت تک جاری رکھا۔

حرمت صاحب کی منحنی اور مختصر جسامت تھی۔ 'آزاد ہند' میں کام کے دوران ایک بار انھیں یہ اندیشہ لاحق ہوگیا کہ پنکھا کہیں اوپر سے گر نہ جائے۔ اس پریشانی سے نجات پانے کے لیے وہ کچھ دنوں کے لیے گھر چلے گئے واپس آئے تو کچھ ہی دنوں 'عصرِ جدید' میں بھی کام کیا اور پھر ۱۹۶۰ء میں اس شہر کو مستقلاً خیرباد کہہ کر چلے گئے۔ اس مختصر عرصے کے لیے 'آزاد ہند' سے 'عصرِ جدید' میں آجانے کی ایک علت ہوسکتی ہے اور وہی علت شہر کو چھوڑنے کی بھی ہوسکتی ہے مگر یہ محض قیاس ہے۔ بات یہ تھی کہ آغا حیدر میکشؔ اس زمانے میں 'آزاد ہند' کے منیجر تھے۔ میں نے سنا تھا کہ وہ لکھنؤ میں محکمہ پولیس میں تھے کسی وجہ سے علیحدگی کے بعد کلکتہ آئے اور 'آزاد ہند' سے وابستہ ہوگئے۔ ان کی رہائش حرمت صاحب کے کمرے سے متصل تھی۔ حرمت صاحب کے بڑے بھائی اقبال اکرامی صاحب 'امروز' کے ایڈیٹر تھے، وہ بھی اسی کمرے میں رہتے تھے

لیکن وہ صبح کو نکل جاتے اور ان کا زیادہ وقت باہر ہی گزرتا اور حرمت صاحب کا زیادہ وقت کمرے میں۔ایک روز آغا صاحب سے ان کی کچھ کہا سنی ہوگئی۔آغا صاحب نے فوری ردِعمل کے طور پر ایک ہاتھ رسید کر دیا۔ یہ بے چارے دھان پان آدمی نہ معلوم ان کا کیا حال ہوا۔اب اس حادثے کے بارے میں ان سے پوچھتا کون۔لیکن 'امروز' اور 'عصرِ جدید' سے وابستہ ایک کاتب عبدالغفار (مولوی عبدالغفار) تھے، خیر سے شاعر تھے اور بوم تخلص کرتے تھے۔انھوں نے اس واقعہ کی مناسبت سے ایک شعر لکھا ۔

اظہار حقیقت یہ ہمیں مار رہا ہے
ہر دور میں منصور سرِ دار رہا ہے

ایک پرزے پر یہ شعر لکھ کر انھوں نے حرمت صاحب کے سامنے بڑھا دیا۔نظریں نیچی کیے ہوئے انھوں نے اس کو دیکھا، زیرِ لب مسکرائے اور بس۔

اسی اثناء میں آغا صاحب بھی 'آزاد ہند' سے رخصت کر دیے گئے معلوم نہیں اس واقعہ سے ان دونوں حضرات کی لکھنؤ اور مرزاپور واپسی کا کتنا تعلق تھا۔حرمت صاحب نہایت سنجیدہ اور کم گو تھے۔ان کی شاعرانہ حیثیت یہاں زیرِ بحث نہیں ہے یوں ان کے کئی شعری مجموعے اشاعت پذیر ہوئے، ان میں سے ایک مسدس 'کلکتہ ایک رباب' ہے۔۱۹۸۳ء میں مرزاپور میں ان کا انتقال ہوا۔

مظہر امام: کلکتہ میں مظہر امام صاحب کا اور میرا ورود غالباً ایک ہی سال یعنی ۱۹۵۱ء میں آگے پیچھے کسی وقت ہوا۔وہ یونس نظری کے اخبار 'کارواں' کی رہنمائی کے لیے آئے یا لائے گئے تھے لیکن 'معاون' کی بھی معاونت کرتے رہے اس کے ساتھ ہی بیشمار رسائل اور جرائد پر بھی شب خوں مارتے رہے لیکن انھوں نے جلد ہی صحافت کی راہ چھوڑ کر استادی کی راہ اختیار کی۔ اس راہ پر بھی زیادہ دور نہ گئے تھے کہ ہوا کے دوش پر سوار ہوگئے یعنی آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہوگئے۔ظاہر ہے وہ بھی صحافت کی وہ صورت تھی جو اب الکٹرانک میڈیا کہلاتی ہے۔آگے چل کر وہ دوردرشن کے سری نگر اسٹیشن کے ڈائریکٹر ہوگئے اور ریٹائر ہونے تک اس عہدے پر فائز

رہے لیکن وہ ڈگر جو انھوں نے شروع میں پکڑی تھی یعنی ادبی صحافت کی اس پر بدستور رواں دواں رہے۔

ایک عجب اتفاق، جسے میں حسنِ اتفاق کہوں گا، یہ ہوا کہ امام صاحب کے ہمالیائی سفر میں گوہاٹی سے سری نگر تک ایک تماشائی کی طرح میں ان کے تعاقب میں رہا۔ ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۹ء تک ہر سال سری نگر جاتا تو ایک شام امام صاحب کی قیام گاہ پر ان کی صحبت سے فیض یاب ہوتا۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ ہندوستان کے ہوائی اڈوں میں سب سے زیادہ پریشان کن سری نگر کا ہوائی اڈہ ہے جہاں جانچ پڑتال چھان پھٹک تو بجا طور پر بہت ہے لیکن بے لگام دفتری عملے کی بداعمالیاں بھی بے حساب ہیں۔ میں نے سٹی آفس میں بعض بے بس مسافروں کو بھوں بھوں روتے ہوئے دیکھا ہے۔ ایک بار میری گاڑی بھی پھنس گئی تھی جس کے لیے امام صاحب کا جیک استعمال کرنا پڑا۔ شاید اس کے بعد پھر میں سری نگر نہیں گیا۔ اب ہم دونوں اپنے اپنے وطن سے دور کلکتہ سے بھی منہ پھیر کر دہلی میں آسودگی سے بسر کر رہے ہیں۔

کریم رضا مونگیری: کریم رضا کے ساتھ ''مونگیری'' ضرور لکھئے۔ ۱۹۶۶ء میں شاہزادہ سلیم نے 'عکاس' ہفتہ وار کی اشاعت شروع کی۔ چند برس بعد کریم رضا نے اس کی ملکیت حاصل کر لی۔ انھوں نے ۱۹۷۹ء میں اس ہفتہ وار کو روزنامہ میں تبدیل کر دیا اور پابندی سے اس کی اشاعت جاری رکھی ہے۔ کریم رضا پبلک ریلیشنز میں اچھی مہارت رکھتے ہیں اور اشتہارات کے حصول میں اس کا بھرپور استعمال کرتے ہیں۔ انھوں نے یہ بات کبھی مخفی نہیں رکھی کہ وہ اشتہارات کے لیے اخبار نکالتے ہیں اور اس ضمن میں کچھ صحافت بھی راہ پا جاتی ہے۔ کلکتہ سے دہلی آنے اور پابندی کے ساتھ مجھ سے ملاقات کرنے والے چند احباب و اصحاب میں کریم رضا بھی شامل ہیں۔ چند برس پہلے آخری بار ان سے ملاقات بڑی دلچسپ تھی۔ وہ شام کے جھٹ پٹے میں ایک رکشے پر اپنی اہلیہ کے ساتھ ہمارے نوآباد علاقے کی بھول بھلیاں میں کسی عزیز کا مکان تلاش کر رہے تھے۔ میں ٹہلتا ہوا اس طرف جا نکلا تھا۔ اس غیر متوقع اچانک ملاقات پر ہم دونوں کو حیرت ہوئی پھر میں نے ان کے عزیز کے مکان تک ان کو پہنچایا۔

رئیس الدین فریدی صاحب 'شانِ ملت' کی شان نزول بیان کرتے ہوئے 'آزاد ہند' کی اشاعت مورخہ ۲۲/مارچ ۱۹۸۶ء میں لکھتے ہیں کہ ''جناب کلیم الدین شمس جب طلبِ علم سے فارغ ہوکر میدان سیاست میں آئے اور فارورڈ بلاک کے زینے سے اسمبلی کی ڈپٹی اسپیکری کے منصب تک پہنچے تو وہ بھی اخبار نویسی کے میدان میں آئے بغیر نہ رہ سکے اور انھوں نے اپنی بیگم اور اپنے پرانے دوست اور رفیق کار جناب الیاس اصلاحی ایم اے کی شراکت میں ایک پریس خرید کر شام کا اخبار 'شانِ ملت' اپنے محلے خضر پور سے جاری کیا۔ اس کے ایڈیٹر الیاس صاحب ہی مقرر ہوئے۔'' اخبار کی نبض رک رک کر مدھم رفتار سے چلتی رہی لیکن اس سے پہلے کی کہانی بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔

یہ بات ۱۹۶۰ء کی دہائی کے ابتدائی برسوں کی ہے۔ ہندی میں کوئی کتاب شائع ہوئی۔ اس میں ایک قابلِ اعتراض مضمون شامل تھا جس میں پیغمبرِ اسلامﷺ کی شان میں گستاخی کی گئی تھی۔ کلکتہ کے مسلمانوں نے اس کے خلاف احتجاج شروع کر دیا۔ اسی سلسلے میں مسلم طلبہ کے ایک گروپ نے بڑا بازار میں واقع اس کتاب کے ناشر کی دکان پر حملہ کر کے توڑ پھوڑ کی۔ پولیس نے اس موقع پر چند طلبہ کو گرفتار کر لیا جو بعد میں رہا کر دیے گئے۔ ان میں کلیم الدین شمس بھی شامل تھے۔ اقبال اکرامی صاحب سے شمس صاحب کی گاڑھی چھنتی تھی چنانچہ وہ اکثر آتے جاتے رہتے تھے۔ اس واقعہ کے بعد ایک روز شام کو وہ 'عصرِ جدید' کے کام کے اوقات میں آئے اور ایک مراسلہ اس اخبار میں اشاعت کی غرض سے پیش کیا۔ وہ اسی مذکورہ بالا واقعہ سے متعلق رہا ہوگا۔ میں نے اس کو پڑھا اس کے بعد کلیم الدین شمس سے جو اس وقت کلکتہ یونیورسٹی کے طالب علم تھے، کہا کہ بھائی اگر لیڈر بننے کا شوق ہے تو اس کے لیے ساری عمر پڑی ہے لیکن یہ تعلیم حاصل کرنے کا وقت نکل جائے گا اور اگر اچھی تعلیم حاصل کر لی تو لیڈر بھی اچھے بنو گے۔ انھوں نے میری باتوں کو خاموشی سے سنا اور اپنا مراسلہ واپس لے کر چلے گئے۔ چند برسوں کے بعد جب وہ لا کے آخری سال میں تھے (کلکتہ یونیورسٹی میں لا کا کورس تین سال کا ہوتا تھا جبکہ ہماری طرف ایل ایل بی کا کورس دو سال کا ہوتا تھا) تو کلکتہ کارپوریشن کے

کونسلروں کے انتخاب میں اپنے حلقہ خضر پور سے بطورِ امیدوار کھڑے ہو گئے اور کامیاب بھی ہوئے۔ پھر تو انھوں نے پیچھے پلٹ کر نہ دیکھا۔ وہ فارورڈ بلاک میں شامل ہو گئے اور یہ پارٹی بائیں بازو کی متحدہ محاذ میں شریک ہو گئی۔ اس کے حصے میں دو سیٹیں ملیں۔ ان میں سے ایک پر کلیم الدین شمس کا مستقل قبضہ ہو گیا۔ پھر وہ مغربی بنگال اسمبلی کے لیے اپنے حلقے سے منتخب ہوتے رہے۔ اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر ہوئے اور اگلی چھلانگ میں وزارت پر فائز ہو گئے۔

ایک بار عید کی نماز کے بعد میں اپنے بھائی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لیے گیا، سولہ آنہ قبرستان شمس صاحب کے علاقے ہی میں واقع ہے۔ میں واپس ہو رہا تھا کہ ایک طرف سے شمس صاحب نکلے اور مجھ سے لپٹ گئے۔ کہنے لگے کہ رضوان بھائی میں نے آپ سے جو وعدہ کیا تھا اس کو پورا کر دیا۔ ایک بار میں نے ان سے مسلسل کامیابیوں کا راز دریافت کیا۔ کہنے لگے کہ یہ تو بالکل سیدھا اور صاف فارمولا ہے۔ بائیں محاذ نے فارورڈ بلاک کو دو سیٹیں دی ہیں تو ان میں سے ایک کسی مسلمان کے حصے میں لازماً آنی ہے اور وہ اکیلا میں ہی ہوں۔

مولوی عبدالغفار ستارامپوری کے تذکرے کے بغیر آزادی کے بعد ربع صدی تک کلکتہ کی اردو صحافت کی تاریخ نامکمل رہے گی۔ یوں تو وہ شروع سے آخر تک 'امروز' اور 'عصرِ جدید' سے وابستہ رہے۔ لیکن اس تمام اثناء میں کاتبوں کی ہر تحریک کی روح رواں انہی کی ہستی ہوا کرتی تھی۔ ۱۹۷۴ء میں کلکتہ کے اردو اخباروں میں کاتبوں کی جو ہڑتال ہوئی تو ۳۵ روز تک کوئی اردو اخبار نہ نکلا اس کے محرک بھی عبدالغفار تھے۔ 'امروز' کے ایڈیٹر اقبال اکرامی اور منیجر قاضی اقبال احمد سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ کوئی معاملہ کیسا ہی ٹیڑھا ہو یہ لوگ اس کو بڑی خوش اسلوبی سے حل کر لیا کرتے تھے۔ پریشانیاں اگر تھیں تو ان کے لیے جو اس مثلث سے باہر تھے۔ ظاہر ہے ہڑتال کے بعد منتظمین سے ان کے تعلقات میں فرق آیا ہوگا۔ منیجر اقبال صاحب کا بھی انتقال ہو گیا اس کے بعد کسی وقت عبدالغفار صاحب نے بھی کلکتہ کو خیر باد کہا جس کے لیے انھوں نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ منصوبہ بند طور پر پکا انتظام کر لیا تھا۔ ان کے بڑے بیٹے نے دھنباد میں اجنتا آرٹ پریس کے نام سے ایک پرنٹنگ پریس قائم کر لیا تھا جس کی جڑیں مضبوط

ہوگئی تھیں۔ عبدالغفار صاحب نے وہاں پہنچ کر وہی کیا جو کسی مولوی کو کرنا چاہیے تھا یعنی مولانا آزاد گرلس اسکول کے نام سے لڑکیوں کا ایک اسکول آزادنگر، دھنباد میں قائم کیا اور خود جم کر وہاں بیٹھ گئے، ان کی تعلیم مدرسہ الٰہیات کانپور میں ہوئی تھی۔ ان کا دوسرا بیٹا جو کلکتہ میں زیرِ تعلیم تھا کچھ عرصہ پہلے سنا کہ وہ مظفر پور کے سرکاری ہسپتال میں ہاؤس سرجن ہے۔ لیکن غفار صاحب کے بعض کارناموں کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

'عصرِ جدید' کے دفتر کے آخری گوشے میں روشنی، ہوا، پانی سے محفوظ ایک بڑا سا کمرہ تھا اسی میں 'عصرِ جدید' اور 'امروز' دونوں اخباروں کا عملہ اپنے اپنے کام کے وقتوں میں ہوا بند رہتا تھا۔ ان لوگوں میں ادارت اور کتابت دونوں شعبوں کے لوگ شامل تھے جن کی تعداد دن رات کے مختلف وقتوں میں گھٹتی بڑھتی رہتی تھی، کم سے کم چھ اور زیادہ سے زیادہ دس بارہ ہوتی۔ 'عصرِ جدید' صبح کا اخبار تھا اور 'امروز' شام کا اس لیے دن رات وہاں کام جاری رہتا۔ رات کے آخری حصے میں کسی وقت چند گھنٹوں کا وقفہ ہوتا۔

اس کمرے میں تین طرف تخت یا تختے لگے ہوئے تھے کاتب دیواروں سے ٹیک لگا کر بیٹھتے جن کے سروں پر بلب آویزاں ہوتے بعد میں ٹیوب لگ گئے تو ان کے سروں پر اور کمرے کے پورے ماحول میں حرارت کم ہوئی۔ درمیان میں چھوٹی بڑی دو میزیں تھیں جن پر ایڈیٹر اور مترجم اپنے اپنے اوقات میں کرسی نشین ہوتے۔ ان کرسیوں کی کثرتِ استعمال کی وجہ سے وقتاً فوقتاً ٹوٹنے والے پائے کی مرمت ہوتی رہتی۔ اس قفس خود اختیاری میں داخل ہونے والے ہر خاص و عام کی نظریں سب سے پہلے عبدالغفار صاحب سے چار ہوتیں کیونکہ دروازے کے سب سے قریب تخت کے نکڑ پر انہی کی نشست تھی، اس کے بعد عبدالمجید صاحب کی، جو بیٹھے بیٹھے واقعی دوہرے ہو گئے تھے، بمشکل رکوع کی حالت میں کھڑے ہو سکتے تھے حالانکہ وہ پہلے خاصے خوش شکل اور وجیہ اور خوش مزاج بھی تھے۔ غفار صاحب اپنی نشست کے اس محلِ وقوع سے خوب فائدہ اٹھاتے۔ کتابت وغیرہ کے لیے کوئی کام لے کر کوئی شخص وہاں پہنچتا تو اس کو وہ فوراً اچک لیتے۔ ایک دن دو چینی داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں چینی زبان کا ایک ٹیبلائڈ تھا۔

غفار صاحب نے لپک کر انھیں پکڑا اور ملی جلی الٹی سیدھی زبان میں ان سے باتیں کیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم اسی طرح کا ایک اخبار روزانہ چھاپنا چاہتے ہیں۔غفار صاحب نے فوراً اس چیلنج کو قبول کرلیا۔ان کو بٹھایا چائے پلائی اور کہا کہ آپ جو چاہتے ہیں ہم بالکل وہی لکھ کر اور چھاپ کر روز شام کو دے دیں گے بس ایک کام آپ کر دیا کریں۔ یہ کہہ کر انھوں نے کتابت والا پیلا کاغذ جسے مسطر کہتے ہیں ان کو دے دیا اور ایک شیشی کتابت والی روشنائی اور دو قلم پکڑا دیے اور کہا کہ یہ ایک اسپیشل پیپر اور خاص کیمیکل ہے آپ کو جو کچھ لکھنا ہو اسی قلم اور اسی کیمیکل سے اس کاغذ پر لکھ کر ہمیں دے دیا کریں ہم بالکل ویسا ہی چھاپ کر دے دیں گے۔سارا سودا یعنی تعداد اشاعت، چھپائی اور کاغذ وغیرہ کی قیمت طے ہوگئی۔ ہر روز 'امروز' کا کام ختم ہونے کے بعد یہ پرچہ چھپ جاتا جس کی نقد رقم وصول ہوجاتی۔ یہ خاصا نفع بخش سودا تھا جو کافی عرصے تک جاری رہا۔ظاہر ہے یہ کاروبار منیجر صاحب کی شراکت کے بغیر تو نہیں چل سکتا تھا۔

بات یوں تھی کہ ہندوستان میں چینی نسل کے لوگوں کی سب سے بڑی آبادی کلکتہ میں ہے جو اس وقت بیس ہزار بتائی جاتی تھی وہ زیادہ تر چمڑے اور جوتے کے کاروباری ہیں۔ چیت پور روڈ پر ان کی دکانیں تھیں شاید اب بھی ہوں جن کے عقب کا علاقہ چینا پاڑا کہلاتا تھا اور شہر کے مشرقی مضافات میں چمڑے کی ٹینریاں تھیں۔۱۹۶۲ء میں ہند چین جنگ کے دوران ہزاروں چینی راتوں رات گرفتار کرکے راجستھان کے نظر بندی کیمپوں میں بھیج دیے گئے پھر کچھ عرصہ بعد رہائی پاکر واپس آئے۔ ان چینیوں میں کمیونسٹ اور نیشنلسٹ دونوں سیاسی دھڑوں سے تعلق رکھنے والے تھے کمیونسٹ گروپ اپنا باقاعدہ پرچہ چھاپ رہا تھا، یہ بعد والا گروپ جو غفار صاحب کے ہتھے چڑھا کومنتانگ یعنی نیشنلسٹ گروپ سے تعلق رکھتا تھا۔

ایک روز ایک بزرگ ہلتے کانپتے ایک ہاتھ میں کپڑے کا ایک تھیلا لیے اور دوسرے میں ایک چھڑی تشریف لائے۔غفار صاحب نے لپک کر ان کی قدم بوسی کی۔ وہ علاقے میں جانے پہچانے جاتے تھے اور انجینئر بابا کہلاتے تھے۔ بنارس کے رہنے والے تھے اپنے زمانے میں انجینئر تھے۔ان کے مضامین اور ڈرائنگ کسی زمانے میں اخباروں میں شائع ہوئے تھے ان

کے تراشوں کا ایک پلندا وہ لیے پھرتے تھے، بالکل لاوارث تھے، حافظ جمال الدین کی مسجد میں گوشہ نشین تھے۔ ہر کسی سے کہتے تھے کہ میرے کاغذات گورنمنٹ کے کسی محکمے تک پہنچا دو تا کہ میں نے جن ایجادات کا خاکہ پیش کیا ہے ان کو عملی شکل دی جائے اور میری بھی کچھ مدد ہو جائے لیکن کون سنتا ہے صدائے درویش۔ غفار صاحب نے ان سے پوچھا کہ کیسے تشریف لائے۔ فرمایا کہ ''مجھے نبوت مل گئی ہے اسی کا اعلان کرنے آیا ہوں اس کو اخبار میں چھاپ دیجیے۔'' غفار صاحب نے ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور ادب کے ساتھ کرسی پر بٹھایا پھر مکالمے کا آغاز ہوا:

''حضرت کہاں تشریف رکھتے ہیں؟''

''یہیں حافظ جمال الدین کی مسجد میں۔''

''حضرت کہاں آرام فرماتے ہیں؟''

''اسی مسجد میں۔''

''حضرت کے کھانے پینے کا کیا انتظام ہے؟''

''وہیں اللہ جو دیتا ہے کھا پی لیتا ہوں۔''

''حضرت رفع حاجت کے لیے کہاں تشریف لے جاتے ہیں؟''

''وہیں مسجد میں۔''

اس کے ساتھ ہی بڑے میاں اٹھ کر کھڑے ہوئے لیکن غفار صاحب نے اپنی بات پوری کر دی۔

''استغفر اللہ! ایسے پیغمبر جو اللہ میاں کے گھر کو اپنا گھر بنا لیں ان سے اچھے تو ہم گنہگار بندے ہیں جو سال میں ایک بار نہاتے دھوتے ہیں، نئے کپڑے پہنتے ہیں، عطر لگاتے ہیں، تب مسجد کی طرف جاتے ہیں، پھر بھی چوکھٹ پر پاؤں رکھنے کی ہمت نہیں ہوتی باہر ہی کہیں دو رکعت نماز ادا کر لیتے ہیں۔''

پھر تو بڑے میاں پاؤں پٹختے ہوئے باہر چلے گئے۔ میں نے ان بزرگ کو آخری بار زکریا اسٹریٹ کے فٹ پاتھ پر بیٹھے گھسٹتے ہوئے جاتے دیکھا تھا ان کے نا کافی کپڑے لت پت

تھے اور ان کی پیٹھ پر ایک میلا سا پشتارا تھا، جس میں غالباً ان کی عملی زندگی کی کاوشوں کی شہادتیں، وہی تراشے رہے ہوں گے۔

ملازمت کے ابتدائی برسوں میں عبدالغفار صاحب سخت بیمار ہوئے۔ کام ختم کر کے وہیں دفتر میں تخت پر لیٹ جاتے۔ درد سے کراہتے، کوئی آگے پیچھے نہ تھا، بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر فتح محمد صاحب کے زیرِ علاج تھے جو ہماری صحافی برادری کے لیے سول سرجن کی حیثیت رکھتے تھے۔ دفتر 'عصرِ جدید' کے قریب ہی ان کا دواخانہ تھا جب غفار صاحب کی حالت خراب ہوگئی تو ان کے بہنوئی نے انھیں جھریا بلا لیا۔ ایک عرصے تک ان کی کوئی خبر نہیں ملی۔ کوئی چھ ماہ بعد ایک روز نمودار ہوئے، ہٹے کٹے، تندرست و توانا۔ ان کی اوریجنل جوانی لوٹ آئی تھی اور اس کے ساتھ ہی ظرافت اور خوش مزاجی بھی جس میں میرے دیکھتے پھر کبھی کوئی کمی نہیں آئی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ علاج معالجہ کس کا کیا، کہنے لگے: ''ڈاکٹر فتح صاحب مجھے دو گولیاں روز کھانے کے لیے دیتے تھے۔ میں نے وہ ڈبہ دیکھ لیا تھا وہی گولیاں لے کر میں دھنباد چلا گیا اور کھاتا رہا پھر بالکل ٹھیک ہو گیا۔

حافظ نظام الدین: نے ۱۹۵۲ء میں خوش نویس کی حیثیت سے 'امروز' میں کام شروع کیا۔ اسی اخبار میں ایک صاحب علم صوفی منش خوش نویس ابوالبرکات محمد خلیل صاحب ان کے ہم وطن گیا، بہار کے رہنے والے تھے۔ انہی کی بھتیجی سے حافظ صاحب کی شادی ہوگئی۔ وہ ہائی اسکول پاس تھیں تو حافظ صاحب کو بھی لاگ ہوئی اور انھوں نے کام کے ساتھ تعلیم جاری رکھنے کا سلسلہ شروع کیا پھر ہائی اسکول، انٹر، بی اے اور کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے کر ڈالا اور 'عصرِ جدید' میں کچھ ترجمہ بھی کرنے لگے۔ ۶۶-۱۹۶۵ء میں کچھ عرصے تک 'عصرِ جدید' کے ایڈیٹر بھی رہے۔ ۱۹۶۷ء میں ٹیٹا گڑھ کے ایک ہائر سکنڈری اسکول میں ٹیچر ہو جانے کے بعد اخبارات سے بالکل بے تعلق ہو گئے۔ یوں بھی اکثر وہ اپنی دنیا میں گم اور مافیہا سے بے خبر رہتے۔

دو ہم شکل بھائی:

وہاب حیدر اور مجید عبدل برادران حیدرآباد سے تعلق رکھتے تھے۔ دونوں جڑواں بھائی

تھے اور بالکل ہم شکل تھے۔ایک بار میں نے ان میں سے کسی ایک سے پوچھ لیا کہ ''بھائی آپ دونوں کے درمیان کوئی ایسا فرق ہے، جس سے شناخت کی جاسکے کہ کون وہاب حیدر ہے اور کون مجید عبدل۔'' تو ان حضرت کا جواب تھا کہ ''یہ تو میری ماں بھی نہیں بتاسکتی تھی کہ کون کون ہے اور کبھی ایک کی کسی حرکت پر دوسرا مار کھاتا۔'' میں نے پوچھا کہ ''آپ دونوں میں بڑا چھوٹا کون ہے؟'' تو اس پر بھی ان کا جواب وہی تھا کہ ''یہ تو ہماری ماں کو بھی نہیں معلوم، ہم دونوں جڑواں ہیں اور ایک ساتھ پیدا ہوئے تھے۔'' لیکن حیدرآباد اور کلکتہ کے اخباروں کے تذکروں میں جہاں بھی ان دونوں کا نام آیا ہے وہاں وہاب حیدر کو بڑا بھائی اور مجید عبدل کو چھوٹا بھائی لکھا گیا ہے۔مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے شانتی رنجن بھٹاچاریہ کی تصنیف ''بنگال میں اردو صحافت کی تاریخ'' رئیس احمد جعفری کی نظر ثانی اور اضافے کے ساتھ شائع کی ہے اس میں ان دونوں بھائیوں کا جہاں ذکر آیا ہے، اس میں وہاب حیدر کو بڑا بھائی لکھنے کے بعد اگلے جملے میں ہی مجید عبدل کو بڑا بھائی لکھ دیا گیا ہے اس طرح حساب کتاب برابر ہوگیا۔ان حضرت سے میں نے دریافت کیا کہ آپ کون ہیں، فرمایا: ''مجید عبدل'' اور اس کے ساتھ ہی مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔اس کے بعد پھر کبھی ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔کبھی کبھی ذہن میں یہ بات بھی آئی کہ معلوم نہیں انھوں نے صحیح بتایا تھا یا غلط لیکن قیاس غالب ہے کہ وہ مجید عبدل ہی رہے ہوں گے۔اس ملاقات اور گفتگو کی تاریخ اور سال تو نہیں یاد نہ اندازہ ہی ہے لیکن ایک بات تحقیق شدہ ہے کہ وہاب حیدر کا انتقال حیدرآباد میں ۱۹۶۷ء میں ہوا اور مجید عبدل کلکتہ میں ہی رہ گئے اور یہیں ان کا انتقال ہوا، نہ معلوم کب۔مگر جب ان سے وہ ملاقات ہوئی تھی اس وقت ان کی حالت بڑی خراب وخستہ تھی۔ایک میلی کچیلی شرٹ اور ایک چکٹ پینٹ اور بس، ننگے پاؤں۔ بات یوں تھی کہ انھیں طرح طرح کے نشے کی لت پڑ گئی تھی، آمدنی کا کوئی خاطر خواہ ذریعہ نہیں تھا۔جس زمانے کی میں بات کررہا ہوں وہ مارفیا کا انجکشن لینے کی لت میں مبتلا تھے۔ایک چھوٹا سا سرنج رکھتے تھے اور خود ہی اپنی ران میں گود لیتے اور کہیں پڑ رہتے۔ایسے اچھے فنکاروں اور قلمکاروں کا ایسا دردناک انجام دل ہلا دینے والا ہے۔

وہاب حیدر حیدرآباد کے روزنامہ 'سیاست' اور دیگر اخباروں میں کام کرتے رہے، پھر وہاں سے بمبئی چلے گئے۔ وہاں 'انقلاب' اور دیگر اخبارات وجرائد میں کام کرتے رہے۔ وہاں سے کلکتہ کب آئے وثوق سے نہیں کہا جاسکتا لیکن رئیس الدین فریدی، ایڈیٹر 'روزانہ ہند' نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ دسمبر ۱۹۵۷ء میں جب وہ کلکتہ آئے اور اخبار مذکور میں ذمہ داریاں سنبھالیں، اس وقت وہاں کام کرنے والوں میں وہاب حیدر بھی شامل تھے پھر وہ کب بمبئی واپس گئے اور وہاں سے کب حیدرآباد مراجعت کی نہیں معلوم۔

مجید عبدل کے کلکتہ میں ورود کی تاریخ یا سال کا پتہ نہیں لیکن اتنا معلوم ہے کہ ہفتہ وار 'عبدل ویکلی' ۱۹۵۳ء میں کلکتہ سے شائع ہوا تھا اور نو دس شماروں کی اشاعت کے بعد وہاں سے طلوع ہونے والے دیگر پرچوں کی طرح غروب ہوگیا۔ یہ دونوں بھائی اچھے مزاح نگار اور کارٹونسٹ تھے لیکن وہاب حیدر کا تحریری حلقہ بہت وسیع تھا۔ جبکہ مجید عبدل بنیادی طور پر آرٹسٹ تھے۔ بہتیرے پیروڈی لکھنے والوں اور کارٹون بنانے والوں نے غالبؔ کے اشعار پر مشق کی ہے انہی میں یہ جوڑی بھی شامل تھی۔ وہ غالبؔ کے کسی ایک شعر کو لے کر اس کی مناسبت سے ایک کارٹون بناتے جو ''شعر پر شوشہ'' کے زیر عنوان شائع ہوتے۔ ان کا ایک مجموعہ اسی عنوان کے تحت کتابی شکل میں بھی شائع ہوا۔ ان دونوں بھائیوں کا جواں عمری میں انتقال ہوا، زندگی جتنی بھی ملی تھی بڑے بڑے شہروں کی خاک چھانتے گزر گئی۔ پتہ نہیں ان کی ان کیفیات نے انھیں نشوں سے ہمکنار کیا تھا یا نشوں میں مبتلا ہوکر جان کی بازی ہار گئے۔

ان کے کئی کارٹون کبھی کبھی یادوں کے جھروکے سے جھانکتے ہیں۔ مثال کے طور پر غالبؔ مسجد کے باہر ننگے پاؤں کھڑے ہیں۔ بظاہر ان کا جوتا چوری ہوگیا، نیچے ان کا یہ شعر درج ہے:

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

یا وہ کارٹون جس میں ایک عرب کا اونٹ اپنے مالک کے خیمے میں گردن ڈال کر

جھانکنے کے بعد خیمے کو گردن میں لٹکا اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور بے چارہ عرب حیران کھڑا ہے۔ نیچے یہ شعر درج ہے:

وہ آئیں ہمارے گھر خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

■❖■

باب چہارم

آزاد ہند سے وابستگی

۱۹۶۹ء میں 'عصرِ جدید' سے بے تعلقی کے بعد سارا وقت خالی ہی خالی تھا۔ یو ایس آئی ایس کا کام کل وقتی نہ تھا اس لیے اس فکر میں تھا کہ اردو اخباروں سے ہٹ کر کوئی اور کام اختیار کرنا چاہئے۔ لیکن اس خالی وقت کے بمشکل دو ہفتے گزرے ہوں گے کہ مجھے احمد سعید ملیح آبادی، ایڈیٹر پروپرائٹر 'آزاد ہند' کا پیغام موصول ہوا کہ آ کر مجھ سے ملاقات کرلو۔ میں وہاں گیا اور ان سے ملاقات کی۔ جیسا کہ اندازہ بلکہ اندیشہ تھا، سعید صاحب نے مجھے 'آزاد ہند' میں کام کرنے کی پیشکش کی لیکن میں نے معذرت چاہی۔ پھر انھوں نے کہا کہ بھائی میں آپ کو آج کوئی نئے نہیں بلا رہا ہوں میں نے تو ہمیشہ ہی بلایا آپ ہی نہیں آئے لیکن مجھے اس کا کوئی رنج نہیں ہوا بلکہ خوشی ہوئی کہ آپ جہاں کام کرتے ہیں وہاں کے وفادار بھی ہیں۔ اب چونکہ آپ 'عصرِ جدید' چھوڑ چکے ہیں اس لیے یہاں آنے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے۔

میں نے عرض کیا کہ سعید صاحب آپ مجھے بلایا کرتے تھے اس وقت میری صحت ٹھیک تھی لیکن اب تو میری صحت ویسی نہیں رہی میرا خیال ہے کہ میں آپ کی توقعات کے مطابق کام نہیں کرسکوں گا۔ لیکن اس کے بعد سعید صاحب نے جو کچھ کہا اس نے مجھے واقعی پگھلا دیا۔ انہوں نے کہا کہ ''بھائی میں آپ سے کام کے لیے کب کہہ رہا ہوں۔ آپ خالی ہیں، شام کو یہاں آ جایا کیجئے، بیٹھئے ہم لوگ آپ کی صحبت سے لطف اندوز ہوں گے۔'' مطلب صاف تھا۔ مگر اردو اخبارات سے میرا جی روٹھ گیا تھا میں نے سعید صاحب کے اس اندازِ بیان کے بعد اس بارے میں غور کرنے کے لیے ان سے مہلت لے لی اور گھر چلا آیا۔

لیکن چند دنوں بعد دوسری پہل سعید صاحب ہی کی طرف سے ہوئی۔ ان کے فرستادہ سمیع اللہ صاحب نے آ کر مجھ سے دریافت کیا کہ آپ نے اب تک کوئی جواب کیوں نہیں دیا۔ لیکن انھوں نے اتنی ہی بات نہیں کی بلکہ ان کی گفتگو کا لب ولہجہ سفارشی تھا یعنی یہ کہ مجھے 'آزاد ہند' میں جانا چاہیے۔

سمیع اللہ کا معاملہ یوں تھا کہ وہ عمر میں مجھ سے بہت چھوٹے تھے اور جب ظفیر صاحب 'عصرِ جدید' میں تھے تو وہ ان سے انگریزی پڑھنے کے لیے آیا کرتے تھے پھر آگے چل کر کچھ ترجمہ کی مشق کرنے لگے تو اسے لے کر برائے اصلاح میرے پاس 'عصرِ جدید' میں آیا کرتے تھے چنانچہ میں انہیں اپنے خورد اور عزیز کے طور پر سمجھتا تھا۔ ایسے میں جب انھوں نے مجھے 'آزاد ہند' میں آجانے کا مشورہ دیا تو میں نے اسے مبنی بر خلوص سمجھا اور شائبہ بھی نہیں گزرا کہ وہ مشورہ 'آزاد ہند' کے منیجر کا تھا۔ بس میں اس کے بعد ہی سعید صاحب کے دربار میں حاضر ہوگیا۔ وہاں کام کچھ رفتہ رفتہ شروع ہوا۔ ایک سو پچاس روپیہ تنخواہ متعین ہوئی اور چار کالم ترجمہ میرے ذمہ کیا گیا۔ پھر کچھ دنوں بعد جب نیوز ایڈیٹنگ میرے ذمہ ہوئی تو اس کے ساٹھ روپیہ ماہوار زائد ملنے لگے۔ وہ میرے ذہنی انتشار کا دور تھا، اس زمانے میں میرے لیے اطمینان کی بات یہ تھی کہ مجھے شام کو ۴ بجے 'آزاد ہند' جانا تھا اور اپنا کام کر کے فرصت کر لینی تھی۔ اس سے پہلے یا بعد کے وقت پر کسی کا کوئی دعویٰ نہیں تھا اور نہ مجھ پر کوئی گرفت یا پابندی تھی۔ یہ کیفیت بذاتِ خود صحت افزا ثابت ہوئی۔ 'آزاد ہند' میں کام شروع کرنے کے بعد میں نے ایک اصول اپنا لیا اور اس پر عمل کرتا رہا وہ یہ کہ اپنے کمرے میں جانا، وہاں کام کرنا اور وہیں سے واپس چلا آنا۔ سعد صاحب کے کمرے میں صرف بشرطِ ضرورت یا کسی موضوع پر گفتگو کے لیے جاتا ورنہ کئی کئی دن تک آتے جاتے دور ہی سے سلام کلام ہو جاتا۔

(فروری ۱۹۹۲ء میں کلکتہ کے اخباروں میں یہ الم انگیز خبر دیکھنے کو ملی کہ عزیزم سمیع اللہ نے بہ عارضۂ کینسر اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔)

سنگم (کلکتہ)

چونکہ 'آزاد ہند' کا تذکرہ طویل اور تفصیل سے ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے 'سنگم' کا تذکرہ کرلیا جائے جو نسبتاً مختصر اور برمحل ہے۔ پٹنہ سے شائع ہونے والے اسی روزنامہ کا کلکتہ ایڈیشن ۱۹۷۰ء میں جاری ہوا۔ اس کا بیان ابراہیم ہوشؔ کے الفاظ میں سنئے۔ ان کی خودنوشت سوانح حیات روزنامہ 'اقراء' میں قسط وار شائع ہوئی، لکھتے ہیں:

''۱۹۶۷ء میں جب الیکشن کی آمد آمد ہوئی تو مغربی بنگال کی بائیں بازو کی پارٹیوں نے متحدہ محاذ کے نام سے ایک محاذ بنایا اور کانگریس کے مقابلے میں صف آرا ہوا۔ ۱۹۶۴ء کے فرقہ وارانہ فسادات اور ۱۹۶۵ء میں مسلمانوں کی گرفتاریوں نے مسلمانوں کے قلوب کانگریس کی طرف سے پھیر دیے تھے اور اب وہ کسی قیمت پر کانگریس کو ووٹ دینے کے حق میں نہیں تھے۔ متحدہ محاذ نے بھی ہوا کے راخ کو محسوس کیا اور مسلمانوں کے ووٹ حاصل کرنے اور انھیں اپنی پالیسی کا ہمنوا بنانے کے لیے پٹنہ سے روزانہ 'سنگم' کے ایڈیٹر غلام سرور کو کلکتہ بلایا اور ان کے سپرد یہ خدمت کی کہ وہ اردو داں حلقۂ انتخاب میں متحدہ محاذ کے انتخابی جلسوں میں تقریریں کریں اور اس کی حمایت میں مہم چلائیں۔ غلام سرور صاحب نے یہ خدمت خوش اسلوبی سے انجام دی... چنانچہ جب الیکشن کا نتیجہ برآمد ہوا تو کانگریس کا صفایا ہوگیا... مغربی بنگال میں متحدہ محاذ کے برسر اقتدار آنے کے بعد 'سنگم' کے ایڈیٹر غلام سرور صاحب نے سوچا کہ کلکتہ سے بھی 'سنگم' کا اجراء کیا جائے تو اسے بڑی کامیابی سے چلایا جاسکتا ہے... چنانچہ اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انھوں نے مکلوڈ اسٹریٹ میں ایک عمارت کی نچلی منزل کرائے پر حاصل کی اور ضروری تیاریاں کرکے 'سنگم' نکال دیا۔ پہلے شمارے کی اشاعت کے دن انھوں نے 'سنگم' کے دفتر میں کلکتہ کے تمام اردو صحافیوں کو مدعو کرنے کے علاوہ متحدہ محاذ کے بعض وزراء اور چند مسلم ممبران اسمبلی کو بھی مدعو کیا جن میں ڈاکٹر ایم اے او غنی بھی شامل تھے۔ اس موقع پر ڈاکٹر غنی صاحب نے تقریر کرتے ہوئے متحدہ محاذ کے حق میں غلام سرور صاحب کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ متحدہ محاذ کو غلام سرور ہی کی وجہ سے فتح و کامرانی نصیب

ہوئی اور مجھے امید ہے کہ ان کا اخبار 'سنگم' متحدہ محاذ کی حمایت جاری رکھے گا اور ہم لوگوں سے جو کچھ ہو سکے گا اس کی خدمت سے دریغ نہیں کریں گے۔ڈاکٹر غنی صاحب کی یہ بات کئی آدمیوں کو بری لگی جن میں 'آزاد ہند' کے ایڈیٹر احمد سعید صاحب بھی تھے۔''

''یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ متحدہ محاذ کے ہاتھوں کانگریس کی شکست کے ساتھ ہی 'آزاد ہند' نے ایسی قلا بازی کھائی کہ لوگ دیکھ کر ششدر رہ گئے اور ایسی قلب ماہیئت دکھائی کہ 'آزاد ہند' کے پڑھنے والوں نے دانتوں میں انگلی داب لی۔ ......'آزاد ہند' اب کانگریس سے منحرف ہو کر متحدہ محاذ کا ایسا زبردست حامی بن گیا جیسے اس سے بڑھ کر متحدہ محاذ اور جیوتی بابو کا دم بھرنے والا نہ کوئی تھا اور نہ ہے اور نہ ہوگا۔لہٰذا قدرتی تھا کہ اسے ڈاکٹر ایم اے او غنی کی بات انتہائی ناگوار اور ناپسند لگتی۔'' (اقراء ۹/نومبر ۱۹۸۳ء)

یہاں چند باتیں قابلِ توجہ ہیں اول یہ کہ ہوشؔ صاحب کی اس تحریر میں کلکتہ کے اردو اخباروں کے درمیان اسی شدید رقابت کی کارفرمائی نمایاں ہے جس کی نشاندہی کی جا چکی ہے، احمد سعید صاحب کی یا 'آزاد ہند' کی پالیسی میں اچانک تبدیلی کا اشارہ بھی کیا جا چکا ہے، دوسرے یہ کہ کانگریس نے مسلمانوں پر ظلم کیا تھا اس کی وجہ سے عام مسلمان اس کی طرف سے بدل تھا اور الیکشن میں اس بدلی کا اظہار بھی کیا جو پارٹی کی شکست اور متحدہ محاذ کی کامیابی کا موجب ہوئی۔ احمد سعید صاحب نے ایک موقع شناس اور زود کار صحافی کی حیثیت سے مسلمانوں کی اسی عمومی رائے کا اظہار کیا اور اپنے اخبار کے تجارتی اغراض کے لیے اس سے فائدہ اٹھانا بالکل فطری بات تھی۔ یہی تو سیاست ہے ورنہ سیاست اور کیا ہے۔تیسرے یہ کہ 'سنگم' کے کلکتہ ایڈیشن کی صورت میں 'آزاد ہند' کا ایک رقیب وجود میں آ گیا تھا جسے نئے حکمرانوں کی پشت پناہی کا غالب امکان تھا ایسے میں احمد سعید صاحب کے لیے یہ امر بالکل فطری تھا کہ وہ بھی ان حکمرانوں کی تائید و حمایت حاصل کرنے کی بروقت سعی کرتے کیونکہ اس سے ان کے اخبار کی آئندہ تجارت اور سرکاری اعانت سے مالی منفعت وابستہ تھی۔آنے والے وقت نے بہت جلد یہ ثابت کر دیا کہ ان کی وہ کوشش صائب تھی کیونکہ 'سنگم' تو سال ڈیڑھ سال

میں بند ہو گیا۔ غلام سرور صاحب پٹنہ چلے گئے لیکن ان کے جانے سے پہلے ہی شین مظفر پوری صاحب جا چکے تھے کیونکہ کلکتہ میں ان کا جی نہ لگا۔ وہ تقریباً بیس برس بعد پٹنہ سے کلکتہ میں قیام کی غرض سے آئے تھے لیکن اتنی مدت گذر جانے پر نہ شہر دہ شہر رہ گیا نہ خود شین صاحب وہی رہ گئے جو تھے نہ ان کی محفلِ مے گساراں رہ گئی۔ 'سنگم' کی اشاعت بند ہو جانے کے بعد ''داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی اک شمع'' کی صورت میں منیر نیازی رہ گئے تھے، انھیں اولمپک کی مشعل کے طور پر احمد صاحب نے اچک لیا اور ایک مراتھن دوڑ میں اب تک تھامے ہوئے ہیں۔

'آزاد ہند' کے دفتر میں کمروں کا نظام کچھ ایسا تھا کہ سیڑھیوں سے اوپر چڑھتے ہی سامنے کاتبوں کا کمرہ اور بائیں ہاتھ کو سعید صاحب کا کمرہ جس میں ان کی میز کے علاوہ منیجر کی اور ایک کلرک ٹائپسٹ کی میزیں بھی تھیں۔ سعید صاحب کی نشست کچھ ایسے زاوئے سے تھی کہ وہ ہر آنے جانے والے پر نظر رکھتے۔ ان کے اکاؤنٹنٹ کا کمرہ ان کے پیچھے تھا اس میں ایک بنگالی بابو مستقل مجاور کے طور پر ۲۴ گھنٹے موجود رہتے۔ مترجموں کا کمرہ کاتبوں کے کمرے کے عقب میں تھا چنانچہ ان حضرات کو سعید صاحب کی نگاہوں سے 'جو نیچی ہوتے ہوئے بھی پوری طرح باخبر رہتیں، اور پھر کاتبوں کے کمرے سے یعنی ہیڈ کاتب منشی نجم الدین صاحب کی غضب آلود نگاہوں کے سامنے سے گزرنا پڑتا۔ اگر کوئی اپنے معینہ وقت کے بعد تاخیر سے آتا تو صرف ان کی نگاہیں 'آزاد ہند' کے پورے مینجمنٹ کا پیغام نشر کر دیتیں۔ منشی جی بھی بنگالی بابو کی طرح کل وقتی تھے یعنی 'آزاد ہند' کا کاروبار شروع ہونے کے وقت سے اخبار کی کاپی جانے کے وقت تک نشستیں بدل بدل کر بیٹھے رہتے اور اس کے بعد وہیں بستر پھیلا دیتے۔

کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ منشی نجم الدین صاحب اور ان کے بھائی فہیم الدین صاحب مولانا ملیح آبادی کے 'روزانہ ہند' کے زمانے سے ان کے ساتھ تعاون کرتے آئے تھے چنانچہ وہ بھی 'آزاد ہند' کے ساتھ سعید صاحب کو ورثہ میں ملے۔ حقیقت یہ ہے کہ بڑے خلوص اور وفاداری کے ساتھ آخر عمر تک خدمات انجام دیتے رہے۔ معلوم نہیں کب اور کن حالات میں

انھوں نے ’آزاد ہند‘ سے مفارقت اختیار کی اور اپنے وطن گیا مراجعت کر گئے۔

جب میں نے ’آزاد ہند‘ میں قدم رکھا تو جاوید نہال نیوز ایڈیٹر تھے۔ ان کے علاوہ سید محمد مصطفیٰ صابری شمس الزماں، سجاد نظر وغیرہ موجود تھے۔ صابری صاحب کا تذکرہ ’عصرِ جدید‘ کے سلسلہ میں آچکا ہے۔ اب ان کی کیفیت میں فرق یہ آیا تھا کہ وہ بالکل بجھ گئے تھے ان کی بذلہ سنجی کافور ہوگئی تھی اس کی وجہ کسی حد تک تو بڑھتی ہوئی عمر تھی اور کچھ یہ کہ اخبار میں ان کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی تھی مجھے جمیل مظہری کا یہ جملہ اکثر یاد آتا ہے کہ ’جینے کے لیے تھوڑے سے غرور کی ضرورت ہوتی ہے‘۔ میں نے اس کا مطلب یہ نکالا ہے کہ کسی راہ میں بڑھنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کو اپنے اس کام یا پیشے پر فخر کا احساس ہو۔ اپنی زندگی کے متعدد تجربات میں میں نے اس اصول کو درست پایا۔ میں نے کئی طرح کے کام کیے، کئی طرح کی ملازمتیں کیں لیکن ان میں سے کسی کو لے کر آگے نہیں بڑھ سکا کیونکہ شاید میں ان میں سے کسی پر فخر نہیں کرسکا۔ صحافت نے مجھے جو کچھ بھی دیا لیا ہو لیکن ایک فخر کا احساس ضرور دیا۔ غالباً یہی وجہ تھی جو میں ساری مشقتوں کے باوجود اس ڈگر کو پکڑے رہا اور اس پر بڑھتا چلا گیا۔ صابری صاحب ’آزاد ہند‘ میں اس غرور سے محروم ہو گئے تھے۔ منشی نجم الدین صاحب بھی ان کو آنکھیں دکھا سکتے تھے۔ وہ کچھ عرصے تک ’آزاد ہند‘ کے اداریہ نگاروں میں شامل تھے، پھر یہ کام بھی ان سے لے لیا گیا۔

صحافت میں اساتذہ کا رول

اس سلسلے میں جاوید نہال صاحب کی شخصیت مثالی تھی۔ وہ گورنمنٹ کالجوں میں اردو کے استاد رہے، کلکتہ یونیورسٹی سے بھی وابستہ رہے۔ کئی ادبی کتب کے مصنف تھے اور ان وابستگیوں کے ساتھ ریٹائر ہوئے لیکن صحافت سے تا زندگی ریٹائر نہ ہوئے۔ جسے وہ اپنے پیشۂ معلّمی سے پہلے سے لیے چلے آرہے تھے۔ وہ ڈاکٹر اور پروفیسر جاوید نہال اور کبھی نہال حسن ہاشمی لکھے جاتے رہے۔ کلکتہ میں ایک مشکل یہ ہے کہ کسی کو لکچرر یا ریڈر نہیں لکھا جاتا۔ جو بھی کالج یا یونیورسٹی میں معلّمی اختیار کرتا ہے اس کے نام کے ساتھ پروفیسر کا سابقہ لگ جاتا ہے۔ میں نہیں

سمجھ سکا کہ یہ حضرات صرف ''ڈاکٹر'' لکھنا کافی کیوں نہیں سمجھتے یہ مسئلہ صرف علمی اخلاقیات کا ہے۔ پیشہ معلّمی سے وابستہ حضرات اس نکتے کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ کلکتہ کی اردو صحافت میں جاوید نہال واحد معلم نہ تھے ایسے دیگر اصحاب پہلے بھی موجود تھے اور اب بھی ہوں گے۔ مثال کے طور پر مظہر امام، قیصر شمیم، ظفر اوگانوی، راز عظیم، مطیع الرحمٰن، سجاد نظر وغیرہ۔ اردو صحافت سے اساتذہ کی وابستگی ایک ایسا موضوع ہے جو قدرے تفصیل کے ساتھ گفتگو کا متقاضی ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ روز اول سے ان دونوں پیشوں کے درمیان چولی دامن کا رشتہ رہا ہو۔ دونوں کا تعلق قلمدان سے ہے اور صحافت بھی ایک طرح کا تدریسی عمل ہے جو برائے بالغاں اور کسی قدر برائے خوش فکراں ہے۔ دوسری طرف اساتذہ کے پاس فرصت کے اوقات بہت کافی ہوتے ہیں۔ ان کے لیے فرصت اور مہلت اس لیے رکھی گئی تھی کہ زیادہ سے زیادہ مطالعہ فرما کر اس کا فائدہ طلبہ کو پہنچائیں لیکن استاد تو بہر حال استاد ہوتا ہے۔ ان میں سے کچھ حضرات نے اپنا فاضل وقت سیاست کے ذریعہ ملک وقوم کی خدمات کے لیے وقف کیا اور کچھ نے صحافت کی راہ پکڑی۔

یوں تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں تھا لیکن ہو گیا، وہ یوں کہ توجہات بنٹ گئیں سنجیدگی کے ساتھ پوری توجہ نہ طلبہ کی ذہنی پرورش پر صرف کی جاسکی نہ قارئین کی فکری مشاطگی پر۔ یہ بڑے خسارے کی صورت ہوئی۔ دوسری خرابی یہ ہوئی کہ جب صحافت ضابطہ بند ہونے لگی تو اساتذہ کی صورت میں جز وقتی کارکن مالکان اخبار کے ہاتھ میں ایک کارگر ٹرمپ کارڈ ثابت ہوئے۔ کل وقتی اخبار نویس یونہی فاقہ مست کسان کے مریل بیل کی طرح برائے نام چارے پر گذر بسر کر رہے، اس میں بھی بٹہ لگانے کے لیے جز وقتی کارکنوں کی خدمات حاصل کرلی گئیں جن سے کسی رقم پر بھی علی الحساب سمجھوتہ کیا جاسکتا تھا گویا مالکان اخبار کے لیے یہ نعمت غیر مترقبہ فن اور اس سے وابستہ افراد دونوں ہی کے لیے مضرت رساں تھی۔ حقیقت یہی تھی خواہ بطور افراد ان کی کچھ بھی مجبوریاں یا ترجیحات رہی ہوں۔

ایک زمانے میں جاوید نہال صاحب ہوگلی محسن کالج میں تھے۔ 'آزاد ہند' کا اداریہ

لکھتے تھے اور اسپورٹس رپورٹنگ کے لیے کھیلوں کو دیکھنے یا ان کی رپورٹیں لینے جایا کرتے تھے۔ میں واقعی حیران تھا کیوں کہ میں نے اداریہ نگاری کو ہمیشہ ایک مشکل کام سمجھا ہے جو بڑی توجہ، وسیع مطالعہ اور غور وفکر وقدرت تحریر کے ساتھ ساتھ سکون واحتیاط کا متقاضی ہوتا ہے۔ میں نے ایک بار جاوید نہال صاحب سے دریافت کیا کہ بھائی اڈیٹوریل لکھنے کے لیے آپ وقت کیسے نکالتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں دبی دبی ہنسی کے ساتھ کہا کہ ''بھائی وہ تو میں ہوگلی جاتے ہوئے ٹرین ہی میں لکھ لیتا ہوں۔'' میں اسے بھی کوئی معمولی بات نہیں سمجھتا۔

شمس الزماں صاحب ایک اور رفیق کار تھے وہ اپنی ہمہ جہت اور گونا گوں مصروفیتوں کی وجہ سے ایک چیستاں تھے۔ ان کی مصروفیات صحافتی ہونے کے علاوہ سیاسی، ثقافتی اور کسی حد تک کاروباری بھی تھیں، بہ ایں معنی کہ کلکتہ میں کسی تجارتی فرم کی نمائندگی بھی کرتے تھے۔ ان کی گونا گوں مصروفیتوں کا علم (کلکتہ میں اور پھر دہلی میں بھی) صرف انہی کو تھا۔ حلقۂ احباب میں شمس الزماں، شمس صاحب اور زماں صاحب کہلاتے تھے۔ دہلی میں مجتبیٰ حسین صاحب ان کو ملٹی پلگ کہتے تھے۔ طبعاً ترقی پسند تھے لیکن سرمایہ داروں سے بھی ان کی گہری چھنتی تھی۔ تنقید میں اس قدر بے لاگ اور بے باک کہ تنقیص کی حد تک جانے میں انھیں کوئی تکلف نہیں ہوتا۔ ایک طرف شاعروں اور ادیبوں سے اور دیگر فنکاروں سے ان کے رشتے استوار تھے تو دوسری طرف سیاستدانوں اور قانون سازوں سے ان کے تعلقات وسیع تھے۔ قلم سے زیادہ پلیٹ فارم کے کھلاڑی تھے جس شخص میں اتنے تنوعات ہوں اس کے متعلق سرسری حوالے بالکل ناکافی ہیں۔ مختصر یہ کہ میں جب ۱۹۷۵ء کے اواخر میں کلکتہ سے دہلی آیا تو شمس الزماں صاحب بھی اگلے ہی برس کے اوائل میں دہلی آ پہنچے اور اپنی گونا گوں مصروفیات کے ساتھ مستقل خرابی صحت کے باوجود آخر وقت تک سرگرمِ عمل رہے۔ وہ بھاگلپور، بہار کے رہنے والے تھے۔

سجاد نظر دیگر رفقائے کار میں شامل تھے۔ انھوں نے کلکتہ سے شائع ہونے والے تقریباً ہر اردو اخبار سے رشتہ جوڑا لیکن دل کسی سے نہیں لگایا۔ اس معاملے میں عجب ہرجائی واقع ہوئے ہیں لیکن انھوں نے پہلی وفاداری گھر میں اور دوسری وفاداری گھر سے باہر اسکول میں

خوب نبھائی، افسانہ نگاری سے بھی ڈھیلا ڈھیلا رشتہ قائم رکھا۔ ظالم باصلاحیت آدمی ہے لیکن اس نے اپنی صلاحیتوں کو پہچانا ہی نہیں۔ 'عصرِ جدید' میں میرے ساتھ کام کر چکے تھے۔ 'آزاد ہند' میں بھی شریکِ سفر ہوئے۔

راز عظیم نے بھی 'آزاد ہند' میں میرے ساتھ کام کیا۔ 'عصرِ جدید' میں تو میرے ساتھ تھے ہی، وہ بھی آدمی دھن کے پکے ہیں۔ اسکول میں پڑھاتے رہے، اخباروں میں کام کرتے رہے اور حصولِ اسناد کا سلسلہ بھی جاری رکھا یہاں تک کہ اردو میں پی ایچ ڈی کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کر لی۔ اس ضمن میں یہ اور مشتاق احمد تو جاوید نہال صاحب کے مقلد تھے۔ دیگر دو اصحاب جن کے ساتھ آنکھ مچولی ہوتی رہی یعنی وہ کبھی 'عصرِ جدید' میں رہے، کبھی 'آزاد ہند' میں وہ تھے نیاز اعظمی اور محمود ایوبی۔ میں ان دونوں کو اپنے عزیز کے طور پر سمجھتا رہا، جس کی کوئی خاص وجہ نہیں معلوم۔ اگر کوئی وجہ رہی ہوگی تو وہ خود ان حضرات کا میرے تئیں رویہ رہا ہوگا۔ ان دونوں نے آگے پیچھے کلکتہ کو خیر باد کہہ کر بمبئی کی راہ لی۔ ماہ و سال یاد نہیں لیکن غالباً نیاز اعظمی پہلے گئے۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی کلکتہ اور بمبئی کی صحافتی دنیا کے درمیان لین دین کا سلسلہ پہلے سے چلا آ رہا تھا۔ رئیس الدین فریدی، ابراہیم ہوش، رفیق عابدی صاحبان کی مثالیں ہیں ان کے بعد کی نسل کے بھی کئی صحافیوں اور کاتب حضرات سے بمبئی میں میری ملاقات ہوئی۔

نیاز اعظمی بمبئی کی صحافتی دنیا کے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے 'انقلاب' میں پہنچے اور وہاں نیوز ایڈیٹر ہوگئے لیکن ذاتی صدمات سے پیہم دوچار ہونے کے بعد ان پر فالج کا اثر ہوگیا اور وہ اپنی بقیہ زندگی کسی طور گزارنے کے لیے اپنے وطن ضلع اعظم گڑھ کے قصبہ دیدار گنج میں اپنے والدین کے پاس چلے گئے۔ وہ اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے۔ شبلی کالج اعظم گڑھ سے گریجویشن کے بعد کلکتہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا۔ ان کے والد خوشحال زمیندار تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ نیاز ملازمت کے چکر میں نہ پڑیں بلکہ ان کی املاک کو سنبھالیں لیکن نیاز اس سے جہاں تک بھاگ سکے بھاگے مگر بالآخر تقدیر نے انھیں مجبور کر کے والدین کی پناہ میں لا ڈالا۔ ایک بار میں فیملی کے ساتھ کلکتہ سے گھر آ رہا تھا، نیاز مجھے پہنچانے کے لیے

اسٹیشن آئے۔ میں نے انھیں ٹرین چھوٹنے تک ڈبے کے اندر باتوں میں لگائے رکھا۔ ٹرین چھوٹنے پر وہ بہت گھبرائے۔ قصہ یہ تھا کہ میرے چھوٹے بھائی بھی آنے والے تھے وہ اس وقت تک اسٹیشن پر نہیں پہنچے اور ان کا ٹکٹ میرے پاس تھا۔ خیر اگلی صبح کو جب ٹرین شاہ گنج پہنچی تو وہاں سے اگلا اسٹیشن دیدار گنج ان کا تھا۔ تب انھوں نے کہا کہ میرے پاس تو یکہ کے کرائے کے لیے بھی پیسے نہیں ہیں میں نے انھیں دس روپیہ اور بچوں کے لیے ایک پیکٹ ٹافی کا دیا۔ جب وہ اچانک گھر پہنچے تو ان کی بیوی کی حالت بہت خراب تھی اور ان کے والد انھیں لے کر کلکتہ کے لیے روانہ ہونے والے تھے۔ نیاز اپنی بیوی کو لے کر الٹے پاؤں کلکتہ واپس ہوئے اور اسٹیشن سے سیدھے اسلامیہ ہسپتال گئے وہاں ان کو داخل کرایا۔

ایک اخلاقی مسئلہ

جب پٹنہ کے اخبار 'سنگم' (کلکتہ) کے اجراء کے زمانے میں محمود ایوبی بمبئی سے آئے ہوئے تھے، میں 'آزاد ہند' میں آ چکا تھا۔ ہم لوگوں نے انھیں 'آزاد ہند' میں لانے کی کوشش کی، وہ سعید صاحب سے ملنے کے لیے آئے بھی لیکن کلکتہ کے اردو اخبارات کے مالکوں کے خلاف سخت تنفر اور اشتعال کے عالم میں سعید صاحب سے کچھ باتیں کر کے چلے گئے۔ غالباً وہ یہی کچھ سنانے کے لیے آئے تھے پھر بمبئی چلے گئے، جہاں اردو بلٹز کی اشاعت بند ہونے تک اس کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے۔ بمبئی میں متعدد بار ان سے ملاقاتیں رہیں اور وہ ہر طرح مطمئن معلوم ہوتے تھے۔

ایک بات ضمنی ہے لیکن قابلِ غور ہے اور یہاں اس کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ محمود ایوبی مسلمان مالکوں سے خاصے برہم اور نالاں تھے۔ وہ 'بلٹز' میں ملازمت کے دوران شدید طور پر بیمار ہوئے لیکن ان کے ساتھ جو حسنِ سلوک ہوا اس کے لیے وہ 'بلٹز' کے مالک مسٹر کرنجیا کے بالخصوص ممنون تھے اور اخبار کے مینجمنٹ اور شعبۂ ادارت کی عنایات اور ہمدردیوں کے لیے بالعموم ممنونیت کے احساسات رکھتے تھے۔ خود میرا تجربہ یہ تھا کہ 'عصرِ جدید' میں ملازمت کے دوران میری شدید علالت پر کسی طرح کی ہمدردی یا اعانت تو دور کی بات مجھے دھکا

دینے کا وہی موزوں ترین موقع سمجھا گیا۔اسی وقت یو ایس آئی ایس والوں نے، جہاں میری مستقل ملازم کی حیثیت بھی نہ تھی اور اس ادارے کی نوعیت ہر اعتبار سے مغائرت کی تھی، میری دلجوئی کی اور حوصلہ بڑھائے رکھنے کی کوشش کی۔۱۹۶۴ء کے فسادات کے دوران جب 'عصرِ جدید' والوں نے مجھے کرفیو پاس تک دینا مناسب نہیں سمجھا، یو ایس آئی ایس والے خیریت دریافت کرتے رہے ایک روز جب میں نے انھیں بتایا کہ کئی روز سے شکر نہیں مل رہی ہے تو انھوں نے آفس کی کینٹین سے شکر مہیا کی میں اکثر سوچتا ہوں کہ آخر ہمارا اخلاق کیا ہو؟ ہمارا کردار کہاں گیا؟ کیا ہمارا کام صرف دوستوں کی تنقیص اور خود ترحمی کے عالم میں ہاتھ پھیلائے رہنا رہ گیا ہے؟ آخر ہم کہاں جارہے ہیں؟

یہاں رئیس الدین فریدی صاحب کی خود نوشت سوانح حیات سے ایک اقتباس بھی برمحل معلوم ہوتا ہے۔فریدی صاحب دہلی، بمبئی اور حیدرآباد میں صحافتی تجربات کے بعد ۱۹۵۷ء میں کلکتہ آئے اور 'روزانہ ہند' کی ادارت پر فائز ہوئے۔ان کی سوانح حیات قسط وار 'آزاد ہند' میں شائع ہوئی۔وہ لکھتے ہیں:

''میں بمبئی، حیدرآباد اور دہلی کی اردو صحافت کا کڑوا مزہ چکھ چکا تھا اور یقین تھا کہ اردو صحافت کا ہر جگہ ایک ہی حال ہے۔خصوصاً اس صحافت کا جسے ہندوستان کی مسلم صحافت کہا جاتا ہے اور جس میں نہ کوئی قانون چلتا ہے، نہ ضابطۂ اخلاق...... بتا چکا ہوں کہ ہندوؤں کے اردو اخباروں کا یہ حال نہ تھا۔ چنانچہ حیدرآباد کے 'ملاپ' میں مالکوں کے سلوک کی طرف سے کوئی شکایت نہیں ہوتی تھی، ہاں بعض اوقات ان کے حسنِ سلوک پر حیرت ضرور ہوجاتی تھی۔ کسی زمانے میں اپنے متعلقین اور متوسلین سے حسنِ سلوک مسلمانوں کی خاص عادت سمجھا جاتا تھا مگر یہ خصوصیت بھی ہمارے ہاتھ سے نکل کر دوسروں کا طرۂ امتیاز ہوچکی ہے۔ اللہ رحم فرمائے۔'' (آزاد ہند، ۹/جون ۱۹۸۵ء)

منیر نیازی ان حضرات میں سے ہیں جن سے آگے چل کر 'آزاد ہند' میں سابقہ پڑا اور وہاں رہتے دم تک سابقہ رہا ان کا اصرار تھا کہ ان کے نام سے پہلے ''سید'' ضرور لگایا جائے

حالانکہ وہ اپنے رویے میں سعید صاحب سے کم خان صاحب نہیں معلوم ہوئے اور شاید اسی وجہ سے ان دونوں کی خوب نبھتی آ رہی ہے۔ یہ مدت نباہ بھی تین دہائیوں سے تجاوز کر گئی ہے۔ منیر نیازی 'سنگم' کے کلکتہ ایڈیشن میں کام کرنے کے لیے بنارس سے نہ معلوم کس طرح لائے گئے تھے۔ وہ وہاں روزنامہ 'آزاد' میں کام کرتے تھے۔ 'سنگم' بند ہوا تو میں نے سعید صاحب سے کہا کہ منیر نیازی کو 'آزاد ہند' میں بلا لیا جائے اور وہ بلا لیے گئے۔ پھر دسمبر ۱۹۷۵ء میں ان کو 'آزاد ہند' میں اپنا قائم مقام چھوڑ کر میں دہلی چلا آیا لیکن اس سے پہلے 'آزاد ہند' کے دورانِ قیام میں میری سرگزشت باقی ہے۔

سعید صاحب نے مجھے 'آزاد ہند' میں ملازمت کی نہیں ''ہم نشینی'' کی دعوت دی تھی۔ ان کا کہنا تھا ''آپ شام کو یہاں آ کر بیٹھا کریں ہم لوگ آپ کی صحبت سے لطف اندوز ہوں گے۔'' بس اتنی ہی بات ہوئی تھی اور میں کچھ دنوں کے اندر ہی اس دام ہمرنگ زمیں میں آ گیا اور کسی پلے ہوئے پنچھی کی طرح رہائی کے بعد پھر اڑ کر پنجرے پر آ بیٹھا۔ روز شام کو ۴ر بجے 'آزاد ہند' جانے لگا اور عموماً ۸ر بجے تک بیٹھتا۔ سعید صاحب نے اس نئی یار باشی کے لیے انہی حدوں کا تعین کیا تھا۔ اس نئی مصروفیت کا بلکہ اس سے زیادہ نئے ماحول کا جس میں لفظاً اور معناً آزادی کا اور کسی قدر ذہنی برابری کا احساس تھا صحت پر خوشگوار اثر ہوا اور بہتیری خرابیوں اور کمزوریوں کے باوجود نارمل طریقے سے کام کرنے لگا۔ یعنی صبح ۸ر بجے کے قریب یو ایس آئی ایس جاتا، دوپہر کو وہاں سے آ کر کھانے کے بعد آرام کرتا اور پھر شام کو ٹہلتا ہوا 'آزاد ہند' چلا جاتا۔

رئیس احمد جعفری نے عرصہ دراز تک 'آزاد ہند' میں نیوز ایڈیٹنگ کے فرائض انجام دیے لیکن میرے وہاں پہنچنے سے پہلے دوسری بار 'آزاد ہند' سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ ایک عرصے تک 'عصرِ جدید' میں بھی میرے ہمسفر رہ چکے تھے۔ وہ اپنے وطن الٰہ آباد سے کلکتہ آئے اور ۱۹۵۰ء میں صحافت کے میدان میں قدم رکھا۔ اس کی ابتدا انھوں نے 'عصرِ جدید' سے کی۔ ۱۹۸۸ء میں 'آبشار' کے احیاء یا اشاعتِ نو شروع ہونے کے بعد سے رئیس صاحب اس کے

ایگزیکیوٹیو ایڈیٹر یا اس کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں اور اپنی شدید علالت کے باوجود اس میں منہمک ہیں۔ غالباً رئیس جعفری اس وقت کلکتہ کے سب سے سینئر صحافی ہیں۔ انھوں نے دیگر صحافیوں کی طرح ابتدا تو ترجمے سے کی لیکن آگے چل کر اس میدان میں ہر فن کی داد دی۔ مگر میں اس طرح کے صحافیوں کو شہدائے صحافت کہتا ہوں جو سب کچھ قربان کر کے بھی کچھ نہیں پاتے، حق المحنت صرف چائے کے خرچ بھر ملتا ہے جس پر انھیں زندگی کے سارے جتن کرنے ہوتے ہیں اور پھر رئیس صاحب کا تو سب سے بڑا خرچ سگریٹ کا رہا ہوگا اس کے بعد چائے کا۔ میں نے جن ساتھیوں کے ترجمے کا جائزہ لینے کی کوشش کی ان میں سب سے سدھا ہوا، سیدھا سادہ ترجمہ رئیس صاحب کا سمجھ میں آیا۔ اس کیفیت کو صرف سمجھا جا سکتا ہے یا دوسروں سے موازنے کی مدد سے سمجھایا جا سکتا ہے۔ مثلاً انگریزی میں جو پیچیدہ جملے ہوتے ہیں یا ماضی میں لکھے جاتے ہیں ان کا ترجمہ بسنت کمار چٹرجی من وعن اسی ترتیب سے ایک سانس میں کر ڈالتے۔ اس میں مروجہ زبان ذرا پٹری سے اتری ہوئی معلوم ہوتی لیکن گرامر یا معنی و مفہوم کی غلطی کا احتمال نہیں ہوتا۔ حامد محمود نیازی کا فن یہ تھا کہ پیچیدہ سے پیچیدہ جملے کا بھی آناً فاناً تیا پانچہ کر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹ دیتے پھر عبارت پڑھنے اور سننے میں بھلی لگتی، ساری الجھن اور جھنجھٹ سے پاک عبارت۔ رئیس جعفری متن کی ڈور پکڑے ہوئے ایک رواں زبان لکھتے جاتے ہیں جیسے نصف صدی سے زیادہ عرصے سے صحافت کی ڈور پکڑے چلے جا رہے ہیں۔ ۱۹۶۵ء کی ہند پاک جنگ کے دوران بہتیرے اردو اخبار نویس گرفتار ہوئے تھے ان میں رئیس جعفری بھی شامل تھے کیونکہ رات کو جب اخبار کے دفتر پر پولیس نے چھاپا مارا تو وہی پکڑ میں آئے احمد سعید صاحب تو ہتھے نہیں چڑھے۔

جب میں 'آزاد ہند' میں پہنچا تو رئیس جعفری وہاں سے جا چکے تھے اور جاوید نہال نیوز ایڈیٹنگ کر رہے تھے اور کسی کسی دن اداریہ بھی لکھتے تھے۔ کچھ دنوں بعد شام کی نیوز ایڈیٹنگ میرے ذمہ آ گئی۔ آگے چل کر کسی کسی دن فیچر بھی لکھنے لگا۔ غالباً اسی سے سعید صاحب کو اندازہ ہوا کہ میں اداریہ لکھنے کا بھی اہل ہوں، اور اس فرض میں انھوں نے مجھے اپنا شریک بنا لیا۔ اس

کے بعد وہ مرحلہ آیا جہاں سعید صاحب اپنی بات سے پھر گئے، یعنی ''یار باشی'' کو تو ہم لوگ پہلے ہی طاق پر رکھ چکے تھے، اب نئی بات یہ ہوئی کہ موصوف نے ذمہ داریوں کا طوق میرے گلے میں ڈالا اور خود عازمِ بیت اللہ ہوئے۔ یہ ان کا دوسرا حج تھا۔

بنگلہ دیش کی تحریک

ابھی سعید صاحب اسی طرف تھے کہ بنگلہ دیش کی تحریک نے شدت اختیار کر لی۔ پہلے بنگالیوں پر پنجابیوں کے مظالم پھر بہاریوں پر مکتی باہنی اور ان کے حواریوں کی انسانیت سوز چیرہ دستیوں کی داستانیں تاریخ کے صفحات پر ثبت کی گئیں اور نوبت ہندوستانی افواج کی مداخلت تک پہنچی جو سقوط ڈھاکہ پر منتج ہوئی۔ اس تمام عرصے میں سارا بنگال، بالخصوص کلکتہ پریس، ایک نا قابلِ بیان تہلکے سے دوچار تھا۔ سعید صاحب نے حج سے واپسی کے بعد کچھ روز اپنے وطن ملیح آباد میں آرام و قیام ضروری سمجھا اس دوران ہم لوگوں کو 'آزاد ہند' میں سارے نشیب و فراز سے گزرنا پڑا۔

ہم لوگوں کو کئی مشکلوں اور نزاکتوں کا سامنا تھا۔ سابق مشرقی پاکستان سے شائع ہونے والے اردو اخبارات بند ہو چکے تھے۔ ہم لوگوں کو معلوم تھا کہ دیر سویر 'آزاد ہند' کی چند کاپیاں ڈھاکہ تک پہنچ جاتی ہیں، اس لیے وہاں کے اردو خوانوں کا لحاظ رکھنا پھر اپنے ملک کی پالیسیوں کا پاس اور بنگال کی عمومی فضا کا لحاظ رکھنا ضروری تھا تاہم کھلے عام مظالم سے چشم پوشی بھی نہیں کی جا سکتی تھی غرضیکہ سخت امتحان تھا جس سے ہم لوگ گزر گئے۔ اردو دنیا والے پھر بھی اپنے خول میں گم تھے مگر مجھے یو ایس آئی ایس سے وابستگی کی بنا پر ہر روز بیرونی دنیا کا سامنا تھا جہاں ہندوستانی مسلمانوں کو بالعموم پاکستان کا طرفدار سمجھا جاتا تھا اور پاکستان کی شکست کو ان کی شکست کے مترادف سمجھا گیا۔ خود مسلمان احساسِ جرم کی نفسیات میں مبتلا تھا۔

ذاتی طور پر یو ایس آئی ایس سے میری وابستگی کا ایک مطلب اور بھی تھا۔ بنگلہ دیش کی جدوجہد کے دوران امریکہ نے پاکستان کی کوئی خاص مدد تو نہیں کی لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ ہندوستان ایک خاص حد سے تجاوز کرے چنانچہ جب جنگ کا مغربی محاذ گرم ہوا تو امریکہ

نے جنگ بندی کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ غالباً اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ نوزائیدہ بنگلہ دیش پر ہندوستانی افواج کا غلبہ نہ ہونے دیا جائے اور وہ فوجیں اپنی کارروائی کے بعد ہندوستان واپس چلی جائیں۔ عین اس وقت بحرالکاہل میں موجود امریکہ کے ساتویں بحری بیڑے کا فلیگ شپ خلیج بنگال میں بھی آ گیا۔ اس واقعہ کو ہندوستانی پریس نے خوب خوب اچھالا۔ اس کیفیت نے ہندوستانیوں کی نظر میں امریکہ کو قابلِ مذمت بنادیا تھا اور امریکی اداروں سے وابستگان کی حالت خراب تھی خصوصاً بنگال میں۔ مسلمان ہندوستان کی بہی خواہی اور وفاداری کے اظہار کے لیے امریکہ کو گالی گفتہ دینے میں زیادہ ہی آگے آگے تھے۔

اس ضمن میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ بڑی طاقتوں نے بین الاقوامی سمندروں کا آپس میں جو بٹوارہ کر رکھا تھا اور اپنا اپنا حلقہ بنا رکھا تھا اس کے مطابق بحرِ ہند کا بین الاقوامی سمندر برطانیہ کے زیرِ اثر تھا لیکن ایشیا اور افریقہ میں برطانوی نوآبادیوں کے خاتمے کے ساتھ ساتھ برطانیہ کی اقتصادی طاقت کم ہوتی جارہی تھی اور اس خطے سے اس کی دلچسپیاں بھی کم ہو رہی تھیں، چنانچہ ۱۹۶۰ء کے عشرے کے اواخر میں برطانیہ نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ سنگاپور سے اپنا بحری مستقر اور اس علاقے میں اپنا بحری بیڑہ جو بحرِ ہند کی نگرانی پر مامور تھا ہٹا رہا ہے اور اب مشرق میں اس کے بحریہ کی کارگزاریاں بحیرہ روم میں سوئز تک محدود رہیں گی۔ اس طرح بحر ہند کے علاقے میں ایک بہت بڑا فوجی خلا پیدا ہوا تھا جس کو پُر کرنے کے لیے بڑی طاقتوں میں سے امریکہ اور روس رہ گئے تھے۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی اس علاقے کو ہندوستان کے زیرِ اثر چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھا۔

اسی حقیقت کے پیشِ نظر میں نے اس وقت 'آزاد ہند' میں ایک طویل مضمون میں لکھا تھا کہ بنگلہ دیش کی جدوجہد کے نتیجے میں ہندوستان کا کوئی فائدہ نہیں ہونے والا ہے کیونکہ بحرِ ہند میں پیدا شدہ خلا کو پُر کرنے کے لیے دو بڑی طاقتوں کا دوڑنا زبردست طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ اس خطے میں موسمیاتی طوفان بھی اسی طرح آتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ایک نیا ملک بن جانے کے بعد ہندوستان کو ایک کے بجائے دو غیر دوست پڑوسیوں سے نپٹنا ہوگا اس لیے کہ

قوموں کے تعلقات ان کے مفادات پر مبنی ہوتے ہیں نہ کہ نیک خواہشات اور وقتی سیاسی مصالح پر، چنانچہ چند دریائی جزیروں کی ملکیت اور دریائی پانی کی تقسیم کے سوال پر ہندوستان اور بنگلہ دیش کے اختلافات جاری رہے۔ پورے برِصغیر میں اس تاریخی واقعہ یعنی تشکیل بنگلہ دیش کا طرح طرح سے ردِعمل ہوا یہ سب تاریخ کا حصہ ہے۔ بہ سبب قربت وقرابت کلکتہ بہت زیادہ متاثر ہوا۔ مسلمانوں کے لیے بڑا صبر آزما وقت تھا، جو ۱۹۶۵ء میں ہند پاک جنگ کے دوران سخت صدمے اور حکومت کے اہانت آمیز اور ناعاقبت اندیشانہ رویے کی وجہ سے بڑے عذاب سے گزر چکے تھے۔ پھر وہی اندیشے کابوس بن کر ان کے سینے پر سوار تھے۔

لیکن اس بار مغربی بنگال میں بائیں بازو کی حکومت نے یقیناً سوجھ بوجھ سے کام لیا۔ ۱۹۶۵ء میں مغربی بنگال کی کانگریسی حکومت نے مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس کی سزا اس کو دو ہی برس بعد عام انتخابات میں ایسی ملی کہ اس ریاست میں وہ پارٹی اقتدار سے بالکل ہی محروم کردی گئی۔ الیکشن کے قریب پارٹی لیڈروں میں مسلمان ووٹروں سے نظر ملانے کی جرأت نہیں تھی خود پارٹی ورکر اپنے لیڈروں سے علی الاعلان سوال کررہے تھے کہ آپ نے ہمارے ساتھ جو سلوک روا رکھا اس کا کیا جواز تھا۔ ایسے کتنے ہی مسلمان جو پارٹی کے سرگرم کارکن تھے بلا کسی الزام، بلا مقدمہ چلائے اور بلا فرد جرم لگائے مہینوں علی پور جیل میں سڑتے رہے تھے۔ لیکن ۷۱-۱۹۷۰ء میں برسرِ اقتدار کمیونسٹوں نے ایسی حماقتیں نہیں کیں تاہم اندیشے حقیقی تھے۔

مسلمانوں کی سراسیمگی:

بہرحال کلکتہ کا مسلمان سراسیمہ تو تھا ہی ایک عجیب کرب میں مبتلا تھا جسے نہ دکھا سکتا تھا نہ چھپا سکتا تھا۔ بہار کے مختلف اضلاع سے آنے والے مسلمانوں کی کلکتہ میں اچھی خاصی آبادی ہے جن میں سے بیشتر ایسے ہوں گے جن کے دور نزدیک کے اقارب سابق مشرقی پاکستان میں رہے ہوں گے۔ بنگلہ دیش کی تحریک کے دوران مکتی باہنی کے ہاتھوں ان پر جو عذاب آیا اس کی وجہ سے کچھ لوگ بھاگ کر اس پار آنے میں بھی کامیاب ہوگئے تھے اور وہ کلکتہ میں اپنے عزیزوں کو تلاش کرکے پناہ لینے کی کوشش کررہے تھے۔ کچھ دم لے کر آگے بڑھ جاتے

مقدر جہاں لے گیا ہو، کچھ بہار کے مختلف علاقوں میں گئے ہوں گے کچھ نیپال کے سرحدی علاقوں میں داخل ہوکر پاکستان کی راہ پکڑنے میں کامیاب ہوئے ہوں گے۔ اس راہ جان گسل میں کتنے کام آئے ان کا شمار کسی کو نہیں معلوم۔

کلکتہ کے مسلمانوں کے لیے ایسے عزیزوں کو پناہ دینا بھی مشکل تھا اور وہ اپنے لا پتہ عزیزوں کے غم میں بھی گھلے جا رہے تھے۔ ان کے اس دکھ کو اغیار نے پاکستان کی طرفداری اور اس کی شکست پر پشیمانی سے تعبیر کیا۔ مسلمانوں کی نظریں بالعموم اس طرح جھکی ہوئی تھیں گویا مشرقی پاکستان میں پاکستانی افواج کے مظالم کے ذمہ دار وہی تھے اور شکست کا کلنک انہی کا حق ہے۔ بنگالی ہندوؤں کا مشتعل ہونا بھی فطری تھا کیونکہ بنگلہ دیش سے آنے والے ہندو بنگالیوں کا تانتا بندھا ہوا تھا، وہ اپنی پریشانیوں کی داستانیں سناتے اور بنگلہ اخبارات اس میں نمک مرچ لگا کر چھاپتے۔ کوئی یہ نہیں کہتا تھا کہ یہ عذاب تو وہاں ہندو مسلمان، بنگالی غیر بنگالی سب پر گزرا ہے۔ ہاں ہماری سرحد کے اندر یہ امتیاز ضرور تھا کہ جو ہندو آرہے تھے وہ رفیوجی تھے اور سرکاری مشنری کی امداد و اعانت اور عوام کی ہمدردیوں کے مستحق تھے لیکن جو مسلمان نظر آیا وہ معتوب و مردود اور اس کی کم سے کم سزا یہ تھی کہ اس کو اسی جہنم میں واپس ڈھکیل دیا جائے۔

اس دوران مغربی بنگال میں مسلمانوں کی عام پکڑ دھکڑ تو کم ہوئی تاہم کئی لوگ بلا کسی فرد جرم یا مقدمے کے لمبے عرصے تک نظر بند رہے۔ ان میں سب سے برا حال ادریس الحق کا ہوا جو تقریباً دو سال نظر بند رہے۔ بالآخر جب چھوٹ کر آئے تو دق کے مرض میں مبتلا ہو چکے تھے اور اسی مرض میں جاں بحق ہوئے۔

ادریس الحق پر افسوس ہے کہ ایک رپورٹر کی حیثیت سے ان کا بڑا تکلیف دہ انجام ہوا۔ ظاہر ہے کہ رپورٹر کو تو اپنے فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں ہر جگہ خواہی نخواہی جانا پڑتا ہے۔ اچھی رپورٹنگ پر واہ واہ ہو جاتی ہے۔ اردو اخباروں میں کسی طرح کی حوصلہ افزائی کی روایت نہ تب تھی، نہ اب ہے ہاں کسی لغزش پر بدخواہوں کو نقصان پہنچانے کا اچھا موقع ہاتھ آتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ادریس الحق کے ساتھ ایسا ہی کچھ ہوا۔ وہ پاکستان سے متعلق خبریں

حاصل کرنے کے لیے کلکتہ میں پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمیشن جایا کرتے تھے۔ جو لوگ سفارت خانوں کی کارکردگی سے واقف ہیں ان کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ اخبار نویسوں سے اچھے تعلقات رکھنا سفارت کاروں کی بہت بڑی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ رابطہ عامہ کا کام انہی کی معرفت ممکن ہوتا ہے۔ ان لوگوں کی معمول کے مطابق کارگزاریوں سے بھی سفارت کار اپنے مقاصد کے تحت معلومات حاصل کرلیں اور انھیں استعمال کریں تو عام حالات میں کسی کو اس کی پرواہ نہیں ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ادریس الحق ایک احتیاط کرتے تھے کہ ہندوستان اسٹینڈرڈ کے کسی بنگالی رپورٹر کے ساتھ ہی وہاں جایا کرتے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ رپورٹر اپنی سہولت کے لیے ادریس الحق کو ساتھ لے جاتا رہا ہو۔ پاکستان کی شکست و ریخت کے بعد جب بنگلہ دیش وجود میں آیا تو کلکتہ میں پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر علی حسن نے جو بنگالی تھے بنگلہ دیش سے وفاداری کا اعلان کرتے ہوئے اپنے دفتر کو بنگلہ دیش کا سفارت خانہ بنادیا۔ سب جانتے ہیں کہ کلکتہ میں مسلمانوں کی پکڑ دھکڑ عام بات تھی پاکستان سے لڑائیوں کے دوران تو راتوں رات ہزاروں مسلمانوں کی گرفتاریاں ہوئیں لیکن بنگلہ دیش کی جنگ کے زمانے میں اس طرح کی گرفتاریاں نسبتاً کم ہوئیں۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ سابقہ کانگریسی حکومتوں نے جو زیادتیاں اور ناعاقبت اندیشیاں کی تھیں اس کی انھیں قرار واقعی سزا ملی تھی، غیر کانگریسی حکومت کو اس کا خوب اچھی طرح احساس تھا تاہم جو لوگ گرفتار ہوئے ان میں ادریس الحق بھی شامل تھے۔ میں نے جرنلسٹس ایسوسی ایشن سے کئی بار گزارش کی کہ ادریس الحق کی رہائی کے لیے کچھ کریں لیکن ان کا ایک ہی جواب تھا کہ ہم اس طرف سے غافل نہیں ہیں لیکن کامیابی نہیں ہورہی ہے۔ غرضیکہ تقریباً دو برس بعد ان کی رہائی ہوئی۔ اس وقت ان کی صحت بہت خراب ہوچکی تھی۔ ان کی بیوی کسی اسکول میں ٹیچر تھیں۔ ایک بچی کو لے کر وہ گھر میں تنہا نہیں رہ سکتی تھیں اس لیے وہ اپنے بھائی کے گھر چلی گئیں پھر ان کے گھر کا سارا سامان بھی لٹ گیا۔ رہائی کے بعد ایک عرصے تک ادریس الحق نے کسی سے ملاقات نہیں کی لیکن ۱۹۷۵ء میں جب ان کو معلوم ہوا کہ میں دہلی جانے والا ہوں تو انھوں نے مجھ سے ملاقات کی اور بتایا کہ نظر بندی کے دوران ایذاؤں کی وجہ

سے ان کی صحت کو بھی بہت نقصان پہنچا۔نظر بندی کی وجہ، ان کے بیان کے مطابق، خان بہادر صاحب کی ناراضگی تھی کیونکہ وہ انھیں پاکستان کا ویزا دلانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ چونکہ وہ کٹر کانگریسی اور اتنے ہی کٹر مسلم لیگ مخالف سمجھے جاتے تھے اس لیے حکومت پاکستان ان کو ویزا دینے کے لیے کسی طرح تیار نہ ہوئی۔

لیکن ادریس الحق کے نام پر خط تنسیخ بہت پہلے کھینچا جا چکا تھا۔ اس کے بعد ان کا جانا صرف وقت اور موقع کی بات تھی۔ واقعہ یوں ہوا کہ میرے 'آزاد ہند' میں چلے جانے کے کچھ ہی دنوں بعد ایک روز سخت بارش ہو رہی تھی جس کا سلسلہ کئی دن سے جاری تھا دوپہر کو خان بہادر صاحب حسبِ معمول اپنے چیمبر سے اٹھے اور ظہر کی نماز کے لیے مسجد چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد قاضی اقبال صاحب بھی 'عصرِ جدید' کے دفتر آ گئے۔ دفتر کے دیگر اہل کار بھی نماز اور لنچ کے لیے چلے گئے دفتر بالکل خالی تھا۔ پس یکا یک وہ سارے کا سارا دفتر دھڑام سے سڑک پر الٹ گیا۔ دفتر کا فرنیچر، کاغذات اور جملہ سامان کولوٹولہ اسٹریٹ (موجودہ مولانا شوکت علی روڈ) پر بکھر گیا۔ عمارت کے ملبے اور موسلا دھار بارش کی وجہ سے سب کیچڑ پانی میں لت پت ہو گیا۔ بڑی مشکل سے وہ سب 'عصرِ جدید' کی عمارت میں منتقل کیا گیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ۸۰ رنمبر کولوٹولہ اسٹریٹ کی وہ عمارت جس میں خان بہادر صاحب کا سکریٹریٹ تھا بہت بڑی تھی۔ زیریں منزل میں چھوٹی بڑی بہت ساری دکانیں تھیں۔ بالائی منزل دو حصوں میں منقسم تھی۔ ایک حصے میں اس عمارت کے مالک کے لواحقین رہتے تھے اور دوسرے حصے میں وہ دفتر تھا۔ اس روز ایسا معلوم ہوا کہ بس اسی دفتر والے نصف حصے کو کسی نے اٹھا کر سڑک پر پھینک دیا۔ بقیہ عمارت کو کہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا وہ اب تک موجود ہے۔

ظاہر ہے اتنے بڑے واقعے کا اس علاقے میں چرچا تھا۔ شام کو ادریس الحق حسبِ معمول اپنی رپورٹ دینے کے لیے آئے تو اس موضوع پر گفتگو جاری تھی۔ ادریس الحق نے کہیں کہہ دیا کہ رضوان صاحب کو نکال دیا گیا ہے، انہی کا صبر پڑا ہے۔ ایسے حالات میں لوگ عموماً اس طرح کی باتیں کیا کرتے ہیں لیکن جس پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اسے تو سن کر نا گواری ہوتی

ہی ہے۔ چنانچہ ادریس الحق کی یہ بدکلامی نوٹ کی گئی اور اس ناپسندیدہ شخص کو باہر کا راستہ دکھانے کے لیے صرف مناسب وقت اور موقع کا انتظار تھا جو بالآخر مل ہی گیا۔

جنگ کے اثرات:

انجام کار اس جنگ کے جو اثرات ہندوستانی مسلمانوں پر مرتب ہوئے ان کا ایک مختصر جائزہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔لگتا تھا کہ پاکستان کی شکست کے ساتھ ہی شمالی ہند کے خصوصاً مغربی بنگال اور بہار کے مسلمانوں کی بھی شکست ہوگئی ہے۔اس کی کئی وجہیں تھیں۔ دراصل یہ اس نظریہ کی شکست تھی جو تشکیلِ پاکستان کی اساس تھا یعنی مذہبی سیاست اور دوقومی نظریہ۔ یہ شکست اس حقیقت کی بھی ایک دلیل تھی کہ برصغیر میں لسانی تعصّبات مذہب سے زیادہ طاقتور ہیں۔اس سے بہت پہلے ۱۹۵۶ء میں ہندوستان میں لسانی صوبوں کی تشکیل کے اصول کو تسلیم کیے جانے ہی سے یہ بات ثابت ہوچکی تھی۔ بہار اور بنگال کے بیشمار خاندان سرحدوں کے دونوں جانب بٹے ہوئے تھے اس لیے ہندوستان کے لوگوں کا مشرقی پاکستان یا نوزائیدہ بنگلہ دیش میں اپنے عزیزوں کے جان و مال کے متعلق فکرمند ہونا بھی فطری بات تھی لیکن اس سے بھی بڑھ کر وہ زخم تھا جو دوسروں کی نظرِ تحقیر کے تیروں سے لگ رہا تھا جس نے ان مسلمانوں کو بھی ٹیس میں مبتلا کر دیا تھا جنھیں نہ پاکستان سے نظریاتی اتفاق تھا نہ وہاں کے لوگوں سے ان کی کوئی منفعت وابستہ تھی۔ ہندوستان میں ایک سال تک ۹۲ ہزار پاکستانی فوجیوں کی نظر بندی کی وجہ سے یہ زخم عرصہ دراز تک تازہ رہا اور یہ ایسے وقت میں ہوا جب ہندوستانی مسلم نوجوانوں نے احساسِ کمتری کے خول سے نکلنے کی کوشش شروع ہی کی تھی۔ مقابلے کے امتحانوں میں شریک ہونے لگے تھے اور نئی راہوں کی تلاش میں ہاتھ پاؤں مارنے لگے تھے۔اس سانحہ سے انھیں ایک اور جھٹکا لگا۔

مثبت پہلو:

لیکن بنگلہ دیش بن جانے کا ایک مثبت اور دوررس نتیجہ بھی ہوا۔شمالی ہند کے وہ لائق

اور باصلاحیت مسلم نوجوان جو تلاشِ معاش میں دور دور تک جاسکتے تھے بنگال میں نسبتاً نرم بین الاقوامی سرحدیں پار کر کے مشرقی پاکستان میں داخل ہوجایا کرتے تھے اور وہاں سے مغربی پاکستان بھی چلے جایا کرتے تھے، انھوں نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ یہ راستہ بند ہوگیا، اب جو کچھ کرنا ہے یا جو کچھ ہونا ہے ہندوستان ہی میں ہونا ہے۔ اس طرح ان کا ذہن یکسو ہوگیا۔ غالباً اوسط درجے کے مسلمان سرمایہ دار بھی جو تذبذب کا شکار تھے، مستقبل کو سمجھنے سے قاصر تھے، سرمایہ لگانے سے عاری تھے، انھوں نے بھی سمجھ لیا کہ اب یہیں کچھ نہ کچھ کرنے کے سوا کوئی اور چارہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے جب سرمایہ اور محنت دونوں کو یہ احساس ہوگیا کہ ہمارا میدانِ عمل وہیں ہے جہاں ہم ہیں تو آنے والے دنوں، مہینوں اور برسوں میں وہ اسی راہ پر گامزن ہوگئے۔ اسے ایک صحت منداور حوصلہ افزا صورتِ حال سمجھنا چاہیے۔

مختصر یہ کہ بنگلہ دیش کی تشکیل نے ہندوستانی مسلمانوں کی آنکھوں کے سامنے کئی فیصلے کر دیے۔ مذہب قومیت کی بنیاد نہیں بن سکتا، ہندوستانی مسلمان جہاں ہے وہیں اس کو مرنا جینا ہے۔ چنانچہ وہ اڑوس پڑوس میں جھانکنے سے تائب ہوئے، جو کچھ اثاثہ بچا تھا یا باہر سے جو کچھ کما کر لائے اس کو کارآمد بنانے لگے۔ بنگلہ دیش بن جانے کے بعد ہندوستان میں اردو اخباروں کی حالت بہتر ہوگئی، ان کی تعداد بڑھی، اشاعت بڑھی اور اخباروں کے علاوہ بہتیرے مسلم ادارے ملک کے مختلف علاقوں میں قائم ہونے لگے بہ الفاظِ دیگر ہندوستانی مسلمانوں میں ایک نیا اعتماد پیدا ہوا۔

بنگلہ دیش کے پورے ہنگامے سے میں ذاتی طور پر متاثر نہیں ہوا تھا لیکن ایک ناکردہ گناہ کی ندامت بنگالی ساتھیوں اور دوستوں سے نظر برابر نہیں ہونے دیتی تھی، حالانکہ ان میں سے بیشتر اپنی دلی شادمانی کا، جو ان کے چہروں سے چھلکی پڑتی تھی، میرے سامنے کوئی خاص اظہار نہیں کرتے تھے۔ مجھے اس کی بھی گرانی محسوس ہوتی تھی کہ آخر یہ لوگ مجھے ہندوستانی کیوں نہیں سمجھتے، صرف مسلمان یا اردو والا ہی کیوں سمجھتے ہیں حالانکہ اس برصغر کی حالیہ تاریخ میں یہ کوئی نئی بات نہیں ہوئی تھی۔ ترکی میں خلافت کے خاتمے پر ہندوستانی مسلمان شعلہ صفت ہوگیا

تھا اور اس کے اس احساس میں کانگریس کے زیر اثر سارا ملک شریک ہو گیا، نہر سوئز پر بمباری اور اسرائیل کے ہاتھوں عربوں کی شکست پر اس برصغیر کے مسلمانوں کا ویسا ہی ردِعمل ہوا۔ ابھی عراق کی شکست پر بھی عام مسلمانوں کا ردِعمل ساری دنیا نے دیکھا اور یہ بھی دیکھا ہوگا کہ عراق ہی کے ہم مذہب اور ہم نسل مظلوم پڑوسی کویت کی مظلومیت پر انہی مسلمانوں نے آنکھیں بند کر لیں جس طرح بنگلہ دیش کی تشکیل سے پہلے اس خطے میں پاکستانی فوجیوں کے استحصال کی طرف سے آنکھیں موند لی تھیں۔ اب یہ سارے واقعات تاریخ کا حصہ ہیں لیکن ان کا سنجیدگی کے ساتھ تجزیہ کیا جانا چاہیے۔

اس کے بعد میرے چند برس بلا کسی خاص وقوعہ کے گزرتے رہے 'آزاد ہند' میں منیر نیازی آ گئے تو ان کی وجہ سے کام کا بوجھ ہلکا ہو گیا اور شمس الزماں اور جاوید نہال جیسے ساتھیوں کی موجودگی میں کام کی فضا بھی خوشگوار ہو گئی۔ ہاں یہ کارواں قدرے سست خرامی سے ۱۹۷۴ء میں داخل ہوا تو نئے فتنوں نے انگڑائی لی۔

نئے فتنے:

۱۹۷۴ء کی بات ہے ایک دن کھانا کھا کر لیٹا ہی تھا کہ پانچ چھ کاتب وارد ہوئے جن کی قیادت عبدالغفار صاحب کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہم لوگوں کے مطالبات کے معاملے میں مالکوں کا رویہ سخت ہے اور وہ تنخواہوں میں کسی اضافے کے لیے تیار نہیں ہیں (یہی واحد مطالبہ تھا) چنانچہ اب ہم لوگ ہڑتال کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے ان لوگوں کی اس رائے سے اختلاف کیا اور کہا کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا، اس سے کچھ لوگوں کو نقصان ہی کا اندیشہ ہے۔ لیکن وہ لوگ بھی قطعی فیصلہ کر کے آئے تھے۔ میں اس سال جرنلسٹس ایسوسی ایشن کی ایکزیکیٹو کمیٹی میں شامل تھا چنانچہ یہ لوگ میری وساطت سے ایسوسی ایشن کی پشت پناہی بھی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ میرے اختلاف رائے کے بعد یہ لوگ چلے گئے اور مکمل خاموشی اختیار کر لی۔ میں نے بھی سمجھا کہ وہ وقتی تحریک رہی ہوگی دب گئی۔ اس طرح کچھ دن گزر گئے۔

ایک روز شام کو چار بجے میں حسبِ معمول کام پر 'آزاد ہند' پہنچا اور اپنے کمرے میں

چلا گیا تو منیر نیازی موجود تھے لیکن کچھ غیر معمولی سناٹا معلوم ہوا۔ جو کاتب اس وقت موجود ہوا کرتے تھے وہ نہیں تھے اور ہیڈ کاتب منشی نجم الدین صاحب، دفتر کے مجاور، سراپا سوالیہ نشان بنے ہوئے بیٹھے تھے اور اپنی موٹے شیشے والی عینک سے ہم لوگوں کو گھورے چلے جا رہے تھے۔ میں نے منیر نیازی سے دریافت کیا کہ آج یہ کیا معاملہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ سعید صاحب کہتے ہیں کہ کاتبوں نے ہڑتال کر دی ہے، وہ بھی کلکتہ کے سارے اردو اخباروں میں۔ اس کے بعد میں سعید صاحب کے کمرے میں گیا جو غیر معمولی طور پر بے وقت موجود تھے۔ انھوں نے ہڑتال کی خبر کی تصدیق کی۔

لیکن بعد کے واقعات سے پتہ چلا کہ سعید صاحب مجھ ہی کو اس تحریک کا لیڈر سمجھ رہے تھے یا ان کو بدظن کرنے کے لیے 'عصرِ جدید' والوں نے ان کے ذہن میں یہ گمان راسخ کر دیا تھا۔ میں نے ان سے جو ہڑتال کے بارے میں دریافت کیا تو اس کو انھوں نے میری چالاکی یا منافقت پر محمول کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ سعید صاحب ایسے ہوشیار اور مردم شناس آدمی کی یہ بہت بڑی بھول تھی۔ بہرحال میری پوزیشن ہڑتالیوں سے بھی زیادہ خراب ہوگئی کیونکہ ان لوگوں نے یہ سمجھا کہ میں سعید صاحب سے دوستی کی بنا پر مالکوں کا طرف دار ہوں اسی وجہ سے ہڑتال کی مخالفت کر رہا تھا۔ ادھر مالکوں کی اجتماعی ذہانت نے مجھے ایسوسی ایشن کا نمائندہ سمجھتے ہوئے ہڑتالیوں کا لیڈر تصور کیا۔ لیکن ہڑتال کی تمام مدت کے دوران میں اپنے معمول پر قائم رہا یعنی وقت پر 'آزاد ہند' جاتا، منیر نیازی یا جو کوئی بھی موجود ہوتا اس کے ساتھ کچھ دیر بیٹھتا۔ سعید صاحب بھی اس وقت عموماً اپنے کمرے میں موجود ہوتے، کبھی ان سے سلام کلام بھی ہو جاتا لیکن اس سے زیادہ نہیں۔ یہ ہڑتال ۳۵ دن تک جاری رہی اس اثناء میں کلکتہ سے اردو کا کوئی اخبار نہیں نکلا۔

میرا موقف یہ تھا کہ اردو اخبارات میں ویج بورڈ کی سفارشات کے مطابق اجرت دینے کی صلاحیت نہیں ہے اس لیے ان سے اس بنیاد پر گفتگو کی جائے کہ وہ خود اجرتوں میں کتنے فیصد اضافے کر سکتے ہیں اسی کو تسلیم کر لیا جائے لیکن مالکان اس معاملے میں ٹس سے مس ہونے

کو بھی تیار نہ تھے۔ میں نے ایسوسی ایشن کے ذمہ داروں سے کہا کہ شام کے اخبارات تو بالکل کمزور ہیں اس لیے وہاں کے ورکروں کو کام پر جانے دیا جائے۔ چنانچہ ان امور پر غور کرنے کے لیے ایکزیکیٹو کمیٹی کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں نمائندہ کاتبوں کو بھی خاص طور سے مدعو کیا گیا۔ میرے مشورہ پر ایسوسی ایشن کے سکریٹری راضی ہوگئے کہ شام کے اخباروں میں کام کرنے والے کام پر واپس جائیں چنانچہ انھوں نے اسی وقت 'آبشار' کے دفتر میں ٹیلیفون کیا کہ آپ کے ورکر کل سے کام پر واپس جائیں گے لیکن وہاں منیجر صاحب نے شدت کے ساتھ جواب دیا کہ پہلے یہ لوگ تحریری معافی نامہ پیش کریں تب ہم کام پر واپسی کے لیے ان کی درخواست پر غور کریں گے۔ سکریٹری نے ٹیلیفون رکھ دیا اور مجھ سے کہا کہ تم صلح مصالحت کی بات کرتے ہو اور ادھر ان لوگوں کا یہ رویہ ہے۔ میں نے کہا کہ پھر آپ لوگ جو چاہیں کریں۔ میں اٹھ کر چلا آیا۔ ایسوسی ایشن میں وہ میرا آخری دن تھا پھر کبھی اس طرف نہیں گیا۔

لیکن غالباً احمد سعید صاحب تک یہ بات پہنچا دی گئی کہ ایسوسی ایشن کی میٹنگ میں رضوان اللہ شریک تھے گویا سازش کے محرک ہونے اور ہڑتال کی قیادت کرنے کے الزامات کا یہ ثبوت تھا جس پر سعید صاحب نے یقین کرلیا اور پھر میرے اس بیان کا یقین نہیں کر سکے کہ خود سعید صاحب کی زبانی مجھے کاتبوں کی ہڑتال کی اطلاع ملی تھی اور اس سے پہلے مجھے اس کا کوئی علم نہ تھا۔

ہڑتال کو تو کسی نہ کسی دن ختم ہونا ہی تھا۔ ۳۵ردن پر ختم ہوئی۔ اس دوران افسوسناک واقعات بھی ہوئے۔ ہڑتال کے آخری دن شام کو احمد سعید صاحب نے 'آزاد ہند' کے دفتر میں اعلان کیا کہ کل سے فلاں فلاں کام پر آئیں گے جن میں منیر نیازی اور شمس الزماں بھی شامل تھے لیکن مجھ سے کہا کہ آپ کل صبح گھر پر مجھ سے ملیے۔ میں نے ۹ بجے حاضر ہونے کا وعدہ کرلیا۔

اگلے دن صبح کو چاندنی چوک میں ان کی قیام گاہ پر حاضر ہوا۔ سعید صاحب نے پھل، بسکٹ چائے وغیرہ سے ضیافت کی تاکہ گفتگو خوشگوار فضا میں ہو۔ انھوں نے فرمایا کہ ''میری

اطلاع کے مطابق آپ نے اس ہڑتال کو منظّم کیا اور اس کی قیادت کی۔'' میں نے عرض کیا کہ ''جناب میرے آپ کے درمیان صاف صاف گفتگو میں وہ تھوڑے سے پیسے سدِ راہ ہو سکتے ہیں، جو مجھے 'آزاد ہند' سے ملتے ہیں اس لیے میں سب سے پہلے اس دیوار کو راستے سے ہٹا دیتا ہوں تا کہ کوئی لاگ نہ رہ جائے اور آپ میری باتوں کی صداقت کا یقین کر سکیں۔'' سعید صاحب اس جواب کے لیے تیار نہیں معلوم ہوتے تھے کیونکہ سرمایہ کا مزاج کبھی یہ فرض ہی نہیں کر سکتا کہ کوئی ورکر پیسے سے منہ پھیر لے گا۔ سرمائے کی نظر میں کسی ورکر میں انا نام کی کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتی، جو سرمائے سے زیادہ وزن دار اور پُرکشش ہو۔

سعید صاحب کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور ایک رنگ گیا اور پھر انھوں نے معذرت کے انداز میں کہا کہ ''بھائی میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا میں تو صرف آپ سے وضاحت چاہتا تھا۔'' میں نے عرض کیا کہ ''جناب آپ کا مطلب ہو یا نہ ہو لیکن میرا قطعی مطلب یہی ہے کہ میرے اور آپ کے درمیان کوئی مالی مصلحت نہ حائل ہو اور اب میں کہتا ہوں کہ اس ہڑتال کا مجھے سب سے پہلے آپ ہی کی معرفت علم ہوا۔ اس سے پہلے مجھے اس کا کوئی علم نہ تھا۔'' سعید صاحب نے فرمایا کہ ''اگر میں تحریری ثبوت اور گواہ پیش کروں تو؟'' میں نے عرض کیا کہ ''آپ ایسا کوئی ثبوت نہیں پیش کر سکتے جس سے ہڑتال میں میرا ملوث ہونا ثابت ہو اور اگر آپ کا بیان درست ثابت ہوا تو آپ جو جرمانہ تجویز کریں گے مجھے منظور ہوگا۔'' انھوں نے کہا کہ ''کل اسی وقت آیئے۔'' میں نے حامی بھر لی اور چلا آیا۔

اگلے دن ۹ بجے صبح کو میں پھر وہاں پہنچا تو سعید صاحب نے پچھلی کسی تاریخ کا 'آزاد ہند' پیش کیا جس میں ایسوسی ایشن کے نئے عہدیداروں کے انتخاب کی خبر تھی اور ایگزیکیٹیو کمیٹی کے نئے ممبروں میں میرا نام بھی شامل تھا۔ میں نے کہا کہ ''میں ایسوسی ایشن یا ایگزیکیٹیو کمیٹی کی رکنیت سے تو انکار نہیں کرتا اور یہ کوئی جرم نہیں ہے۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ میں نے اس ہڑتال کی بھی تحریک اور قیادت کی۔''

اتنے میں کسی کی آمد کی اطلاع ملی۔ احمد سعید صاحب نے اوپر بلا لیا۔ وہ منیر نیازی

تھے۔ میں سمجھ گیا کہ ان کے متوقع گواہ وہی تھے۔ لیکن ان کے آتے ہی سعید صاحب نے گفتگو کا رخ بدل دیا اور کہا کہ ''بھائی سب بھول جائیے جو ہوا سو ہوا جائیے کام کیجیے۔'' چند رسمی باتوں کے بعد میں اٹھ کر چلا گیا۔ میں یہ تو سمجھتا ہی تھا کہ منیر نیازی کے پاس میرا کوئی راز نہ تھا۔ ان کی آمد کا مطلب میں نے یہ نکالا کہ سعید صاحب نے کام کی کسی بات کے لیے ان کو بلایا ہوگا۔ لیکن منیر نیازی کو سخت خفت کا احساس تھا وہ نہیں سمجھتے تھے کہ وہاں مجھ سے مڈبھیڑ ہوگی۔

میں سعید صاحب کے گھر سے نکل کر یو ایس آئی ایس گیا اور کام میں مصروف ہو گیا۔ کچھ دیر بعد منیر نیازی بھی وہاں پہنچے لیکن مجھ سے نظریں چار کرنا ان کے لیے مشکل ہو رہا تھا، وہ صرف اپنی صفائی دینا چاہتے تھے۔ میں ان کو کسی ندامت کے عالم میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے دوستوں کی ندامت کو کبھی پسند نہیں کیا اور خود کو ناسمجھ ظاہر کرنے کو ترجیح دی گویا جس بات پر کسی دوست کو نادم ہونا چاہیے تھا اسے میں سمجھا ہی نہیں۔

بہرحال! منیر نیازی نے اپنی صفائی میں جو کچھ کہا وہ مختصراً یہ ہے:

''سعید صاحب نے مجھے بلایا اور کہا کہ رضوان صاحب نے آپ کو بہکا کر ایسوسی ایشن کا ممبر بنایا۔ میں نے کہا کہ ہم لوگ بچے نہیں ہیں کہ کسی کے بہکاوے میں آجائیں۔ وہ ایسوسی ایشن کی ممبری کے لیے فارم لائے تھے، میں ممبر بننا چاہتا بھی تھا لیکن ممبر نہیں بنا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس فارم میں ایک خانہ تنخواہ کا بھی تھا اور وہ اتنی کم تھی کہ لکھتے ہوئے مجھے شرم آئی اس لیے میں نے فارم کی خانہ پری نہیں کی اور ممبر نہیں بنا۔ اس کے بعد سعید صاحب خاموش ہو گئے۔''

میں نے دو لفافے تیار رکھے تھے جن میں سے ایک احمد سعید صاحب کے نام تھا وہ میں نے منیر نیازی کو دیا کہ جا کر سعید صاحب کو دے دیں۔ اس میں ایک خط تھا جس کی عبارت بہت مختصر تھی ''محترم سعید صاحب! میں ذوقِ ہم سفری میں اتنی دور تک پرواز کر گیا کہ تاب وتواں جواب دے گئی۔ اب معذرت خواہ ہوں۔ آپ کا مخلص رضوان اللہ۔'' منیر نیازی نے اس کو پڑھا اور اس ایئر کنڈیشند کمرے میں ان کی پیشانی پسینے سے تر ہو گئی جو ان کے خلوص کا گواہ

تھا۔ وہ کچھ دیر تک سر پکڑ کر خاموش بیٹھے رہے۔ پھر کہا کہ یہ کام مجھ سے نہیں ہوسکتا۔ اس کے بعد وہ دیر تک بیٹھے رہے اور میرے ساتھ ہی باہر نکلے۔ وہ لفافہ انہی کے پاس رہا لیکن وہ اصرار کرتے رہے کہ شام کو کام پر ضرور آیئے۔ اب تو سعید صاحب نے خود ہی کہہ دیا ہے میں یہ لفافہ ان کو نہیں دوں گا۔

میں شام کو چار بجے 'آزاد ہند' پہنچنے کے لیے کچھ پہلے ہی گھر سے نکلا کرتا تھا۔ اس دن میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن ساڑھے تین بجے کے قریب منیر نیازی اور سمیع اللہ مرحوم میرے گھر پہنچ گئے اور اصرار کرنے لگے کہ آپ کو دفتر چلنا ہی ہوگا۔ انھوں نے اس قدر مخلصانہ اصرار کیا کہ میری قوتِ مزاحمت جواب دے گئی اور میں ان دونوں اصحاب کے ساتھ 'آزاد ہند' چلا گیا اور اس طرح کام میں لگ گیا گویا کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ لیکن دلوں میں یقیناً بال آگئے تھے۔ اس ہڑتال میں جو دو تین کاتب پیش پیش تھے۔ ان کو کام پر نہیں آنے دیا گیا اور پھر ایک لامتناہی اور لاحاصل دفتری اور قانونی کارروائی ان لوگوں کے خلاف شروع ہوئی۔

اس سلسلے میں بعض باتیں بہت بری ہوئیں اور بعض اچھی بھی۔ جیسا کہ ہر چھوٹی بڑی تحریک میں ہوتا ہے، کوئی ایک شخص یا چند افراد محرک ہوتے ہیں اس کے بعد تحریک کو آگے بڑھانے والے لوگ ہوتے ہیں لیکن ان میں کچھ شر پسند یا تخریب پسند لوگ بھی گھس پڑتے ہیں یا سرگرم کارکنوں میں سے بعض لوگ حدوں سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ اس ہڑتال کے دوران بھی ایسا ہی ہوا۔ مسئلہ صرف کاتبوں کی تنخواہوں میں اضافے کا تھا جس پر منتظمین ٹس سے مس ہونے کو تیار نہ تھے۔ بات بڑھتے بڑھتے ہڑتال تک پہنچی۔ جب ہڑتال نے طول کھینچا تو سعید صاحب نے اس کو ناکام بنانے کی حتی الوسع کوشش کی، دو کاتبوں کو لکھنؤ سے بلا کر لائے اور کسی دوسری جگہ ان سے کتابت کا کام شروع کرایا۔ ان کی یہ کوشش اپنی جگہ درست تھی لیکن رات کو جب اخبار کی کاپی پریس میں جانے لگی تو ہڑتالی کاتبوں نے چھین جھپٹ کی۔ یہ ایک ناشائستہ اور شر آمیز حرکت تھی۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ معاملات رفع دفع ہوجانے کے بعد کاتبوں کی باقاعدہ تربیت کی ایک تحریکی چلی جس کا مقصد یہ تھا کہ آئندہ کسی ہنگامی صورتِ حال میں کاتبوں کی قلت

کا سوال نہ پیدا ہو۔ میرا ایک قیاس ہے جس کی تصدیق یا تردید صرف احمد سعید صاحب کر سکتے ہیں وہ یہ کہ کلکتہ میں کاتبوں کی تربیت کی تحریک دہلی تک پہنچی۔ چونکہ احمد سعید صاحب کا اثر ورسوخ دہلی کے اردو اشاعتی اداروں اور حکومتی اداروں تک تھا اس لیے قرینہ غالب ہے کہ وہی اس تحریک کو کلکتہ سے دہلی تک لے گئے ہوں گے اور غالب اکاڈمی نظام الدین میں خطاطی کی تربیت کا کورس اسی زمانے میں یعنی ۱۹۷۵ء میں شروع ہوا۔ اردو طباعت اور اشاعت میں کمپیوٹر کا دخل بڑھنے پر اسی تحریک نے اردو کمپیوٹر کورس کی راہ دکھائی۔ اس کورس کی ابتداء، اجراء، فروغ اور مالی اعانت میں ہر طرح قومی کونسل برائے فروغ اردو کی کارفرمائی رہی ہے جہاں احمد سعید صاحب غالباً شروع سے ہی مغربی بنگال کی نمائندگی کرتے رہے ہیں، سو اس تحریک کے فوائد کا کریڈٹ ان کو بھی جاتا ہے۔

■❖■

باب پنجم

انقلاب انگیز سال

بہرحال ہم ۱۹۷۵ء میں داخل ہوئے تو قومی زندگی میں، اور میری ذاتی زندگی میں بھی، یہ سال بڑا تہلکہ خیز اور انقلاب انگیز ثابت ہوا۔ مسز اندرا گاندھی کی انتخابی اٹھا پٹک، عدالتی چارہ جوئی اور بالآخر ملک میں ایمرجنسی کا نفاذ ایسے تاریخی واقعات ہیں جن کا بیان غیر ضروری ہے لیکن یہ بتانا کہ ہم لوگ کس طرح متاثر ہوئے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

۱۲ر جون ۱۹۷۵ء کو میں نے اپنی ڈائری میں یہ عبارت لکھی ''آج کا دن اندرا گاندھی کی زندگی میں اور حکمراں کانگریس پارٹی کی تاریخ میں ایک موڑ معلوم ہوتا ہے۔ مسٹر راج نرائن کے مقابلے میں مسز اندرا گاندھی قانونی جنگ ہار گئیں۔ الہ آباد ہائی کورٹ نے انتخابی مقدمے میں ان کے خلاف فیصلہ صادر کر دیا۔''

احمد سعید صاحب نے اس روز 'آزاد ہند' کے لیے ایک معرکتہ الآرا ایڈیٹوریل لکھا جس کا عنوان تھا ''اندرا گاندھی کا واٹر گیٹ'' اس کو لکھنے کے بعد میرے پاس بھیجا کہ اسے دیکھ لوں۔ میں نے اسے پڑھنے کے بعد کہا کہ اب سعید صاحب ابھی مسز گاندھی وزیرِ اعظم ہیں اور کچھ بھی کر سکتی ہیں اس لیے یہ اداریہ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ سعید صاحب معاملے کی نزاکت کو تاڑ گئے اور اس اداریہ کو روک لیا اور مجھ سے کہا کہ آپ ہی لکھئے۔ پھر میں نے اس روز اداریہ لکھا۔ آنے والے واقعات نے ثابت کر دیا کہ اگر وہ اداریہ 'آزاد ہند' میں چھپ گیا ہوتا تو شاید اخبار کو بے قیاس نقصان پہنچ جاتا۔ اس کے بعد ہی نافذ ہونے والی ایمرجنسی اور پریس سنسر شپ کے دوران سیاسی لیڈروں، اخباروں، ایڈیٹروں وغیرہ پر جو کچھ گزری اس کی روداد بیان کرنے

کے لیے جلدیں درکار ہوں گی۔۲۳؍جون کو مسز گاندھی نے الہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل داخل کر کے اس فیصلے کا نفاذ روک دیا، اس کے بعد ۲۶؍جون کو ملک میں ایمرجنسی کے نفاذ کا اعلان کر دیا گیا۔

ایمرجنسی اور سنسر شپ:

اخباروں پر سنسر شپ کی پابندیاں اتنی سخت تھیں کہ شاید برطانوی دورِ حکومت میں بھی کبھی نہ رہی ہوں گی، حتیٰ کہ عالمی جنگ کے زمانے میں بھی نہیں رہیں ہوں گی۔ اخباروں میں چھپنے والا ایک ایک لفظ سنسر کی پیشگی کلیئرنس کے لیے بھیجنا پڑتا تھا، سنیما کے اشتہار تک اس لازمہ سے مستثنٰی نہیں تھے۔

معمول یہ ہو گیا کہ اخبار میں اشاعت کے لیے جو مواد تیار کیا جاتا اسے لے کر دفتر کا ایک آدمی رائٹرس بلڈنگ جاتا اور اس پر سنسر کی مہر لگوا کر لاتا اس کے بعد ہی اسے کتابت کے لیے دیا جاتا پھر اسے بھی محفوظ رکھا جاتا۔ رائٹرس بلڈنگ میں حکومت مغربی بنگال کا شعبۂ اطلاعات تھا جس میں شانتی رنجن بھٹا چاریہ موجود تھے۔ اس کے علاوہ حکومت ہند کا دفتر اطلاعات بھی تھا جس میں ایک انفارمیشن افسر اور ایک اسسٹنٹ موجود تھے۔ وہاں معزالدین انفارمیشن افسر تھے جن کا تقرر شاید سال دو سال پہلے ہی ہوا تھا۔ وہ کلکتہ میں ہی پلے بڑھے نوجوان تھے اس لیے سینئر صحافیوں کا بے حد احترام کرتے تھے۔ شانتی بابو بھی نرم خو اور خوش مزاج آدمی تھے۔ بھر کلے پان اور چٹکی میں دھوتی کی چونن کے بغیر ان کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مرکزی اور ریاستی حکومت کے ان دونوں ذمہ داروں کو پریس سنسر شپ پر عمل آوری کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ دراصل ان کے لیے یہ بڑا سخت امتحان تھا ایک طرف تو کام کی کثرت ہی دیوانگی کے لیے کافی تھی دوسرے سخت ذمہ داری۔ لیکن اس کے باوجود جب کبھی ان میں سے کسی نے ٹیلیفون پر گفتگو کی یا پریس میٹر کے بارے میں ہی کچھ دریافت کیا تو ان کے لہجے کی نرمی اور خوش اخلاقی میں یا ہم لوگوں کے تئیں ان کا احترام کا جو رویہ تھا اس میں کمی نہیں آئی، یہ بڑی خوبی تھی۔ آگے بڑھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شانتی بابو کے بارے میں جو معلومات دستیاب

ہوئی ہیں انھیں پیش کر دیا جائے۔

شانتی رنجن بھٹا چاریہ کے انتقال کے بعد شہزاد منظر کا ایک تعزیتی مضمون جو انھوں نے کراچی سے لکھ بھیجا تھا 'کتاب نما' دہلی کے جنوری ۱۹۹۴ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا اس کے چند غیر ضروری جملوں کے علاوہ تقریباً پورا مضمون پیش کر رہا ہوں جس سے شانتی بابو کے ادبی کارناموں پر روشنی پڑتی ہے اور خود شہزاد منظر کے بعض حالات بھی معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے لکھا:

''اردو کے مشہور ادیب اور محقق شانتی رنجن بھٹا چاریہ ۱۵ر ستمبر ۱۹۹۳ء کو ۶۳ سال کی عمر میں انتقال فرما گئے۔ ان کا شمار اردو کے اہم اور معتبر محققوں میں ہوتا تھا۔ انھوں نے اردو ادب میں مختلف موضوعات پر ۲۸ر کتابیں لکھیں، جن میں افسانے بھی شامل ہیں اور تحقیقی اور تنقیدی مضامین اور تراجم بھی۔ میں اردو کے صرف دو بنگالی ادیبوں سے واقف ہوں ایک بسنت کمار چٹرجی اور دوسرے شانتی رنجن بھٹا چاریہ۔

شانتی رنجن بھٹا چاریہ ۱۹۳۰ء میں فرید پور (موجودہ بنگلہ دیش کے گاؤں بھوبیشور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد بوئے کنٹھو بھٹا چاریہ ملازمت کے سلسلے میں ریاست حیدرآباد (دکن) منتقل ہو گئے۔ جہاں وہ نظام اسٹیٹ ریلوے میں اسٹیشن ماسٹر مقرر ہوئے۔ شانتی نے لڑکپن اور جوانی اردو ماحول میں گزاری۔ انھوں نے ۱۹۴۸ء میں حیدرآباد سے میٹرک کیا اور محبوب کالج (سکندرآباد) میں داخلہ لے لیا۔ ان کے ادبی کیریئر کا آغاز ۱۹۴۶ء سے ہوتا ہے۔ وہ ابتدا میں افسانے لکھتے رہے اور ساتھ ہی حیدرآباد کے مختلف اخبارات مثلاً روزنامہ 'سیاست' اور روزنامہ 'پیام' میں کام کرتے رہے۔ اس کے علاوہ مسلم ضیائی کی نگرانی میں شائع ہونے والے رسالے 'ستارے' سے بھی وابستہ رہے۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'راہ کا کانٹا' ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا اور اس کے بعد ان کا ناولٹ 'شاعر کی شادی' منظرِ عام پر آیا۔ انھوں نے سرخ پوش لیڈر خان عبدالغفار خان کی سوانح عمری بھی لکھی۔ انھوں نے تحقیق کے میدان میں اس وقت قدم رکھا جب ان کے والد ریٹائر ہو کر کلکتہ واپس آ گئے۔

میری شانتی رنجن بھٹا چاریہ سے ۱۹۶۰ء میں اس وقت ملاقات ہوئی۔ جب انھوں نے انجمن ترقی پسند مصنّفین (شاخ کلکتہ) کی نشستوں میں باقاعدگی کے ساتھ شرکت کرنی شروع کی اور اپنا افسانہ سنایا۔ کسی بنگالی کا اردو میں افسانہ لکھنا یوں بھی حیرت کی بات تھی۔ اس پر اتنی صاف ستھری اور شستہ زبان میں اردو لکھنا اور بھی حیران کن تھا۔ چنانچہ مجھ میں اشتیاق پیدا ہوا اور میں نے ان سے ان کے بارے میں تفصیل دریافت کی۔ مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ وہ نہ صرف اہلِ زبان کی طرح اردو لکھتے ہیں بلکہ بولتے بھی اہلِ زبان کی طرح ہیں۔ البتہ وہ حیدرآبادیوں کی طرح بڑی 'ق' کو 'خ' کی طرح ادا کرتے تھے۔ جس پر میں ان کا بڑا مذاق اڑاتا تھا۔ جس کا وہ برا نہیں مانتے تھے۔ وہ اور میں ہم عمر تھے اور ہم مسلک بھی۔ حیدرآباد میں قیام کے دوران ان کا ترقی پسندوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا اور انھیں مخدوم محی الدین سے خاص نیاز حاصل تھا چنانچہ وہ جب کلکتہ آئے تو انھوں نے انجمن ترقی پسند مصنّفین کی نشستوں میں باقاعدگی سے آنا شروع کر دیا۔ اس طرح وہ میرے حلقہ دوستاں میں شامل ہو گئے۔ ان سے قربت کی ایک وجہ بنگالی زبان و ادب سے میری واقفیت بھی تھی۔ میں نے بنگلہ زبان اچھی طرح سیکھ لی تھی۔ اس لیے ہم دونوں گفتگو کے دوران اردو کے علاوہ بنگلہ شعر و ادب کے بارے میں بھی تبادلہ خیالات کرتے۔ ان سے میری اتنی گہری دوستی ہو گئی کہ ہم ہفتے میں کم از کم پانچ روز ضرور ملتے۔ کبھی امجدیہ ہوٹل میں، کبھی صابر ریستوراں میں، کبھی انجمن کی نشستوں میں اور کبھی مشترکہ دوست اصغر حسین کے چارمنگ پریس میں اور کبھی اس کے دفتر رائٹرس بلڈنگ میں، وہ اگر بیمار پڑ جاتے اور گھر سے نہ کل پاتے تو میں ان سے ملنے کے لیے ان کے گھر پہنچ جاتا، جو کلکتہ کے ایک سرے پر ٹالی گنج کے قریب مشرقی پاکستان کے بنگالی رفیوجی کے لیے قائم بستی اشوک نگر میں واقع تھا۔ یہ علاقہ کلکتہ کارپوریشن کے احاطہ سے باہر ۲۴ پرگنہ میں تھا۔ وہ میری آمد پر حیران رہ جاتے اور میری محبت کے قائل بھی۔ شانتی، حکومت مغربی بنگال کے محکمۂ اطلاعات سے شائع ہونے والے اردو پندرہ روزہ 'مغربی بنگال' سے وابستہ تھے۔ سارا کام وہ انجام دیتے تھے، لیکن ایڈیٹر کے طور پر کسی دوسرے کا نام شائع ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے ذمہ مغربی

بنگال سے شائع ہونے والے اردو اخبارات و جرائد کا مطالعہ کرنا اور ریاست دشمن خبروں، مضامین اور اداریے کی نشاندہی کرنا بھی تھی، چنانچہ میں جب ۱۹۶۵ء میں مشرقی پاکستان منتقل ہوا اور مجھے وہاں ملازمت کے حصول کے لیے روزنامہ 'پاسبان' (ڈھاکہ) میں ہندوستان اور پاکستان کے خارجہ تعلقات کے موضوع پر مضمون لکھنا پڑا اور جس میں میں نے پاکستان کے نقطۂ نظر سے ہندوستان کی کشمیر پالیسی پر کڑی نکتہ چینی کی تو یہ مضمون شانتی کی نظروں سے بھی گزرا۔ اس لیے کہ ان کے ذمہ مشرقی پاکستان کے اردو اخبارات و جرائد کا مطالعہ کرنا بھی تھا۔ انھیں یہ اخبارات ڈھاکہ میں واقع ہندوستانی قونصل خانے کے توسط سے حاصل ہوتے تھے۔ میں جب چند ماہ کے بعد کلکتہ واپس گیا اور ان سے ملنے کے لیے حسبِ معمول رائٹرس بلڈنگ پہنچا تو انھوں نے مجھ سے تنہائی میں کہا کہ اگر میں نے پاکستان میں رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے تو میں فوراً پاکستان واپس چلا جاؤں، ورنہ میرا وہاں رہنا مناسب نہ ہوگا۔ چنانچہ میں ان کے مشورے پر فوراً پاکستان واپس آ گیا اور پھر ہندوستان نہیں گیا۔

میں جب تک کلکتہ میں رہا انھوں نے تحقیق کے میدان میں قدم نہیں رکھا تھا اور ان کی ساری توجہ افسانہ نگاری کی جانب مبذول تھی۔ پھر میں نے علمی اور ادبی رسائل میں بنگال سے متعلق ان کے تحقیقی مضامین دیکھے تو بڑی حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی کہ میرے دوست نے تحقیق کے میدان میں بھی قدم رکھ دیا ہے۔ شانتی رنجن کی تحقیق کا محور بنگال اور بنگالیوں کی اردو خدمات تھا۔ انھوں نے اس شعبہ میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ کسی بھی اردو محقق کے لیے ممکن نہ تھا اس لیے کہ اردو میں ان کے علاوہ کوئی ایسا محقق نہیں جو اردو اور انگریزی کے ساتھ ساتھ بنگلہ زبان و ادب سے اتنی گہری واقفیت رکھتا ہو اور پھر بنگالی اور وہ بھی ہندو بنگالی ہونے کے باعث ان کو جو سہولتیں اور آسانیاں حاصل تھیں وہ کسی دوسرے محقق کو حاصل نہیں ہوسکتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ قدیم دور کے اردو اور فارسی داں بنگالیوں کی اردو خدمات کے بارے میں نایاب دستاویزات اور مخطوطات کے حصول میں کامیاب ہوئے اور انھوں نے اپنی بے مثال تصنیف ''بنگالیوں کی اردو خدمات'' لکھنے میں کامیابی حاصل کی۔

یہ امر ہر شخص جانتا ہے کہ انگریزوں کی آمد کے بعد ایک عرصے تک بنگال کی سرکاری اور عدالتی زبان فارسی تھی اور انگریز حکمران اور افسران فارسی کے علاوہ اردو سے بھی بخوبی واقف تھے۔ بنگلہ زبان کے مشہور شاعر مائیکل مدھوسودن کے والد اور چچا فارسی زبان و ادب سے بخوبی واقف تھے۔ سوابازار کے راجا نب کرشن دیو، وارن ہیسٹنگز کے گورنر جنرل بننے سے قبل ان کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی میں معمولی درجے کے محرر تھے اور خود وارن ہیسٹنگز فیکٹر کے عہدے پر فائز تھے تو وہ انھیں فارسی پڑھایا کرتے تھے۔ خیال اغلب ہے کہ وہ یقیناً اردو کی شد بد بھی رکھتے ہوں گے۔ اس دور میں بہت سے ہندو بنگالی زمیندار اور اہلِ علم و دانش نہ صرف فارسی سے بلکہ اردو سے بھی اچھی واقف تھے اور اس دور کے رواج کے مطابق اردو میں باقاعدہ شعر بھی کہتے تھے۔ ان میں ایک اہم نام راجا جنم جے مترا ارماںؔ ہیں۔ وہ عہدِ غالب میں بنگال کے بلند پایہ شاعر تھے اور وہ ہم عصر شعرائے بنگلہ میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ ان کا اہم کارنامہ 'تذکرۂ نسخہ دلکشا' ہے جو غالبؔ کی زندگی میں مکمل ہوا، لیکن ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے راجندر لال مترا نے ۱۹۷۰ء میں کلکتہ سے شائع کیا۔ 'تذکرۂ نسخہ دلکشا' کے ذریعے بھی اس دور کے بنگالی اور غیر بنگالی شعرائے بنگالہ کے بارے میں بہت ساری معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ شانتی نے اردو زبان کی خدمات کے سلسلے میں صرف اردو ادباء اور شعراء کا ہی سراغ نہیں لگایا بلکہ زندگی کے دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والے ان اردو داں بنگالیوں کے بارے میں بھی تحقیقات کیں، جنھوں نے اردو زبان کو ذریعۂ اظہار بنایا مثلاً ڈاکٹر وغیرہ۔ شانتی رنجن بھٹا چاریہ سے قبل اردو کے محققین جب بنگال میں اردو زبان و ادب کی نشو ونما سے بحث کرتے تھے تو ان کی تحقیق کا محور فورٹ ولیم کالج، اس کے سربراہ گل کرسٹ اور فورٹ ولیم کالج سے وابستہ مصنّفین اور مترجمین ہوا کرتے تھے۔ کسی بھی محقق کی توجہ اردو کے بنگالی مصنّفین اور شعرائے کرام کی جانب نہیں گئی، اس لیے اردو کی تواریخ ادب میں ان کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ شانتی رنجن بھٹا چاریہ کی تحقیقات کے باعث پہلی بار بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات منظرِ عام پر آئیں۔ اس لیے اب ضروری ہوگیا ہے کہ اردو زبان و ادب کی تاریخ از سرِ نو مرتب کی جائے اور ان بنگالی ادباء و شعراء کے علاوہ ان بنگالیوں کی

خدمات کو بھی تاریخ زبان و ادب میں جگہ دی جائے جنھوں نے اردو کو ذریعہ اظہار بنایا۔ شانتی رنجن بھٹا چاریہ کی یہ اہم کتاب ۶۶-۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی جس کی بنیاد پر انھیں رویندر ناتھ ٹیگور انعام کے علاوہ ساہتیہ اکیڈمی، میر اکیڈمی اور اتر پردیش، بہار اور مغربی بنگال کی اردو اکادمیوں کی جانب سے بھی متعدد انعامات حاصل ہوئے اور ۱۹۶۷ء میں اورینٹل کالج بمبئی کی جانب سے ۱۹ویں صدی تک اردو میں شائع ہونے والی کتابوں پر تحقیقی کام کرنے کے سلسلے میں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری بھی دی گئی۔

شانتی رنجن بھٹا چاریہ نے اس کے علاوہ بھی متعدد کتابیں لکھی ہیں جن میں 'بنگال میں اردو زبان و ادب'، 'اقبال، ٹیگور اور نذرالاسلام' (تین شاعر - ایک مطالعہ)، 'غالب اور بنگال'، 'اردو ادب اور بنگالی'، 'مختصر تاریخ بنگلہ ادب'، 'اردو ادب اور بنگالی کلچر'، 'یورپین مصنّفین کی اردو خدمات'، 'آفتابِ علم و ادب - ڈاکٹر سنتی کمار چٹرجی'، 'آزادی کے بعد بنگال میں اردو' وغیرہ۔ ان کا ایک اہم کارنامہ ہندوستان کے معروف ماہر لسانیات ڈاکٹر سنتی کمار چٹرجی اور بنگلہ ادب کے مؤرخ سوکمار سین کے بنگلہ مضامین اور تصانیف کا ترجمہ ہے۔ جن میں سوکمار چٹرجی کی 'تاریخ بنگلہ ادب' اور ڈاکٹر سنتی کمار چٹر کے مضامین کا مجموعہ 'بکھرے ورق' شامل ہیں۔ انھوں نے اس کے علاوہ رانی چند کے سفر نامے 'پورن کمبھ' کا بھی ترجمہ کیا ہے اور راجندر سنگھ بیدی کے مشہور ناولٹ 'ایک چادر میلی سی' کو بھی بنگلہ میں منتقل کیا ہے۔

شانتی رنجن بھٹا چاریہ کی زندگی کا آخری کارنامہ مولانا ابوالکلام آزاد کے پاسپورٹ کی خفیہ فائل کا سراغ ہے جس سے مولانا آزاد کے بارے میں چند حیرت انگیز حقائق پہلی بار منظرِ عام پر آئے۔ انھوں نے کلکتہ میں مغربی بنگال اردو اکیڈمی کے قیام میں بھی بھرپور حصہ لیا اور مغربی بنگال میں اردو زبان کے فروغ کے کام میں سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔ وہ ۱۹۸۵ء میں مغربی بنگال اردو اکیڈمی کی جانب سے اسلامیہ ہائی اسکول (بنیاپوکھر) میں بنگالیوں کو اردو پڑھانے پر مامور تھے۔ بعد میں وہ مغربی بنگال اردو اکیڈمی کے اعلیٰ ترین عہدے پر فائز ہوئے۔ وہ ایک وسیع المشرب اور قطعی سیکولر ذہن کے مالک تھے۔ وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار

تھے اس لیے تنقیدی مضامین میں بھی سیدھی سادی اور بول چال کی زبان استعمال کرتے تھے۔ ان کی زبان میں وہ عالمانہ انداز نہیں ملتا تھا جو عام طور پر ہمارے محققین کی تحریروں میں عربی اور فارسی کے ثقیل الفاظ اور تراکیب کے استعمال سے پیدا ہوتے ہیں۔ بنگال کے قدیم امراء و رؤسا کے خاندانوں میں آج بھی ایسی اردو دستاویزات اور مخطوطات ہوں گے جو منظرِ عام پر نہیں آئے۔افسوس! اب کوئی نیا شانتی رنجن بھٹا چاریہ پیدا نہیں ہوگا۔''

بنگلہ دیش میں انقلاب:

اسی اثناء میں برصغیر کا دوسرا تہلکہ خیز واقعہ یعنی بنگلہ دیش میں ایک اور انقلاب برپا ہوا۔ وہاں ۱۵راگست کو شیخ مجیب الرحمٰن کو معہ دیگر افراد خاندان قتل کر دیا گیا۔ یہ واقعہ ہندوستان اور بنگلہ دیش کے تعلقات میں ایک نئے موڑ کا پیش خیمہ تھا۔ سابق مشرقی پاکستان یا بنگلہ دیش کے ہر واقعے کا اثر کلکتہ میں فوراً محسوس کیا جاتا تھا کیونکہ وہاں کے ہندوؤں میں معمولی سی تحریک یا ہلچل بھی کلکتہ کے بنگلہ اخبارات رائی کا پہاڑ بنا کر پیش کرنے کی روایت رکھتے ہیں اس طرح پورے بنگال کی فضا متاثر ہو جاتی ہے۔ یہ بنگال کی دانشوری پر ایک داغ ہے۔ ہمارے برصغیر میں ایک عجیب ستم ظریفی اور بدقسمتی یہ ہے کہ یہاں کے دانشور زیادہ فرقہ پرستانہ ذہنیت رکھتے ہیں خواہ وہ کسی مذہب یا علاقے سے تعلق رکھتے ہوں۔ گاؤں کے لوگوں میں مذہب وملت کے فرق کے باوجود بڑی یگانگت ہوتی ہے۔شہروں سے آنے والے اخبارات جو نام نہاد دانشوروں کی ذہنی اپج سے بھرے ہوتے ہیں ان لوگوں کے باہمی تعلقات میں بھی زہر گھولتے ہیں۔ چنانچہ تعلیم کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ روایتی رواداری اور باہمی تعلقات کی نابودگی کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔

مخالفانہ پروپیگنڈہ:

اسی دوران واقعات کا ایک ایسا سلسلہ بھی چل پڑا جس کا نشانہ میں تھا۔ غالباً اپریل ۱۹۷۵ء میں مغربی بنگال سے راجیہ سبھا کے ممبر مسٹر بھوپیش گپتا نے جو کمیونسٹ لیڈر تھے، ایوان

میں ایک بیان دیا جس کا لب ولباب یہ تھا کہ یوایس آئی ایس کلکتہ میں ایک شخص ایسا ہے جو مغربی بنگال میں فرقہ پرستی پھیلا رہا ہے۔ وہ ایک ایسے اردو اخبار میں بھی کام کر چکا ہے جس کا مالک اسلامی کتابوں کے ایک اشاعت گھر کا بھی مالک ہے۔ یہ اشارے 'عصرِ جدید' اور دارالاشاعت اسلامیہ کی طرف تھے۔ یہ دونوں ادارے خان بہادر شیخ محمد جان صاحب کی ملکیت میں تھے۔ مسٹر بھوپیش گپتا نے یہ بھی فرمایا کہ اسی اشاعت گھر کے چھپے ہوئے قرآن کے اوراق ردی میں بیچے گئے تھے جس کے نتیجے میں ہوگلی میں فساد ہوتے ہوتے رہ گیا۔ شخصِ مذکور کے بارے میں جس کا صاف اشارہ میری طرف تھا، انھوں نے فرمایا کہ اس شخص نے کئی جلسوں میں تقریریں کیں جن کا مقصد فرقہ پرستی پھیلانا تھا۔ ان کے اس بیان کو پارٹی کے ہمنوا اخباروں نے خوب اچھالا اور سچائی معلوم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ پارٹی نے اتنے ہی پر بس نہیں کیا بلکہ ہنڈ بل چھپوائے جنھیں اخباروں میں شائع کرانے کی غرض سے ان کے ورکر اردو اخباروں کے دفتروں میں جھانکنے لگے۔ لیکن اس مہم میں انھیں منہ کی کھانی پڑی۔ روزنامہ 'آبشار' کمیونسٹ پارٹی کی ملکیت میں نہ ہونے کے باوجود نظریاتی طور پر پارٹی سے اس قدر ہم آہنگ تھا کہ پارٹی ہی کا اخبار سمجھا جاتا تھا۔ اردو حلقے میں متعارف ایک پارٹی ورکر، جواب اس دنیا میں نہیں رہے 'آبشار' کے دفتر میں گئے اور ایڈیٹر ابراہیم ہوشؔ کو وہ ہینڈ بل دے کر اشاعت کی درخواست کی۔ ہوشؔ صاحب نے ان کو ڈانٹ پلائی اور کہا کہ ہم کیا رضوان کو نہیں جانتے۔ ان صاحب کو دفتر سے باہر نکال دیا۔ رئیس الدین فریدی، ایڈیٹر 'روانہ ہند' نے بھوپیش گپتا کے بیان کو اخبار کے ادارتی صفحہ پر چھاپا اور ساتھ ہی بہت سخت ایڈیٹوریل لکھا جس میں ان کو لتاڑا کہ ایک ذمہ دار لیڈر کو اس قدر غیر ذمہ دارانہ بیان دینے سے پہلے حقیقتِ حال معلوم کر لینا چاہئے تھا اور یہ کہ انھوں نے جن واقعات کا حوالہ دیا ہے وہ سب غلط ہیں۔ ہم لوگوں کو یہیں رہتے ہوئے ان واقعات کا کوئی علم نہیں۔ اس طرح انھوں نے ایوان کو گمراہ کیا ہے۔ مذکورہ پارٹی ورکر اخباری تراشے اور کچھ ہینڈ بل وغیرہ ایک فائل میں لیے ہوئے 'آزاد ہند' میں پہنچے۔ اس وقت احمد سعید صاحب موجود نہیں تھے چنانچہ وہ ہم لوگوں کے کمرے میں آگئے۔ وہاں ایک بڑی میز

کے ایک طرف میں بیٹھا ہوا تھا اور سامنے منیر نیازی اور شمس الزماں۔ وہ حضرت آ کر ان دونوں کے درمیان خالی کرسی پر بیٹھ گئے اور اپنی فائل کھولتے ہوئے کچھ گویا ہوئے ہی تھے کہ منیر نیازی پوچھ بیٹھے کی یو ایس آئی ایس میں کام کرنے والے جس شخص کا ذکر کیا گیا ہے کیا آپ اس سے واقف ہیں۔ ان صاحب کا جواب نفی میں تھا۔ منیر نیازی نے کہا کہ وہ یہی تو ہیں رضوان صاحب۔ بس انھوں نے آہستہ سے فائل سمیٹی لیکن شمس الزماں نے ان کی اچھی طرح خبر لی اور کہا کہ اب پارٹی ورکروں کے پاس کوئی کام نہیں رہ گیا ہے سوائے جھوٹی سچی افواہیں گھڑنے کے وہ بیچارے اٹھے اور خاموشی سے نکل گئے۔

ایک طرف یہ سب ہو رہا تھا دوسری طرف میں نے یہ کیا کہ اس سلسلہ کی کوئی خبر یا کوئی چیز انگریزی یا اردو میں چھپی ہوئی دیکھتا تو اس کو تراش کر ایک فائل میں رکھتا گیا۔ ہینڈ بلوں میں جن جلسوں کا ذکر کیا گیا تھا، جو ان کے بیان کے مطابق فرقہ پرستی پھیلانے کی غرض سے کئے گئے تھے، ان کی خبریں یا اعلانات پچھلے اخباروں میں تلاش کر کے ان کے تراشے بھی رکھے اور ان جلسوں کے داعیان اور مقرروں کے نام نوٹ کر لیے۔ ان میں سے دو اصحاب کے نام ہر جلسے کی رپورٹ میں پائے گئے۔ ایک صاحب میٹا برج کے علاقے کے تھے اور دوسرے پارک سرکس کے جو خیر سے کبھی کلکتہ کارپوریشن کے کونسلر بھی رہ چکے تھے اور اب ان کا کوئی خاص ذریعہ معاش نہ تھا۔

جواب طلبی

ماہ جولائی میں مجھ پر عتاب نازل ہوا۔ یو ایس آئی ایس دہلی نے کلکتہ آفس سے وضاحت طلب کی کہ وہ کون شخص ہے جو دفتر کی بدنامی کا باعث ہے۔ ہمارے دفتر کے لوگ ان خبروں سے تو باخبر تھے ہی میری ذات سے بھی اچھی طرح آگاہ تھے اور میری پشت پناہی پر آمادہ تھے۔ چنانچہ ہمارے پریس چیف مسٹر گنگولی نے مجھے بلا کر پہلے سمجھایا اور ڈھارس بندھائی کہ تم گھبراؤ نہیں ہم جانتے ہیں یہ کمیونسٹوں کا پروپگنڈا ہے لیکن تم یہ بتاؤ کہ تمہارے خیال سے یہ کارروائی کن لوگوں کی ہو سکتی ہے۔ تب میں نے ان کو اپنی تحقیق کے نتیجے سے آگاہ کیا اور بتایا

کہ مجھے ان دو اشخاص پر شک ہے جن کے نام مذکورہ جلسوں میں مقررین کی حیثیت سے پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب اس جگہ کے لیے جس پر میں کام کر رہا ہوں امیدوار بھی رہ چکے تھے۔

کوئی ہفتہ بھر کی خاموشی کے بعد گنگولی صاحب نے مجھے پھر بلایا اور کہا کہ ''رضوان تمہارا خیال بالکل ٹھیک تھا انہی دونوں کی یہ بدمعاشی ہے ہمارے ذرائع نے اس کی تصدیق کر دی ہے۔'' مجھے نہیں معلوم کہ انھوں نے دہلی کو کیا جواب لکھا۔

دہلی کی پیشکش

اگست کی ۲۷ ر تاریخ تھی میں حسبِ معمول یو ایس آئی ایس میں کام کر رہا تھا کہ گنگولی صاحب میری میز کے قریب آئے ان کے ساتھ ایک امریکی افسر بھی تھے جن کا تعارف کراتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ''یہ ہیں مسٹر میرین، یو ایس آئی ایس نئی دہلی کے انفارمیشن آفیسر۔ یہ تم سے کچھ گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔'' پھر مسٹر گنگولی اپنے کمرے میں واپس چلے گئے اور میرین صاحب نہایت بے تکلفی کے ساتھ مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ ''کس اخبار میں کام کرتے ہو؟ کیا لکھتے ہو؟ تمہاری دلچسپیاں اور مشاغل کیا ہیں؟ یو ایس آئی ایس میں کتنے عرصے سے ہو؟'' وغیرہ وغیرہ۔ آخر میں انہوں نے فرمایا کہ ''یو ایس آئی ایس دہلی میں ایک اردو ایڈیٹر کی جگہ خالی ہے کیا تم دہلی آنا پسند کرو گے؟''

یو ایس آئی ایس، کلکتہ میں کام کے ابتدائی دنوں سے ہی میرا نشانہ دہلی تھا۔ ۱۹۵۰ء میں جب اردو میں ہفتہ وار 'امریکن رپورٹر' کی اشاعت شروع ہوئی اس وقت اس کی ایڈیٹر شپ کے لیے میں نے کوشش بھی کی تھی اور اس وقت کے پریس چیف مسٹر کول نے مجھ سے وعدہ بھی کیا تھا لیکن اس جگہ پر بسنت کمار چٹر جی کا تقرر ہو گیا۔ ہم اور چٹر جی 'عصرِ جدید' میں ساتھ کام کر چکے تھے۔ وہ ۱۹۵۳ء میں کلکتہ سے دہلی آ گئے اور روزنامہ 'پرتاپ' میں کام کرنے لگے۔ وہ طبعاً سوشلسٹ تھے اس لیے یو ایس آئی ایس میں ان کا تقرر میرے لیے حیرت خیز تھا۔ کوئی اٹھارہ مہینے بعد ہی 'امریکن رپورٹر' کے سارے ایڈیشن بند ہو گئے پھر کچھ عرصہ بعد چٹر جی سویٹ

انفارمیشن آفس میں لے لیے گئے یہ دوسری حیرتناک بات تھی۔ وہاں وہ آخر وقت تک رہے۔

خیر ۱۹۷۵ء میں جب مجھے دہلی آنے کی پیشکش کی گئی تو میں نے چندلمحوں میں ہی اسے تسلیم کرنے کا فیصلہ کرلیا اس لیے کہ کلکتہ میں بھی حالات میرے لیے تقریباً ناسازگار ہو گئے تھے۔ ’آزاد ہند‘ میں ایک کشیدہ فضا تھی جس میں میں کام کر رہا تھا۔ سعید صاحب کا جی مجھ سے بھر گیا تھا لیکن براہِ راست جواب دینے میں ان کی مروت حائل تھی۔ میں دوبار کنارہ کشی کی کوشش کر چکا تھا جسے دوستوں اور بہی خواہوں نے ناکام کر دیا تھا۔ معلوم نہیں سعید صاحب کو اس کا علم تھا یا نہیں۔

بہرحال۔ جب میں نے میرین صاحب پر اپنی آمادگی ظاہر کر دی تو انہوں نے باقاعدہ انٹرویو شروع کر دیا۔ آخر میں یہ بھی کہا کہ ’’تم کلکتہ کی نرم آب وہوا کے عادی ہو لیکن دہلی کی آب وہوا شدید ہے۔‘‘ میں پھر بھی اپنی رائے پر قائم رہا۔ انھوں نے کہا کہ ’’اگر تمہیں کچھ پوچھنا یا کہنا ہوتو کہو۔‘‘ میں نے ایک تو تنخواہ کا گریڈ دریافت کیا جو ان کے بیان کرنے کے بعد مجھے معقول معلوم ہوا پھر میں نے ملازمین کی تخفیف کے بارے میں اپنے اندیشوں کا اظہار کیا۔ حکومت امریکہ کی ملازمت میں یہ کھٹکا ہمیشہ لگا رہتا ہے کہ نہ معلوم کب ملازمین کی تعداد کم کرنے کے لیے چھنٹائی کا اعلان کر دیا جائے جس کے بعد بعض معین اصولوں کے مطابق چھنٹائی ہو جاتی ہے اس کی زد میں کوئی بھی آ سکتا ہے۔ مقامی افسروں کے لیے کسمسانے کی تھوڑی بہت گنجائش رہتی ہے۔ اگر کسی کو بچانا چاہتے ہیں تو کوئی راہ نکال لیتے ہیں۔

میرین صاحب نے میرے سیدھے سوال کا سیدھا جواب دیا کہ ’’اس طرح کی تخفیف کے خلاف تو کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی، یہ خطرہ تو ہر کسی کو مول لینا ہی پڑتا ہے۔ تم اگر حلوائی کی دکان سے لڈو خریدتے ہو تو اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ وہ لڈو زہریلے نہیں ہوں گے، وہ تو گھر لے جا کر کھانے کے بعد ہی معلوم ہوگا۔‘‘ ان کی اس گفتگو کے بعد میں خاموش ہو گیا۔ یعنی بات پکی ہو گئی۔ میرین صاحب دہلی واپس چلے گئے۔

اس کے بعد مجھے درخواست کا فارم باضابطہ خانہ پری کے لیے دیا گیا اور اس طرح

ضابطے کی کارروائیاں شروع ہوگئیں۔ یعنی سرکاری ذرائع سے میرے بارے میں تحقیقات، حوالے دیئے ہوئے افراد کو خطوط لکھ کر میرے بارے میں معلومات کا حصول اور میڈیکل اکزامینیشن وغیرہ۔ اپنی صحت کو دیکھتے ہوئے مجھے طبی معائنے میں پاس ہونے کا یقین نہیں تھا لیکن اصلاً سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔

حوالوں کے طور پر 'عصرِ جدید' اور 'آزاد ہند' کے مالکان اور یو ایس آئی ایس کلکتہ سے رجوع کیا گیا۔ ظاہر ہے کلکتہ آفس نے موافقانہ جواب دیا ہوگا اس لیے کہ وہ لوگ مجھ پر بہت مہربان تھے مزید براں انھوں نے دیگر دونوں حوالوں کے مہر بند لفافے مجھے ہی دے دیے کہ ہاتھ کے ہاتھ لے جاؤ اور جواب بھی لیتے آؤ تاکہ بذریعہ ڈاک کارروائی میں وقت نہ ضائع ہو۔ احمد سعید صاحب نے قدرے توقف سے اور بذریعہ ڈاک جواب بھیجا لیکن خان بہادر صاحب نے ساری سابقہ بے مہریوں کا کفارہ ادا کردیا۔ انھوں نے میرے پاس کہلا بھیجا کہ اس سوالنامے کے حسبِ خواہ جوابات الگ کاغذ پر لکھ کر دے دو میں اسی کو ٹائپ کروا کر بھیج دوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ انھوں نے لکھ لکھا کر لفافہ میرے پاس بھیج دیا اور میں نے اس کو آفس میں پہنچا دیا۔

ان تمام کارروائیوں کی تکمیل میں کافی تاخیر ہوئی یہاں تک کہ نومبر کا مہینہ آگیا جبکہ میرا انٹرویو اگست میں ہوا تھا۔ اس تاخیر سے مجھے الجھن ہونے لگی تھی بلکہ کسی کسی وقت تو اس نئی ملازمت کے امکان ہی پر شک ہونے لگتا۔ جن دوستوں کو اس کا علم ہوگیا تھا وہ بھی شک کرنے لگے تھے، شاید اس کو میری ٹیپ سمجھنے لگے ہوں۔ اس طرح میں ایک عجیب گھٹن کی فضا میں سانس لے رہا تھا۔ بالآخر وسط نومبر میں ایک روز دہلی سے تقرر نامہ موصول ہوا کہ بس آکر جوائن کرلو۔

آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس

ادھر کلکتہ میں ایک بڑا تماشہ ہونے جا رہا تھا یعنی آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کا سہ روزہ اجلاس ۲۷ر نومبر کو شروع ہونے والا تھا جس کے مہتمم احمد سعید صاحب تھے جنہیں ریاستی

حکومت کی بھرپور پشت پناہی حاصل تھی اور مالی تعاون بھی چنانچہ کانفرنس کے سلسلے میں مصروفیات کی وجہ سے ان کو اخبار کی طرف دیکھنے کی بھی فرصت نہیں تھی اور کلکتہ میں کانفرنس ہونے کی وجہ سے اسی وقت اخبار پر زیادہ توجہ کی ضرورت تھی۔ میں بھی یہ تماشہ دیکھ کر ہی جانا چاہتا تھا چنانچہ میں نے احمد سعید صاحب کی گزارش کے مطابق نومبر کے آخر تک کلکتہ میں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔

یہ آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کا تیسرا اجلاس تھا جس کے انعقاد کا اہتمام رابندر سدن میں کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے اس کانفرنس کے دو اجلاس پٹنہ اور لکھنؤ میں ہو چکے تھے اس موقع پر مختلف اختلافات اور ذاتی رنجشیں شروع سے ہی کانفرنس کے مقاصد پر غالب رہیں۔ احمد سعید ملیح آبادی ایڈیٹر 'آزاد ہند' اس اجلاس کے روح و رواں تھے۔ انھوں نے کانفرنس کے چند خاص ڈیلی گیٹوں کے قیام کا انتظام گریٹ ایسٹرن ہوٹل میں کیا اور بقیہ بیشتر مہمانوں کو اسلامیہ ہائی اسکول میں ٹھہرایا۔ ان لوگوں نے اس امتیاز کو اپنی توہین پر محمول کیا اور افتتاحی اجلاس کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔ جناب کلدیپ نیر کو جب اس کا علم ہوا تو وہ خود وہاں گئے اور وہاں موجود ڈیلی گیٹوں کو سمجھا بجھا کر اجلاس میں شرکت پر راضی کر لیا۔

اس اجلاس سے خطاب کرنے والوں میں شیخ محمد عبداللہ، وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر اور ان کے دست راست مرزا افضل بیگ، مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات ودیا چرن شکلا اور کئی اہم مرکزی اور ریاستی شخصیات شامل تھیں۔ وزیر اعلیٰ مغربی بنگال سدھارتا شنکر رے کی موجودگی بھی ناگزیر تھی۔ انہیں مسٹر کلدیپ نیر کی موجودگی اور کانفرنس میں شرکت پر سخت ناگواری تھی کیونکہ وہ مسز اندرا گاندھی کی نظر میں ناپسندیدہ تھے لیکن چونکہ وہ آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کے بانی صدر تھے اس لیے انہیں اس میں شرکت سے باز نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ دوسری طرف یہ بات کھل کر سامنے آئی تھی کہ حکومت مغربی بنگال نے اس کانفرنس کے لیے ایک لاکھ روپیہ کی منظوری دی تھی اس لیے بھی وزیر اعلیٰ کا دباؤ شدید تھا۔

حکومت کی طرف سے اس رقم کی منظوری کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ حکومت ایمرجنسی کی

تائید میں اس کانفرنس سے ایک تجویز پاس کرانا چاہتی تھی اور ایسا ہوا بھی۔ ایک تجویز میں ایمرجنسی کی صرف تائید نہیں کی گئی بلکہ اسے ملک وقوم کے لیے باعثِ برکت اور اندرا گاندھی کی طرف سے قوم کی خدمت قرار دیا گیا۔ اس تجویز کا بہتیرے ڈیلی گیٹوں کی حلق سے نیچے اترنا مشکل تھا لیکن ایمرجنسی کے دوران ان کے لیے بے بسی اور خاموشی کے علاوہ چارہ بھی نہیں تھا۔ اتنا ہی نہیں، ہمارے ہر اجتماعی کام میں الزام تراشیوں اور تہمتوں کی جو روایت رہی ہے اس کو بھی اس موقع پر اور اس کے بعد بھی خوب خوب برتا گیا۔ احمد سعید صاحب پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ انھوں نے حکومت کی عطا کی ہوئی رقم کو من مانے خرچ کیا، مجلسِ استقبالیہ کے کسی رکن کو اس بارے میں کوئی علم نہیں، اسی وجہ سے مجلس استقبالیہ کا دفتر 'آزاد ہند' کے نئے دفتر میں قائم کیا گیا جہاں اخبار کے عملے کے چند معتمد افراد کے علاوہ کسی کی رسائی نہیں تھی اور احمد سعید صاحب نے پھر اراکینِ مجلس کا سامنا نہیں کیا، شدید علالت کا بہانہ کر کے روپوش ہو گئے وغیرہ وغیرہ۔

اردو والوں کی ایک روایت یہ بھی ہے کہ ان کی ادبی اور ثقافتی تقاریب کا اختتام عموماً مشاعرے پر ہوا کرتا ہے۔ ایک طرح سے یہ اچھا بھی ہے تاکہ سابقہ کارروائیوں کے دوران جو تلخیاں پیدا ہوئی ہوں یا فروگزاشتیں ہوئی ہوں ان کا احساس شعر و شاعری کی شیرینی میں حل ہو کر کچھ کم ہو جائے اور لوگ خوشی خوشی اپنے گھروں کو واپس جائیں، چنانچہ اس ایڈیٹرس کانفرنس کا اختتامی مشاعرہ بھی ہوا لیکن یہ عام مشاعروں سے بایں معنی مختلف ثابت ہوا کہ اس موقع پر وزیر اعلیٰ مغربی بنگال سدھارتا شنکر رے نے مغربی بنگال میں اردو اکاڈمی کے قیام کا اعلان کیا جو کہ واقعی ایک اہم واقعہ تھا۔ ۱۹۷۸ء میں یہ اکاڈمی حقیقتاً وجود میں آ گئی اور اب اپنی عمارت میں قائم ہے اور اس کی گوناگوں کارروائیاں جاری ہیں۔ اگر اس کانفرنس کے سلسلے میں بعض ناخوشگواریوں کا احمد سعید صاحب کو ذمہ دار قرار دیا جائے تو اس خوشگوار اور دور رس فیصلے میں کارفرمائیوں کا کریڈٹ بھی انہی کو دیا جانا چاہئے۔ اس کانفرنس کی روداد طویل ہے جس کی تفصیلات کو تحریر کرنا سعیِ لاحاصل ہوگی لیکن اس کے پس منظر کا ایک جائزہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

پس منظر:

جیسا کہ لکھ چکا ہوں آزادی کے بعد کے برسوں اور عشروں میں مسلم مدیران اخبارات کے پاس کہنے سننے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا تھا، پے در پے جراحتوں اور زخموں کو چاٹنے کے سوا کوئی خاص کام بھی نہیں رہ گیا تھا۔ آزادی اور مساوات کے ہزار دعووں کے باوجود راہیں ہر طرف مسدود تھیں۔ مسلم سرمائے کا بھی کوئی بڑا مفید مصرف نہیں نظر آرہا تھا۔ دنیائے صحافت میں جو تحریکات چلیں اور لہریں اٹھیں ان سے بھی کوئی خاص سروکار نہ تھا۔ ایسے میں کانگریس پارٹی نے جس کا اقتدار تقریباً سارے ملک میں جاری وساری تھا مسلمانوں کو بے وزن اور بے وقعت سمجھ کر انھیں پرانے کپڑوں کی طرح ایک طرف ڈال دیا تھا لیکن ''ہر ووٹر کا ایک ووٹ'' کانگریس پارٹی کے لیے ایک طرح اور مسلمانوں کے لیے دوسری طرح آڑے آرہا تھا۔ حکمراں کانگریس پارٹی کے ہاتھوں مغربی بنگال کے مسلمان بڑے کاری زخم کھائے ہوئے تھے۔ ۱۹۶۷ء کے عام انتخابات میں اس کا انتقام لینے کا انہیں موقع مل گیا۔ ان کے ۲۰ تا ۳۰ فیصد ووٹ نے کانگریس کو ٹھکانے لگا دیا۔ بنگلہ دیش کے وجود میں آنے کے بعد مسز اندرا گاندھی کو کسی نے درگا کا سروپ کہا، کسی نے بھارت ماتا ہی کا درجہ دے دیا لیکن ان تمام کامرانیوں کے باوجود بنگال کے غیر مسلم ووٹر اتنے متاثر نہیں ہوئے، نہ موثر ہو سکے کہ ۲۰-۳۰ فیصد مسلم ووٹروں کے گھاٹے کو پورا کر سکتے۔ پارٹی کے اندر سنجیدہ اور سمجھدار حلقوں کو اس صورت حال سے خاصی تشویش تھی اور وہ مسلمان ووٹروں کی ناراضگی دور کرنے کی صورتوں پر غور کر رہے تھے۔

۱۹۷۲ء کے عام انتخابات میں کانگریس پارٹی کا اور بھی برا حال ہوا۔ بائیں بازو کی پارٹیوں کی جڑیں مضبوط ہوگئیں۔ آگے چل کر جون ۱۹۷۵ء میں اندرون ملک ایمرجنسی کے نفاذ اور اس کے تحت اخباروں پر سنسر شپ کی پابندی اور مسلمانوں کے خلاف بالخصوص استبدادی کارروائیوں نے تلخیاں اور بھی بڑھا دیں۔ اسی اثنا میں اگست ۱۹۷۵ء میں بنگلہ دیش میں شیخ مجیب الرحمٰن کے خلاف بغاوت ہوگئی اور ان کے افرادِ خاندان قتل کر دئے گئے۔

آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کے اجلاس کو جو نومبر ۱۹۷۵ء میں ہوا مذکورہ بالا پس

منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ کانگریس پارٹی کو ملک بھر کے مسلمان مدیران اخبارات سے رجوع کرنے، پارٹی کے تئیں ان کے رویہ میں نرمی لانے، بہ الفاظ دیگر انھیں ہم خیال بنانے اور خوش کرنے کا اچھا موقع تھا۔ چونکہ مدیران اخبارات حکمراں پارٹی کی پالیسیوں کی تائید کرنے کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے تھے اس لیے جاری ایمرجنسی کی تائید میں ان سے چند کلمۂ خیر کہلوانے کا بھی اچھا موقع تھا، جیسا کہ کانفرنس کی ایک قرارداد میں کہا بھی گیا۔ دوسری طرف اردو ایڈیٹروں کو بھی حکومت سے سودے بازی کرنے اور کچھ سرخروئی حاصل کرنے کا موقع مل گیا چنانچہ یہ ایک طرح کی امدادِ باہمی کانفرنس تھی۔ چونکہ بہتیرے بگولے اندر ہی اندر اٹھ رہے تھے اور باہر نہیں آسکتے تھے اس لیے ان کا اظہار اس طرح ہو کہ کانفرنس کے دوران شروع سے آخر تک قدم قدم پر مخالفتوں اور رکاوٹوں کا سامنا ہوا۔

ایک نکتہ

اس وقت ایک خاص نکتے کی طرف بھی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ اس کلکتہ کانفرنس سے پہلے اردو ایڈیٹروں کی دو کل ہند کانفرنسیں پٹنہ اور لکھنؤ میں ہو چکی تھیں۔ اس کے بعد بھی ملک گیر پیمانے کی اور علاقائی سطح کی کانفرنسیں ہوتی رہیں۔ اس سے کم درجے کی کارروائیاں مثلاً کسی وزیر سے اردو ایڈیٹروں کے کسی وفد کی ملاقات یا کسی اونچی سطح کے ڈیلی گیشن کی گزارشات وغیرہ لیکن ایسی تمام کارروائیوں میں صرف مالکانہ مفادات کی نمائندگی ہوتی رہی، انھی کے فائدوں کی تجویزیں، مشورے اور مطالبات پیش کئے جاتے رہے۔ مثال کے طور پر اردو اخباروں کے لیے زیادہ سرکاری اشتہارات، نیوز پرنٹ کوٹا میں ممکنہ مراعات، باہر جانے والے ڈیلی گیشنوں میں اردو ایڈیٹروں کی شمولیت وغیرہ۔ کہیں ایسی کسی کارروائی کا ذکر نہیں ملتا جس کا تعلق عام اردو صحافیوں کے لیے کسی طرح کی منفعت سے ہو۔ یہ ایک بڑی تلخ حقیقت ہے۔ عموماً اردو ایڈیٹر کا مطلب ہے اخبار کا مالک، بہ استثنائے چند۔ ان کی طرف سے جب فائدوں کا مطالبہ اور تقاضہ کیا جاتا ہے تو آخر ان سے یہ کیوں نہیں پوچھا جاتا کہ اس میں دیگر کارکن صحافیوں کا حصہ کتنا ہے۔ یعنی ان کے کام کے حالات کیسے ہیں سہولتیں اور مراعات کیا کیا ہیں۔ جب

پریس کمیشن کی سفارشات کے نفاذ کے سوال پر اردو اخباروں میں مالک ایڈیٹروں اور کارکن صحافیوں کے درمیان تنازعات پیدا ہوئے تو ان کو کیوں بڑھنے دیا گیا؟ ایڈیٹروں کی تنظیموں نے مداخلت کر کے مصالحت کی راہیں کیوں نہیں نکالیں؟ میں تلخ حقیقتوں کا شاہد ہوں اس لیے ہر موقع پر یہ شکایتیں اپنے اظہار کے لیے میری زبان اور قلم سے کام لیتی ہیں۔ میں اسے حق بجانب سمجھتا ہوں اور اس کے لیے کسی معذرت کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اپنے لوگوں نے اپنے صاحب ذہن افراد کا جس طرح خون کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے اغیار کا شکوہ ہیچ نظر آتا ہے۔

۱۹۷۵ء میں اخبارت کی فہرست

ہندوستانی اخبارات ورسائل کے متعلق رجسٹرار آف نیوز پیپرس کی ایک سالانہ رپورٹ شائع ہوتی ہے۔ پہلے اس کے دو حصے ہوا کرتے تھے (اب ایک ہی مکمل رپورٹ ہوتی ہے) پہلے حصے میں مختلف جائزے، اعداد وشمار اور گوشوارے ہوا کرتے تھے اور دوسرے حصے میں فرداً فرداً ہر اخبار، پرچے، رسالے سے متعلق جملہ تفصیلات ہوا کرتی تھیں، چنانچہ یہ دوسرا حصہ خاسا بھاری بھرکم ہوتا تھا یہ حصہ ۱۹۹۲ء میں آخری بار شائع ہوا۔ اب رجسٹرار آف نیوز پیپرس کی جو رپورٹ شائع ہوتی ہے وہ محض مختلف جائزوں اور گوشواروں پر مشتمل ہوتی ہے اس لیے اس کی ضخامت بھی کم ہوگئی ہے۔ ۱۹۷۵ء کے اخباروں کے متعلق اس رپورٹ میں (جو ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی) ریاست مغربی بنگال میں اردو کے حسب ذیل اخبارات کا اندراج تھا۔

روزنامے: 'آزاد ہند'، 'عصرِ جدید'، 'روزانہ ہند'، 'آبشار'، 'امروز' اور 'غازی'۔

ہفتہ وار: 'اجالا'، 'فلم ویکلی'، 'عکاس'، 'آرزو ہند'، 'ہلال'، 'کسان مزدور' اور 'بیراگ'۔

پندرہ روزہ: 'مغربی بنگال'، 'ہوڑہ ٹائمز'، 'اسپورٹس'، 'نجشیات'، 'تجزیہ' اور 'واسطہ'۔

ماہنامے: 'خالدِ خزانہ'، 'مشرقی ہند'، 'محرک'، 'روپ چھایا'، 'سبد گل'، 'شھوذ' اور 'شفاء الملک'۔ ان اخباروں کی تفصیلات حسب ذیل ہیں:

'آزاد ہند' سال اجراء (۱۹۴۸ء) ایڈیٹر احمد سعید ملیح آبادی، 'عصرِ جدید' سال اجراء (۱۹۳۹ء) ایڈیٹر اقبال اکرامی، 'روانہ ہند' سالِ اجراء (۱۹۲۹ء) ایڈیٹر رئیس الدین فریدی،

'آبشار' سالِ اجراء (۱۹۵۵ء) ایڈیٹر ابراہیم ہوشؔ، 'امروز' سالِ اجراء (۱۹۵۱ء) ایڈیٹر اقبال اکرامی، 'غازی' سالِ اجراء (۱۹۶۲ء) ایڈیٹر وقار مشرقی، 'اجالا' سالِ اجراء (۱۹۴۸ء) ایڈیٹر احمد سعید ملیح آبادی، 'فلم ویکلی' سالِ اجراء (۱۹۵۷)، ایڈیٹر محمد وسیم الحق، 'عکاس' سالِ اجراء (۱۹۶۶ء) ایڈیٹر کریم رضا مونگیری، 'آرزو ہند' سالِ اجرء (۱۹۶۶ء) ایڈیٹر جاوید حسن، 'کسان مزدور' سالِ اجراء (۱۹۶۸ء) ایڈیٹر محمد امین، 'اسپورٹس اسکرین' سالِ اجراء (۱۹۷۱ء) ایڈیٹر ارشد عالم، 'ندائے جنگ' سالِ اجراء (۱۹۷۴ء) ایڈیٹر محمد وزیر احمد خاں، 'مغربی بنگال' سالِ اجراء (۱۹۵۴ء) ایڈیٹر پی ایس ماتھر، 'واسطہ' سالِ اجراء (۱۹۶۹ء) ایڈیٹر منصور انجم، 'ہوڑہ ٹائمز' سالِ اجراء (۱۹۷۰ء) ایڈیٹر قیصر شمیم، 'بخشیات' سالِ اجراء (۱۹۷۰ء) ایڈیٹر شفیع نشاط، 'تجزیہ' سالِ اجراء (۱۹۷۳ء) ایڈیٹر محمد یوسف اختر، 'اسپورٹس انڈیا' سالِ اجراء (۱۹۷۵ء) ایڈیٹر محمد حسن، 'جینا سیکھو' سالِ اجراء (۱۹۵۹ء) ایڈیٹر اے. بی گرودیو، 'حسن وصحت' سالِ اجراء (۱۹۶۳ء) ایڈیٹر محمد کلیم الدین، 'خالد خزانہ' سالِ اجراء (۱۹۶۳ء) ایڈیٹر سمیع احمد، 'سبد گل' سالِ اجراء (۱۹۶۹ء) ایڈیٹر حیدر علی، 'شفاء الملک' سالِ اجراء (۱۹۶۵ء) ایڈیٹر حکیم سید محمد یونس، 'عاقبت' سالِ اجراء (۱۹۶۵ء) ایڈیٹر شہود عالم آفاقی، 'روپ چھایا' سالِ اجراء (۱۹۷۳ء) ایڈیٹر قائدین احمد خاں، 'محرک' سالِ اجراء (۱۹۷۴ء) ایڈیٹر قیوم انیس، 'مشرقی ہند' سالِ اجراء (۱۹۷۴ء) ایڈیٹر جمال غنی۔

کلکتہ کو الوداع:

اتوار ۳۰ رنومبر کی شام کو کلکتہ سے بذریعہ ٹرین روانہ ہو کر سوموار پہلی دسمبر کی شام کو میں دہلی پہنچا۔ ایک تو ٹھنڈک کلکتہ کی بہ نسبت زیادہ تھی، دوسرے رات کا وقت، تیسرے ایمرجنسی کا زمانہ، چوتھے جامع مسجد کے اطراف میں صفائی اور توڑ پھوڑ کی مہم کے دوران شہر کی فضا میں کشیدگی اور سب سے بڑھ کر یہ بات کہ میں دہلی کی شہری زندگی کے نشیب وفراز سے کوئی خاص واقفیت نہیں رکھتا تھا۔ پرانی دہلی اسٹیشن پر اترا، باہر آیا رکشا لیا اور جامع مسجد کے لیے روانہ ہو گیا اور وہاں ایک ہوٹل میں فروکش ہوا۔ وہ ناز ہوٹل تھا جس کا نام میں نے سعید صاحب سے

سن رکھا تھا۔ چھوٹا لیکن صاف ستھرا ہوٹل۔

اگلے دن یعنی ۲ر دسمبر کو منگل کے دن صبح سویرے ناشتے سے فراغت کے بعد یو ایس آئی ایس کے لیے چل پڑا۔ ایک اسکوٹر لیا اور کرزن روڈ پر واقع، جواب کستور با گاندھی مارگ ہے، یو ایس آئی ایس پہنچا۔ اس وقت تک ملک کے اندر اور باہر لوگ دہشت گردی کی وبا سے ناآشنا تھے اس لیے اس کے تدراک کی تدبیروں کا کوئی سوال ہی نہ تھا چنانچہ لوگ دفتر کے اندر باہر بلا روک ٹوک آتے جاتے تھے۔ میں نے رسپشن پر پہنچ کر اپنا تعارف کرایا، اس نے لفٹ کی طرف اشارہ کیا کہ اوپر جائیے۔ میں اس وقت کے پریس چیف کول صاحب کے پاس جانے کے لیے لفٹ کے انتظار ہی میں تھا کہ پیچھے سے کسی نے کندھے پر ہاتھ رکھا، وہ تھے مسٹر وی پی سنگھ جو اس وقت ہندی ایڈیٹر تھے۔ چونکہ دہلی والے کلکتہ آتے جاتے رہتے تھے اس لیے میں ان لوگوں سے اور وہ لوگ مجھ سے اچھی طرح واقف تھے۔ وی پی صاحب بھی انہی لوگوں میں سے تھے۔ وہ مجھے کول صاحب کے پاس لے گئے اور اس طرح میں یو ایس آئی ایس، دہلی میں داخل ہو گیا۔ اسی دن ایمبسی میں جا کر میں نے ضابطے کی کارروائیاں مکمل کیں، واپس آ کر مسٹر میرین سے ملاقات کی وہی میرین صاحب جنھوں نے کلکتہ میں میرا انٹرویو لیا تھا۔ اب وہی میرے باس تھے۔ وہ کلکتہ میں نہیں کھلے تھے لیکن دہلی آنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ نہایت شستہ اردو بول سکتے تھے۔ بچپن میں ان کی تعلیم دہرہ دون میں ہوئی تھی جہاں ان کے والد ایک مشنری پادری تھے، اس زمانے میں انگریزی اسکولوں میں اردو کی تعلیم لازمی تھی چنانچہ وہ اچھی اردو جانتے تھے۔

اس طرح ۲ر دسمبر ۱۹۷۵ء کو میں نے ایک نئے کیریئر کی ابتدا کی۔ جون ۱۹۵۱ء میں کلکتہ میں جو کیریئر میں نے اختیار کیا تھا اس میں ۲۴ برس سے زائد عرصہ تک پاپڑ بیلنے کے بعد اسے پیچھے چھوڑ آیا تھا لیکن جس طرح اسے پیچھے چھوڑ کر آیا تھا وہ بھی ناقابلِ فراموش ہے۔ ۳۰ر نومبر کی شام کو ہوڑہ اسٹیشن پر مجھے الوداع کہنے کے لیے صرف بدر عالم نظامی آئے تھے جو صرف ہم پیشہ نہیں بلکہ کچھ قرابت بھی رکھتے تھے اور قربت بھی، جس کا اظہار وہ پہلے بھی کر چکے

تھے، ان کے علاوہ کوئی شخص ایسے میں میرا شریکِ حال نہ تھا کہ جب میں ۲۴ر برس تک ایک معروف پیشے میں لگے رہنے کے بعد شہر کو چھوڑ کر 'بظاہر ہمیشہ کے لیے' جا رہا تھا نہ اس مستقل ہجرت سے پہلے کوئی ایسی تقریب یا کوئی ایسی بات ہوئی جس سے یہ گمان گزرتا کہ کچھ لوگوں سے میری شناسائی بھی رہی ہے۔ میں دہلی آنے کے بعد اکثر حیرت کے ساتھ سوچتا رہا کہ میری کمزوری تھی، یا میرے حلقے کی، یا میرے ہم پیشہ لوگوں کی، یا یہ ایک بہت بڑے شہر کی سردمہری تھی۔

مراجعت

کلکتہ سے میرا جو رشتہ قائم ہوا تھا وہ قلمی سے زیادہ قلبی تھا اس لیے وہ ناقابل شکست تھا۔ دہلی چلے آنے کے بعد سال میں ایک بار کلکتہ جانے کا معمول بنا لیا اور کبھی کبھی اخباروں کے لیے دفتری یا ذاتی مضامین بھی لکھتا رہا۔ آخری بار ۱۹۹۱ء میں گیا۔ بعد میں اسی سال دل کے دورے کے بعد یہ سلسلہ قائم نہ رکھ سکا حالانکہ اگلے برس ۱۹۹۲ء میں ریٹائرمنٹ سے ایک ماہ قبل ہماری ڈائریکٹر لنڈا جویل نے جو بیحد مہربان تھیں مجھ سے کہا کہ کلکتہ جا کر اپنے دوستوں کو الوداع کہہ آؤ۔ ہمارے سفر نہایت پر آسائش ہوا کرتے تھے، قیام اور آمدورفت کی سہولتوں کا بھی دفتری انتظام ہوتا تھا لیکن بیماری اور دواؤں کے مسلسل استعمال کی وجہ سے بھی اتنی کمزوری آ گئی تھی کہ سفر کی ہمت نہ کر سکا۔ وہ تو دفتر والوں کی انتہائی مہربانیاں تھیں کہ ریٹائرمنٹ تک پہنچنے کے لیے درکار دس ماہ کی مدت گزار لی۔ وہ کوئی 'عصرِ جدید' کا دفتر تو تھا نہیں جہاں اٹھارہ برس کاٹنے کے بعد عین بیماری کی حالت میں مجھ پر دروازے بند کر دئے گئے اور واجبات کے نام پر ایک پیسہ نہیں دیا گیا۔

خیر! ریٹائرمنٹ کے بعد کچھ عرصہ تو ایک گمشدگی کے عالم میں گزرا پھر میں نے پر پرزے نکالے اور کلکتہ سے رشتوں کی تجدید کی۔ ایک کالم لکھنے کے خیال سے اس کا ایک عنوان ''پس چہ باید کرد'' تجویز کیا اور اسی عنوان کے تحت 'آزاد ہند' اور 'اخبارِ مشرق' کے لیے مختلف موضوعات پر الگ الگ مضامین لکھنے لگا۔ لیکن شاید طبیعت میں استحکام نہیں رہ گیا تھا۔ چنانچہ

خیال ہوا کہ میں جہاں ہوں وہیں لکھنا چاہیے اس طرح 'قومی آواز' کے لیے لکھنے لگا۔ اسی اثناء میں مزاج نے عجب کروٹ لی۔ طنز ومزاح کی ڈگر پکڑ لی۔ بیماریوں کے ضمنی اثرات بھی تو ہوتے ہیں۔ بہت سارے مضامین لکھنے کے بعد ان کا ایک انتخاب کتابی شکل میں شائع کرنے کا خیال آیا۔ ''بے ادبیات'' کی شکل میں اس کی صورت گری ہوئی۔

لیکن کلکتہ طرح طرح سے دامن گیر تھا۔ وہاں کے مشہور وممتاز معالج پروفیسر مقبول احمد ایف آر سی ایس دہلی تشریف لائے اور مجھ سے ملاقات ہوئی تو اپنی تصنیف ''مضامین مقبول'' کا انگریزی میں ترجمہ کرنے پر مصر ہو گئے پھر میری کوئی معذرت سننے کو تیار نہ ہوئے۔ یہ کام میرے لیے بڑا بھاری تھا۔ یہاں 'ملی گزٹ' کے لیے ایک کالم لکھ رہا تھا، نیشنل اردو یونیورسٹی کا کچھ کام بھی ہاتھ میں تھا اس لیے ڈاکٹر صاحب کی کتاب کے ترجمہ کا کام لمبا کھینچا کوئی دو برس میں اس کی اشاعت مکمل ہوئی۔ بس اس کے فوراً بعد ڈاکٹر صاحب اپنی خودنوشت سوانح حیات ''صدائے جرس'' کا ترجمہ کرنے پر بھی اصرار کرنے لگے۔ اس کام کو میرے سپرد کر کے خود کناڈا اپنے بچوں کے ہاں چلے گئے۔ میں نے مرجی کر اس کام کو بھی کوئی ڈیڑھ برس میں نمٹایا۔ جوں جوں ترجمہ ہوتا گیا ان کے دئے ہوئے پتے پر ای میل کرتا گیا جسے انھوں نے پسند بھی کیا۔ ٹیلیفون پر ستائش کی۔ فروری ۲۰۰۴ء میں یہ کام مکمل ہو گیا لیکن ڈاکٹر صاحب کی صحت بھی بہت خراب چل رہی تھی اسی سال ستمبر میں موصوف کا انتقال ہو گیا پھر اس کتاب کی اشاعت یا مسودے کے بارے میں کسی سے کچھ نہیں سنا گیا۔ اس محنت کے رائیگاں جانے کا بہت افسوس ہوا۔

لیکن کلکتہ کے جس قلبی تعلق کا ذکر کر رہا تھا اس نے عجب عجب شکل اختیار کی ''اوراقِ مصور'' جو اس شہر کو ایک منظوم خراج ہے، اشاعت پذیر ہوئی۔ اب موجودہ تصنیف کا عمل جاری ہے یہ بھی ایک طرح کی باج گزاری ہے۔

■❖■

باب ششم

دوسرا حصہ

عہدِ نو

کلکتہ کی اردو صحافت کی دو حصوں میں تقسیم کی بات کر چکا ہوں۔ پہلے حصے کے تذکرے کے بعد اب دوسرے حصے کی بات کرنا چاہتا ہوں۔ پہلے حصے میں بھی نئے دور کے آغاز کا اعلان کیا گیا ہے لیکن اُس وقت نئے دور کا مطلب تھا آزادیِ وطن کے جلو میں اخبارات کو حاصل ہونے والی آزادیوں، اختیارات اور ذمہ داریوں کی تقسیم، پریس کمیشن کا تقرر، رجسٹرار آف نیوز پیپرس کے تحت اخبارات کے ایک مستحکم اور مربوط قومی نظام کا قیام وغیرہ۔ ان بدلے ہوئے حالات سے ہمارے اخبارات اور صحافی جس طرح نبردآزما ہو رہے تھے میں نے انہی کی عکاسی کی کوشش کی۔ اب جس عہدِ نو کی بات کر رہا ہوں اس کے خواص بہت مختلف ہیں۔ انہیں ایک جملے میں بیان کرنا چاہوں تو کہوں گا کہ اس عہد کے آتے آتے ''پریس'' ایک وسیع تر نظام ''میڈیا'' کا ایک حصہ بن گیا۔ اس میں شامل بھی رہا اور اس سے الگ اپنے وجود کو بھی ''پرنٹ میڈیا'' کے نام سے برقرار رکھا۔ اس نئے نظام کا دوسرا انگ ''الکٹرانک میڈیا'' کہلایا۔ یہ باتیں ہمارے موضوع سے ذرا دور کی ہیں لیکن ہمارے اخبارات کو اصل تناظر میں دیکھنے کے لیے انہیں بیان کرنا ضروری ہے۔ اب ''پریس سے میڈیا تک'' کے سفر سے قطعِ نظر صرف پریس کے داخلی سفر پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ یہاں بھی صحافت نے بحیثیت مجموعی رہِ دراز طے کی ہے۔ ہمیں اپنی صحافت کو اس آئینے میں بھی دیکھنا ہوگا۔

آزادیِ تحریر سے اس منظر کا آغاز ہوا تھا اور تحقیقی، تفتیشی صحافتوں کی پُرخطر راہوں سے گزرتا ہوا اطلاع کے حصول کے استحقاق کی منزل تک پہنچا۔ دوسری طرف ٹیکنالوجی کی برق

رفتاری نے طباعت واشاعت کی راہ میں ساری رکاوٹیں دور کر کے ہر ناممکن کو ممکن بنا دیا۔شوق سفر اور تیز ہوا تو صحافت کی ''عبقر یت عقر بیت'' کی حدوں میں داخل ہوگئی اور سیاسی اور سماجی زندگی کے عفریت اس کی نیش زنی Sting Operation سے تڑپنے لگے۔ہم اپنی جس صحافت کی بات کرتے آئے ہیں اس میں ان جسارتوں کا خواب بھی نہیں دیکھا جا سکتا۔تاہم جس عہد نو کی ہم بات کر رہے ہیں اس کے انکھوئے ۱۹۷۰ء کے عشرے کے وسط میں پھوٹے اور برگ و بار لانے کے عمل میں کچھ اور وقت لگا۔

اخبارمشرق کا نیا باب

بنگلہ دیش کے وجود میں آنے کے بعد ہندوستان میں مسلم ذہن بالعموم مستحکم ہوگیا۔ ایسے میں اردو صحافت کے آفاق پر نئی صبح کے آثار نمایاں ہوئے لیکن ملک میں ایمرجنسی کے نفاذ کی وجہ سے اس کے مظاہر کے سامنے آنے میں توقف ہوا۔ بہر حال محمد وسیم الحق کی ادارت اور ملکیت میں روزانہ 'اخبارِ مشرق' کی اشاعت کا آغاز اپریل ۱۹۸۰ء میں ہوا جس کی تیاریاں وسیم صاحب کئی برس پہلے سے کئے بیٹھے تھے۔وہ معاشیات کے طالبِ علم تھے اس لیے اس کے اصولوں سے اچھی طرح واقف تھے لیکن عملی تجربات اور مشقیں بھی ساتھ ساتھ کرتے جا رہے تھے۔شانتی رنجن بھٹا چاریہ نے ۱۹۵۶ء میں 'فلم ویکلی' نکالا تھا، کوئی دو برس بعد وہ اس کی ملکیت اور ادارات سے وسیم صاحب کے حق میں دست بردار ہو گئے۔پھر وہ اپنے برادر عزیز جسیم الحق کو ساتھ لے کر اس ہفت روزہ کی آبیاری کرنے لگے۔آگے بڑھے، ایک اور جسارت کی۔۱۹۶۸ء میں ایک انگریزی ہفت روزہ 'اسٹر گل' نکالا۔وہ پرچہ کوئی چار برس جاری رہا۔میں بھی اس میں اپنے حصے کا کچھ کام انجام دیتا رہا۔وسیم صاحب کی ایک خوش قسمتی ان کی نصف بہتر کی صورت میں سامنے آئی۔وہ سی ایم او ہائی اسکول میں لڑکیوں کے سکشن میں ٹیچر تھیں۔انھوں نے وسیم صاحب کی توانائیوں کو خانگی امور کے بہتیرے خرخشوں سے آزاد کر دیا۔

بہر حال 'اخبارِ مشرق' کی اشاعت شروع ہونے کے ساتھ ہی کلکتہ کی اردو صحافت میں کئی نئے باب کھلے۔اردو اخبارات کے قاری کو آفسٹ پر چھپے ہوئے اخبار کا صاف ستھرا چہرہ

دیکھنے کو ملا۔ ان کا اشتیاق بڑھا، اخبار کی اشاعت رفتہ رفتہ بڑھنے لگی۔ ادارتی پالیسی کے معاملے میں بھی 'اخبارِ مشرق' نے بند ھے ٹکے ڈھرے سے کسی قدر گریز کیا، اپنی آزادانہ اور غیر جانبدارانہ پالیسی کا اعلان کر دیا۔ کلکتہ کے اردو اخبارات کے بارے میں تفصیل کے ساتھ لکھ چکا ہوں کہ ان کی پالیسی حکمراں پارٹی کی ہاں میں ہاں ملانے سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ ان کے لیے اس کے سوا چارہ نہ تھا۔

۱۹۷۰ء کی دہائی میں بائیں بازو کی پارٹیوں کی مضبوط حکومت بن جانے کے بعد 'عصرِ جدید' کے لیے گھٹن کا جو ماحول پیدا ہوا وہ بالآخر اس کے لیے اور اس سے پہلے 'امروز' کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ 'آزاد ہند' نے بہ کمال فراست نئے حکمرانوں سے ربط ضبط بڑھا کر ان سے رشتے استوار کر لیے اور زندگی کی ضمانت بھی حاصل کر لی جس کی ظاہری شکل سرکاری اشتہارات کا تسلسل تھا۔ 'اخبارِ مشرق' نے مسلم مفادات کی ترجمانی اور تحفظ کو اپنی پالیسی کا محور بنایا اور اس سوال پر کسی طرف جھکنے سے انکار کر دیا اس کی غیر جانبدارانہ پالیسی کا مطلب یہی تھا، لیکن ایسی کوئی پالیسی دائیں بائیں کسی بھی حکمراں جماعت کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہوسکتی تھی۔ ریاست کے سیاسی حالات نے ایسی کروٹ لی تھی کہ کانگریس بے بس اور بے اثر ہوکر رہ گئی تھی، حکمراں مارکسی کمیونسٹ پارٹی ایک طرف کانگریس سے تو دوسری طرف نکسلیوں سے نبرد آزما تھی، مسلمانوں کے تئیں اس کا رویہ یقیناً پہلے کی بہ نسبت نرم تھا اس لیے انھیں مسلم اخبارات سے مکمل تائید کی امید تھی۔ لیکن 'اخبارِ مشرق' نے جب اس راہ سے روگردانی کی تو اس کی سرزنش کو ضروری سمجھا۔

یہی وہ مقام ہے جہاں سے وسیم صاحب کی ایک نئی آزمائش شروع ہوئی اور اپنے اخبار کی اعلان کردہ پالیسی پر قائم رہنے کے عزم کا امتحان شروع ہوا۔ ابتدائی برسوں میں اخبار نے کسی سخت موقف اور شدید رویہ کا اظہار نہیں کیا تھا اس کی ایک وجہ ادارتی لب ولہجہ بھی تھا غالباً اس ادارتی عمل میں راقم لکھنوی وسیم صاحب کے شریک کار تھے۔ ان دونوں ہی حضرات سے زبان و بیان میں نرمی ہی کی امید رکھی جاسکتی تھی لیکن بہرحال اس کے ذمہ دار وسیم صاحب تھے۔

جب انھوں نے اظہار میں شدت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تو اپنے معاونین اور شرکائے کار میں بھی ردو بدل کیا اور پھر احسن مفتاحی کی شخصیت نمودار ہوئی۔ احسن مفتاحی مدرسے کی تعلیم وتدریس کے پسِ منظر کے ساتھ صحافت کے میدان میں آئے تھے اس لیے سیاسی، خصوصاً ادارتی تحریروں میں توازن کی امید ان سے نہیں کی جاسکتی تھی۔ براہِ راست تخاطب والی نہایت شدید کئی تحریریں دیکھ کر میں خود حیران رہ گیا اور اس کے ردِ عمل کا بھی وسیم صاحب کو سامنا کرنا پڑا۔ ان کے دفتر پر حملے ہوئے، ان پر ذاتی حملے بھی ہوئے۔ ہمارے باہمی تعلقات کی جو نہج اور نوعیت تھی اس کی بنا پر میں ان سے ہر طرح کے موضوعات پر اظہارِ خیال کرسکتا تھا۔ چنانچہ مختلف ملاقاتوں میں جو کلکتہ اور دہلی میں ہوتی رہیں ہم انھیں تحریروں میں اعتدال کی ضرورت کی طرف متوجہ کرتے رہے۔ اس کا احساس ان کو خود بھی ہو چکا تھا۔ رفتہ رفتہ 'اخبارِ مشرق' کی ادارتی تحریریں رہِ اعتدال پر آ گئیں۔

لیکن وسیم صاحب 'اخبارِ مشرق' کے آفاق میں ہمہ جہت توسیع کے نصب العین پر مستقلاً اور مسلسل عمل پیرا تھے۔ چنانچہ ۱۹۹۶ء میں انھوں نے اخبار کا دہلی ایڈیشن بھی جاری کردیا۔ ان کے دو لائق فرزند ندیم الحق اور تنویر الحق نے کلکتہ ایڈیشن کی ساری ذمہ داریاں سنبھال کر وسیم صاحب کو اس کی فکر سے آزاد کردیا اور خود موصوف دارالحکومت دہلی میں اقامت گزین ہو گئے۔ دریں اثناء گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ 'اخبارِ مشرق' میں گوناگوں خوبیوں کا اضافہ ہوتا گیا اور اس اعتبار سے وہ ایک مکمل اردو اخبار بن گیا کہ جن ضرورتوں کے تحت لوگ اخبار خریدتے ہیں ان سب کی تسکین کا سامان اس اخبار میں موجود ہے۔ ان میں موسم کے حالات اور طلوع وغروب سے لے کر تعلیم وتفریح، سیاسیات، معاشیات اور مختلف مسائلِ حاضرہ پر موقع محل کی مناسبت سے مضامین موجود ہوتے ہیں۔ بچوں اور خواتین کے کالم بھی ہوتے ہیں۔ برمحل رنگین تصویروں نے اخبار کو مزید پرکشش بنادیا ہے۔ معروف کالم نگاروں کے کالم پابندی سے شائع ہوتے ہیں اور اخبار کی اہمیت اور افادیت میں اضافے کا موجب ہیں۔ اخبار میں اشتہارات کی کثرت اور تنوعات کو دیکھ کر اس کے مالی استحکام کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

چنانچہ کلکتہ اور دہلی جیسے شہروں میں اس کے دفاتر اپنی عمارتوں میں ہیں۔ بہار اور جھارکنڈ کے شہر بھی 'اخبارِ مشرق' کے نشانے پر ہیں۔ کچھ عرصے سے اتوار کو اخبار کا ایک الگ ضمیمہ بھی شائع ہونے لگا ہے لیکن اس اخبار کی سب سے اہم خصوصیت اس کا قائدانہ کردار ہے۔

اقراء کا اجراء:

۱۹۸۳ء میں بڑی آب وتاب کے ساتھ روزنامہ 'اقراء' کی اشاعت شروع ہوئی۔ 'اخبارِ مشرق' کی اشاعت نے اردو اخبارات کی دنیا میں ایک نئی تحریک پیدا کر دی تھی۔ 'آزاد ہند' کے لیے اپنی ساکھ اور حیثیت کو برقرار رکھنے کا سوال کھڑا ہو گیا تھا چنانچہ جلد ہی احمد سعید صاحب نے نئی عمارت میں آفسٹ مشین نصب کرائی اور 'آزاد ہند' بھی پتھر کے دور سے نکل کر مشینی دور میں داخل ہو گیا۔ لیکن 'اقراء' نے 'اخبارِ مشرق' کے سامنے بھی ایک چیلنج رکھ دیا تھا۔ کلکتہ میں قاضی الماس خاں کا کوہ نور آرٹ پریس مشہور تھا جہاں اعلیٰ درجے کی آفسٹ پرنٹنگ مشینیں موجود تھیں چنانچہ ان کے صاحبزادے عمر حیات خاں نے جب 'اقراء' کی اشاعت شروع کی تو صرف چھاپہ خانے کی بہت بڑی بنیادی سہولت ہی نہیں حاصل تھی بلکہ 'اقراء' میں رنگین تصویریں بھی شائع ہونے لگیں۔ 'اخبارِ مشرق' میں یہ سہولت نہیں تھی جس کا اہتمام وسیم صاحب کو دیر سویر بہرحال کرنا پڑا۔

'اقراء' کو تجربہ کار صحافیوں کی خدمات بھی حاصل ہو گئیں۔ غالباً ہوش صاحب 'آبشار' کی طرف سے فارغ تھے، ان کا تعاون 'اقراء' کو حاصل ہو گیا۔ کم وبیش یہی صورت 'ملک وملت' کے ایڈیٹر عبدالعزیز صاحب کی بھی تھی 'اقراء' کو ان کے تجربات اور خدمات سے استفادے کا موقع مل گیا۔ بعد میں مالک صاحب جو پٹنہ اور دہلی میں صحافتی تجربات کے بعد کلکتہ پہنچ گئے تھے 'اقراء' کی ادارات میں شریک ہو گئے۔ دیگر شرکائے کار میں سجاد نظر بھی شامل تھے جن کی نظر سے کلکتہ کے کسی اردو اخبار کا محفوظ رہنا محال تھا لیکن بنیادی سہولتوں اور اچھے اخبار نویسوں کی موجودگی کے باوجود یہ اخبار تقریباً دس برس چل کر ۱۹۹۲ء میں بند ہو گیا۔ اس کی ایک وجہ تو اشتہارات کی عدم دستیابی رہی ہوگی جس کا اندازہ پہلے ہی سے ہونا چاہئے تھا۔ یہ شکایت تو کم و

بیش ہر اخبار کو رہی ہے۔ لیکن ایسا کیوں ہے؟ یہ ایک بڑا سوال ہے جس کا سادہ اور پیش پا افتادہ جواب دیا جاتا رہا ہے لیکن اس بارے میں گفتگو کی کافی گنجائش موجود ہے۔

مسئلہ اشتہارات کا:

ممکن ہے 'اقراء' کی اشاعت بند ہونے کی ایک وجہ صاحب ملکیت کا کاروباری خسارہ رہا ہو، ایسے میں تو بڑی بڑی کمپنیاں اپنی دوکان بند کر دیا کرتی ہیں لیکن بڑی وجہ اشتہارات کا حسب توقع نہ ملنا ہی رہا ہوگا، دوسری ضمنی وجہ اخبارات کے بند ہونے کی مالکوں یا ان کے وارثوں کی اس دھندے سے بے رغبتی اور عدم دلچسپی ہوتی ہے۔ وہیں کلکتہ میں ہمارے سامنے 'عصرِ جدید' اور 'امروز' کی مثال موجود ہے یہ دونوں اخبارات خان بہادر شیخ محمد جان صاحب کی ملکیت میں تھے۔ وہ ایک بڑے تاجر تھے، ان کے تجارتی، تعلیمی، اشاعتی اور صنعتی ادارے تھے۔ قومی سیاست اور سماجی کاموں سے بھی ان کو نہ صرف دلچسپی تھی بلکہ عملاً سرگرم رہتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے سارے ادارے برقرار رہے لیکن اخبارات بند ہو گئے کیونکہ ان کے وارثوں کو اس سے دلچسپی نہ رہی ہوگی ورنہ وہ دیگر اخباروں کے مقابلے میں سب سے زیادہ سرمایہ لگا کر ان اخباروں کو جدید تر بنانے کی پوزیشن میں تھے۔ اشتہارات کے بند ھے ٹکے ڈھروں کے علاوہ نئی تدبیریں بھی تلاش کر سکتے تھے۔ فی الحال اس بارے میں مزید گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ پہلے سرسری طور پر کچھ لکھ چکا ہوں۔

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ اخبارات ہوں یا الکٹرانک میڈیا، اشتہارات کی آکسیجن کے بغیر ان کی زندگی ممکن نہیں۔ اس وسیلۂ حیات کے زیادہ سے زیادہ حصول کے لیے سارے اداروں کے درمیان سخت مسابقت جاری ہے، اسی طرح اشتہارات دہندگان پر بھی دباؤ بڑھتا جاتا ہے لیکن ان کے سامنے تو اپنے مال یا مقصد کی تشہیر کا نصب العین ہوتا ہے اور اسی کے مطابق وہ اشتہارات کی تقسیم کے فیصلے کرتے ہیں۔ اس کام میں ان کی رہنمائی کرنے والے ادارے موجود ہیں، تاہم ذاتی تعلقات اور اثرات کی کارفرمائیاں اشتہارات کے طلبگاروں کے لیے مددگار ہوتی ہیں۔ یہ تعلقات اور اثرات سب سے زیادہ سرکاری اداروں کے معاملے میں کارگر

ہوتے ہیں کیونکہ وہاں کسی منفعت سے زیادہ سیاسی ملحوظات کام کرتے ہیں۔حکومت اور نیم سرکاری ادارے سب سے زیادہ اشتہارات دینے والوں میں ہیں، پھر فلمیں، ان کے بعد بڑی بڑی کمپنیاں جن کے اشتہارات اردو اخباروں میں نہیں کے برابر ہوتے ہیں، گویا اردو قاری سے ان کو کچھ لینا دینا نہیں ہے۔رہی سہی کسر ٹی وی چینلوں نے پوری کردی۔ان کی معرفت تو اپنی بات بلالحاظ زبان ہر کسی تک پہنچ جاتی ہے۔مسلمانوں کے ایسے بڑے صنعتی اور تجارتی ادارے نہیں ہیں جو اپنی تجارتی منفعت کے بعد ازراہ لطف وکرم اردو اخباروں کی سرپرستی کرسکیں۔اگر چند اوسط درجے کے ادارے کہیں ہیں بھی تو وہ کہاں کہاں برسیں۔

بات لے دے کر سرکاری اعانت پر ٹکی، وہ دو طرح سے ہوتی رہی ہے، ایک اشتہارات کے ذریعہ اور دوسرے نیوز پرنٹ کوٹا کے ذریعہ۔لیکن یہی دنوں چیزیں اردو اخباروں کو حکومت کی پالیسیوں کی تائید کا پابند کرنے والی رہی ہیں۔دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس کے علاوہ اردو اخبارات کے مالکوں نے کوئی اور کوشش یا کاوش کی یا نہیں۔یہ میدان بالکل خالی نظر آتا ہے۔بڑے بڑے اخبارات ہمیشہ اپنی پبلسٹی اور پروپگنڈا کے ہزار جتن کرتے رہتے ہیں۔ہورڈنگ لگاتے ہیں، پوسٹر لگاتے ہیں، ہینڈ بل تقسیم کرتے ہیں، وقتاً فوقتاً سروے کراتے ہیں۔اب تو اس کام کے لیے ٹی وی چینل سب سے زیادہ موثر ذریعہ بن گئے ہیں۔لیکن ہمارے اخبارات کے ہاں ایسی کوئی روایت نہیں ہے تو پھر کم آمدنی کی شکایت کیا ہے۔ان کو تو پبلسٹی سے ایسی شرم آتی ہے کہ اگر اخبار کے کام کے لیے کوئی گاڑی ہو تو اس پر بھی اخبار کا نام نہیں ہوتا وہ مالکوں کے ذاتی مصرف میں رہتی ہے، اس پر اخبار کا نام ہونا شرمندگی کا باعث ہوگا۔کسی نے بڑی جسارت کی تو کار کے آگے پیچھے Press کا ٹھپا لگا دیا۔اس کے بھی کچھ اور اسباب ہیں۔

کیا ہمارے اخبارات اسکولوں اور کالجوں وغیرہ میں طلبہ کے مختلف تحریری اور تقریری مقابلوں یا سیمینار کا اہتمام نہیں کرسکتے جن کے ذریعہ اخبار کی پبلسٹی ہوتی ہے اور آئندہ خریدار بھی تیار ہوتے ہیں؟ لیکن ایسا نہیں کیا جاتا، آخر کیوں؟ اپنے اچھے صحافیوں کی پذیرائی کے لیے جلسوں کا اہتمام کیا جاسکتا ہے، اس میں بھی اخبار کا نام ہوتا ہے لیکن ایڈیٹر کی ہیٹھی کا اندیشہ ہوتا

ہے اس لیے اس سے گریز کیا جاتا ہے۔ ہر لکھنے والے کا سماج میں ایک مقام ہوتا ہے اور اس کی حیثیت کے مطابق اس کا حلقۂ اثر ہوتا ہے۔ اس کی پذیرائی متعلقہ اخبار کے حلقے میں وسعت کا موجب ہوتی ہے۔ اس بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں گیا۔ جتنی بھی ایڈیٹروں کی کانفرنسیں وغیرہ ہوئی ہیں ان کی روداد دیکھ لیجیے، تجویزوں میں اشتہارات اور نیوز پرنٹ کوٹے میں اضافے کے مطالبوں کے سوا شاید ہی کچھ ملے۔ اس سے آگے بڑھیے تو حکومت سے سرکاری ڈیلی گیشنوں وغیرہ میں شمولیت کی گزارشات اور بس۔ ان کے جو وفود کبھی وزیروں یا سرکاری اہلکاروں سے ملے ان کا اصرار بھی انہی امور تک محدود رہا ہے۔ کوئی پوچھے کہ ان برکات میں دیگر صحافیوں کی حصہ داری کی بات کیوں نہیں ہوتی؟ جب تک مذکورہ بالا تمام امور کو ملحوظ نہ رکھا جائے گا ہمارے اخبارات اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہو سکیں گے۔

اردو نیوز سروس:

یو این آئی نے ۱۹۹۲ء میں اردو اخباروں کے لیے اردو نیوز سروس شروع کی۔ یہ اردو اخباروں کی ترقی میں اعانت کی طرف ایک بڑا اقدم تھا، لیکن مالی کمزوریوں کی وجہ سے اس سروس کے خریداروں کی تعداد میں کمی ایک ایسا مسئلہ تھا کہ اس سروس کے بند ہو جانے کا خطرہ مستقل منڈلاتا رہا۔ بہر حال تقریباً پانچ برس کے نشیب و فراز سے گزرنے کے بعد ۱۹۹۷ء کے آتے آتے اس کے استحکام کا فیصلہ ہو گیا۔ اخباروں کے علاوہ بعض دیگر اداروں کو بھی اس سروس سے استفادہ پر راضی کر لیا گیا۔ آگے چل کر قومی کونسل برائے فروغ اردو نے اس سروس کی بقا اور دوام میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ کونسل نے فیصلہ کیا کہ اردو اخبارات پر اس نیوز سروس کی جو رقم واجب الادا ہوگی اس کا ایک حصہ، تقریباً نصف، کونسل ادا کرے گی۔ ہر اخبار کے لیے جو رقم ادا کرنا لازم ہوگا اس کی مقدار کے تعین کے لیے تعداد اشاعت کو معیار قرار دیا گیا، گویا ہر اخبار کے لیے الگ الگ رقوم کا تعین ہوا۔ اب یہاں ایک دوعملی کی طرف اشارہ کرنے کے بعد اس سروس کے فائدے نقصان پر گفتگو کی جائے۔ اشتہارات کے حصول کے لیے تو لازم تھا کہ اخبارات اپنی اشاعت بڑھا چڑھا کر بیان کریں لیکن یو این آئی کی اردو نیوز سروس کے واجبات کی ادائیگی

کے لیے اشاعت کو کم ظاہر کرنے ہی میں فائدہ تھا۔ معلوم نہیں ہمارے اخبارات نے ان دو متضاد تقاضوں کے درمیان توازن پیدا کرنے کی کون سی راہ اور کون سی تدبیر اختیار کی۔ جب کارکن اخبار نویس کے اجرتی بورڈ کی سفارشات کے نفاذ کا سوال پیدا ہوا تھا اس وقت بھی ایڈیٹر حضرات نے، جو مالک بھی تھے، یہی موقف اختیار کیا کہ ہمارا اخبار چھوٹا ہے اور ہم تو اکیلے ہی اس کا سارا کام نمٹا لیتے ہیں لہٰذا کسی کو کچھ دینے دلانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

معلوم ہوا ہے کہ یو این آئی کی اردو سروس کے خریداروں کی مجموعی تعداد ستر کے قریب ہے جن میں سے ۵۷ وہ اخبارات ہیں جن کے واجبات کی ادائیگی میں قومی فروغ اردو کونسل اشتراک کرتی ہے۔ ان میں کلکتہ کے چار روزنامے شامل ہیں۔ ظاہر ہے کونسل نے پوری خوش نیتی کے ساتھ اس بار کو اپنے ذمہ لے لیا ہے یعنی اردو زبان کے فروغ کے لیے مختص رقم کا ایک حصہ اردو اخبارات کے فروغ پر یا اردو نیوز سروس کی بقا پر صرف کیا جا رہا ہے۔

اس کے فائدوں اور نقصانات پر کچھ گفتگو برمحل معلوم ہوتی ہے۔ یہ سروس ہمارے اخباروں کے تین چار صفحات کو پر کرنے کے لیے کافی مواد ہر روز فراہم کرتی ہے۔ اس کے بعد ادارتی صفحے کے مضامین اور اشتہارات سے پر ہونے والی گنجائش کے بعد اخبار میں اتنی ہی جگہ بچ رہتی ہے جو مقامی خبروں اور اسپورٹس کی رپورٹوں وغیرہ کے لیے کافی ہو چنانچہ ہمارے اخباروں میں وہ صحافی فاضل ہوگئے جو قومی اور بین الاقوامی خبروں کے بروقت ترجمے کیا کرتے تھے۔ مقامی خبروں کی اور اسپورٹس کی رپورٹنگ کے لیے پہلے بھی جز وقتی رپورٹر ہوا کرتے تھے اب بھی رہ گئے۔ ایجنسی سے موصول ہونے والی خبروں کے لیے سرخیاں لگانے اور کچھ متفرق کاموں کے لیے نیوز ایڈیٹر کے نام پر ایک شخص کی ضرورت باقی رہ گئی۔ اگر ایڈیٹر نے خود وہ کام انجام دے لیے تو اللہ اللہ خیر صلا! تین چار درجن اخباروں میں بحیثیت مجموعی کتنے اردو اخبار نویسوں کا جھٹکا ہوا ان کی صحیح تعداد کا صرف اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے جتنے یو این آئی کی اردو نیوز سروس میں کھپ گئے ان کی تعداد کو اس مجموعی تعداد میں سے وضع کیے جانے کے بعد بھی بچے کھچے صحافیوں کی تعداد خاصی ہوگی۔ لیکن اس حقیقت سے کیسے

صرفِ نظر کیا جا سکتا ہے کہ جس صنعت میں بھی مشینی عمل کارفرما ہوا وہاں اس کی سیدھی ضرب کارکنوں پر پڑی۔ صنعت کو یقیناً فروغ حاصل ہوا، اس کی معیار بندی ہوئی، صفائی ستھرائی ہوئی لیکن ورکروں کی بھی صفائی ہوگئی۔

دوسری طرف اس کے فائدوں کو دیکھا جائے تو ظاہری اور داخلی دونوں طرح کے فائدے ہیں۔ پہلے آدمی آدمی سے تعاون کرتا تھا اب مشینوں نے پہلے باہمی تعاون کی راہ اختیار کی اس کے بعد اس تعاون کو آدمی کی دست گیری تک پھیلا دیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ پہلے ٹائپ رائٹر اور ٹیلی پرنٹر کی ضرورتوں کے مطابق اردو حروف اور رسم الخط ڈھالے گئے، اس کے لیے کمپیوٹر سافٹ ویر تیار کیے گئے، کمپیوٹر بنائے گئے پھر ان سب کو ایک ترسیلی نظام سے جوڑ کر دونوں سروں پر موجود آدمیوں کے درمیان مواصلت کی برق رفتار کڑی کے طور پر ان کے حوالے کر دیا گیا۔ ہمیشہ وقت کی رفتار سے مسابقت والے اخباری دھندے میں کئی منزلوں اور مرحلوں میں وقت کی بچت ہوگئی۔ اس ساری کارروائی کے نتیجے کو اسی برق رفتاری سے خریداروں تک پہنچانے اور پیش کرنے کے لیے آفسٹ پرنٹنگ مشینیں پہلے ہی سے اخبار کے دفتروں میں اس انقلاب کے استقبال کے لیے آنکھیں بچھائے بیٹھی تھیں۔ یہ تو تکنیکی اور مشینی پہلو تھا لیکن دوسری طرف لسانی پہلو بھی قابل لحاظ ہے۔

ترجمے کے ایک قومی اور مرکزی نظام کی وجہ سے زبان اور محاورات کی معیار بندی ہوگئی۔ ہندی والوں کے روز افزوں چینلوں پر فراٹے سے اردو دانی کا مظاہرہ کرنے والوں کو معلوم ہی نہیں کہ وہ کیا بک رہے ہیں۔ خلاصہ بمعنی تفصیل اور خلافت بمعنی مخالفت تو بہت عام ہے اس کے علاوہ محاورات اور طرز بیان میں سوقیانہ پن اور ابتذال آتا جا رہا ہے۔ یہ سب اردو اخباروں میں سرایت کر رہا ہے جسے دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ یو این آئی کی اردو سروس کے ذمہ دار زبان کی ستھرائی اور تراجم کی معیار بندی پر خاص طور سے توجہ دیں گے۔

اس پوری صورت حال کا ایک سیاسی پہلو بھی ہے جو اندیشوں سے خالی نہیں ہے، وہ یہ کہ یہ اردو سروس بہرحال سرکاری سرپرستی میں چل رہی ہے اس لیے اس کی ترسیلات میں

حکومت کی طرف عمومی رجحان کا ہونا عین ممکن ہے۔ یہ تو ہمارا آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ کسی واقعہ کو بیان کرنے میں لفظوں کے ذرا ہیر پھیر سے ان کا مطلب اور ان کا تاثر کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ واحد مرکزی وسیلے سے سارے اردو اخباروں کو موصول ہونے والے مواد کے کثرتِ استعمال سے یہ اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے اخبارات کہیں یک رخی نہ ہو جائیں۔ ہم جس بے عملی اور سہولت پسندی کا مشاہدہ کرتے آئے ہیں اس کی وجہ سے ان اندیشوں کو تقویت ملتی ہے۔ اس کے تدارک کی ایک ہی صورت ہے یعنی ایڈیٹروں کی اپنی جگہ بیداری، ہر وقت معاملات کی پرکھ کے لیے تیار رہنا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ حکومت کی پالیسیوں سے ہم آہنگی کوئی عیب ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اخبار کی پہلی ذمہ داری اس کے قاری کے تئیں ہے۔ اس تک پوری غیر جانبداری کے ساتھ خبروں کو پہنچانا اور پوری دیانتداری کے ساتھ معاملات پر تبصرے اور اظہار خیال کرنا۔ یوں ہم یہ بھی دیکھتے آئے ہیں کہ صرف سرکاری اشتہارات اور نیوز پرنٹ کوٹا میں ہی ایسا دباؤ اور ایسی کشش رہی ہے کہ ہمارے اخبارات اس کے اثرات سے آزاد نہیں ہو سکے۔ بہرحال جب تک ادارتی کالم موجود اور محفوظ ہیں اور ان کو حسبِ خواہ اور حسبِ ضرورت استعمال کرنے کا عزم باقی ہے سارے اندیشوں کی نفی ہو سکتی ہے اور چھان پھٹک کے بعد اس پوری کارروائی میں مضمر فائدے پہنچ سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک بڑا فائدہ موصول ہونے والے مواد کا تنوع ہے۔ چونکہ یہ مواد انگریزی اور ہندی اخباروں کے لیے بھی تیار کیا جاتا ہے اس لیے ان کے انتخاب اور تیاری کا کام کافی تجربہ کار صحافیوں کے ذمہ ہوگا اور اس کا فائدہ اردو سروس کی معرفت اردو اخبارات اور ان کے قاری تک پہنچ رہا ہے۔ چونکہ فروغ اردو کونسل بہرحال اس مجموعی کاروبار میں شریک ہے اس لیے مناسب ہوگا کہ وہ اردو سروس کے فراہم کردہ مواد میں زبان کی درستگی پر بھی نظر رکھے۔ یہ کام کسی پینل کی تقرری کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے۔

اپنے اخباروں کے مواد، مضامین اور مشمولات کے ضمن میں مختلف سرکاری اور غیر سرکاری ایجنسیوں کا تذکرہ کیا جا چکا ہے لیکن اس اردو نیوز سروس سے انھیں کوئی نسبت نہیں۔

یہ سروس وقت کی پابندی کے ساتھ بامعاوضہ خبریں اور مضامین فراہم کرتی ہے جبکہ سابقہ تذکرے والے ادارے اپنی غرض اور ضرورت کے مطابق مواد کی ترسیل کرتے تھے۔ انھیں اخبار کی ضرورتوں اور موقع محل سے کوئی سروکار نہیں تھا نہ ان کے لیے وقت کی کوئی پابندی تھی۔ انھیں اپنی پبلسٹی یا پروپگنڈے سے سروکار تھا اور اخبارات جگہ بھرنے کے لیے انھیں حسبِ ضرورت استعمال کرتے تھے۔

پبلسٹی اور پروپگنڈا

یہ دونوں چیزیں بنیادی طور پر ایک ہی ہیں لیکن ان کے درمیان فرق ہے۔ کوئی شخص یا ادارہ سرکاری یا غیر سرکاری، اپنے کسی مقصد یا پالیسی یا کسی چیز کی تشہیر کرتا ہے تو وہ پبلسٹی ہے۔ اخبارات اس کی اشاعت کے پابند نہیں ہوتے لیکن جب اسی کی اشاعت کے لیے انھیں شرح معین کے مطابق رقم ادا کی جاتی ہے تو وہ اشتہار کہلاتے ہیں۔ لیکن اب تو اس اشتہار کی بھی نئی نئی صورتیں بنتی جارہی ہیں یعنی بظاہر کسی رقم کا لین دین نہیں ہوتا لیکن بڑی رقوم کا صرفہ ضرور ہوتا ہے جسے بلا تامل ایک خوشنما رشوت کہا جاسکتا ہے۔ گزرے ہوئے زمانوں میں تو صرف ڈنر وغیرہ سے کام چل جاتا تھا لیکن اب بھاری بھرکم تحائف اور دور دور تک سیر سپاٹے کے بڑے بڑے آفر دیئے جاتے ہیں جنھیں قبول کرنے میں اخباروں کے ارباب بست وکشاد کو کوئی تکلف ہونا تو دور رہا، وہ اسے بہ سروچشم قبول کرتے ہیں۔ پبلسٹی کی ایک خصوصیت ضرور ہوتی ہے کہ پیش کیے جانے والے مواد میں کسی قدر اعتدال، توازن اور سنجیدگی کو ملحوظ رکھا جاتا ہے لیکن جس نفیس اور قیمتی قسم کی پبلسٹی کا ذکر ابھی کیا گیا ہے وہ تو بہت لطیف بھی ہوتی ہے اور غیر محسوس طور پر متاثر کرنے والی ہوتی ہے۔ مثلاً کسی سگریٹ کی تعریف نہ کی جائے لیکن اس کے دھوئیں کی خوشبو سے کسی حسینہ کو مست وبیخود دکھایا جائے یا اسی عالم کیف میں اس کا کسی خاص سیاحتی مقام پر جانے کے لیے اصرار یا اس سفر میں کسی خاص ٹراول ایجنسی کی خدمات حاصل کرنے پر اصرار وغیرہ، یہاں یہ بالکل نہیں نظر آتا کہ اس کے پیچھے کسی تفریح گاہ یا کسی ٹراول ایجنسی کے ایجنٹوں کی کارفرمائی رہی ہوگی۔ اس کا سلسلہ دراز ہے اور بہت سارے گھپلوں گھوٹالوں کی بنیاد ہے۔

اس کے برخلاف پروپگنڈا کسی مقصد یا کسی شے کا کھلا اعلان ہوتا ہے اس میں کسی نفاست یا اخلاقی اصولوں کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ اس کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے یعنی اپنے سننے والوں، دیکھنے والوں یا پڑھنے والوں کو اپنی جھوٹی سچی باتوں کا یقین دلانا، بہ الفاظ دیگر لوگوں کو متاثر کرنا، لوگوں کے ذہنوں کی تسخیر۔ پروپگنڈے میں صداقت کا عنصر کم ہی ہوتا ہے۔ یہ لفظ منفی معنوں میں ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ جن ایجنسیوں کا پہلے ذکر آیا ہے ان کے مواد میں ان دونوں عناصر کی موجودگی کا احتمال ہوسکتا ہے وہ بھی لطیف اشاریت والے وسائل کے عمل دخل کی وجہ سے لیکن کوئی بھی بیدار مغز ایڈیٹر یا نیوز ایڈیٹر اصلیت اور حقیقت تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کو ضروری احتیاطی کاروائی کا ہمیشہ ہی موقع حاصل رہتا ہے۔ اسی طرح کے ایک اور امتیاز کی ضرورت بیان کرنا چاہتا ہوں۔

خبر اور افواہ:

خبر اور افواہ ''اصل میں دونوں ایک ہیں''۔ کوئی اطلاع مصدقہ ہو تو خبر ہے ورنہ افواہ، یعنی اپنی اصل کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں اور ان دونوں کے ایک دوسرے میں مبدل ہونے کا امکان اکثر موجود ہوتا ہے، یعنی کسی خبر کی اگر تصدیق نہ ہو سکے تو عین ممکن ہے کہ وہ افواہ ہو، اسی طرح اگر کسی افواہ کی تصدیق ہو جائے تو وہی خبر بن جائے گی۔ گویا وقت اور ممکنات ان دونوں کے درمیان حدِ فاصل کی حیثیت رکھتے ہیں اور خبر کی افادیت اور افواہ کی مضرت کو کم زیادہ کر سکتے ہیں۔ گاؤں میں بھیڑیئے والی کہانی سے خبر اور افواہ کے تعلق کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ ایک شام کسی نے یہ خبر اڑادی کہ ایک بھیڑیا آ گیا ہے، پھر گاؤں والوں کی نیند حرام ہوگئی وہ رات بھر اپنی بھیڑ بکریوں کی نگرانی کرتے رہے۔ اگلی صبح معلوم ہوا کہ وہ افواہ تھی۔ ایک بار پھر جب گاؤں میں بھیڑیا آنے کی خبر گرم ہوئی تو لوگوں نے اسے افواہ سمجھا اور اس پر کان نہ دھرا۔ اس رات واقعی بھیڑیا آ گیا اور مویشیوں کا نقصان کر گیا۔ بس اس روز وہ افواہ خبر بن گئی۔ اس مختصر سی کہانی میں کئی اہم سوالوں کے جواب مضمر ہیں۔ کسی خبر کی ترسیل اور اس کی تشہیر سے پہلے اس کی تصدیق کیوں ضروری ہے؟ افواہیں پھیلانا کیوں ایک غیر اخلاقی فعل ہے؟ افواہوں کی جلد از

جلد تر دید اور ان کا سدِ باب کیا جانا کیوں ضروری ہے؟ کسی واقعی خبر کو افواہ ظاہر کرنا یا سمجھ لینا کتنا خطرناک اور نقصان دہ ہوسکتا ہے؟ خبر رسانی آج کی مہذب زندگی کی ایک بڑی ضرورت بن گئی ہے لیکن انہی وسائل اور ذرائع سے افواہیں بھی پھیل سکتی ہیں، اتنی ہی سرعت سے اور اتنے ہی وسیع علاقے میں پھیل سکتی ہیں لہٰذا ہر قدم پر ان کے خلاف چوکسی کی ضرورت ہے، نیوز سروس کے دفتر سے لے کر ایڈیٹر کی میز تک۔

ڈس انفارمیشن:

افواہ اور پروپگنڈے سے ملتی جلتی اسی قبیل کی ایک منفی صفات کیفیت ڈس انفارمیشن (Disinformation) ہے۔ کسی معاملے میں غلط فہمی پھیلانے کی نیت اور ارادے کے ساتھ کسی اطلاع کو عام کرنا اس کی بنیادی خصوصیت ہے اس کے علاوہ افواہ یا پروپگنڈا کے عناصر یا ان دونوں کے اجزاء اس کی ترکیب میں شامل ہوتے ہیں۔ پروپگنڈا کسی خاص مقصد کے تحت تشہیر کا ایک طریقہ ہے، اس میں درستگی یا عدم درستگی کی کوئی شرط نہیں ہوتی۔ یہ تشہیر عموماً ایک طرفہ ہوتی ہے یعنی پروپگنڈا کرنے والے کو اپنے کام سے کام ہوتا ہے۔ افواہ کسی مقصد کے تحت یا بلا مقصد بھی پھیلائی جاتی ہے، کبھی کوئی افواہ صرف شرارتاً پھیلا دی جاتی ہے لیکن ڈس انفارمیشن کے لیے پہلے سے کسی اطلاع کا ہونا ضروری ہے جس کی نفی کے لیے دروغ بیانی کی جائے۔ کسی واقعہ یا کسی کیفیت کے متعلق رائے عامہ کو گمراہ کرنے والی منفی اطلاعات کی تشہیر اسی زمرے میں آتی ہے۔ ڈس نفارمیشن کے پس پشت عام طور سے کوئی سیاسی محرک ہوتا ہے۔ اس کی بڑی اچھی مثال خود میرے معاملے میں ملتی ہے۔ ۱۹۷۵ء کے اوائل میں مغربی بنگال کے کمیونسٹ پارٹی ورکروں نے طرح طرح کی ڈس انفارمیشن پھیلا دی۔ ان کے بڑے لیڈروں نے ان کی جھوٹی اطلاعات کا یقین کر کے بیانات دے ڈالے اور ان کی تصدیق کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی لیکن ہمارے اخباروں کے ایڈیٹروں کی چوکسی کے نتیجے میں ان کی ساری اسکیمیں ناکام ہوگئیں۔ وہ اپنے اعلانات لے کر جو ہینڈ بلوں کی شکل میں شائع کیے گئے تھے اور تقسیم کیے جارہے تھے جن اخباروں کے دفتروں میں گئے وہاں ڈانٹ سنی۔ غرضیکہ اپنے اخبار کو ڈس

انفارمیشن کے چھوت سے محفوظ رکھنے کے لیے بیداری کا وہی نسخہ ہے جو پروپگنڈا اور افواہ کی نفی کے لیے تجویز کیا گیا ہے۔لیکن ڈس انفارمیشن کی ایک ایسی عالمگیر وبا پھیلی ہے جس کا مقابلہ کرنے میں سب بے بس نظر آتے ہیں، میرا مطلب ہے اسلام کو بدنام کرنے اور اس کے تابعین کو دہشت گرد ثابت کرنے کی عالمگیر مہم۔حیرت ہے کہ گزشتہ صدی کی دو عالمی جنگوں میں ایک دوسرے کی مد مقابل متحارب اقوام اور ممالک، نصف صدی پر محیط سرد جنگ کی حریف طاقتیں اور دنیا بھر میں ان کے پچھ لگے، چھوٹ بھئے سب اس مہم میں شریک ہیں۔حیرت ہے کہ اس مہم میں حکومتیں اور میڈیا باہم دیگر یک زبان ہیں۔یہ حیرت اس وجہ سے زیادہ شدید ہو جاتی ہے کہ میڈیا خصوصاً اخبارات کو حکومتوں پر نگراں سمجھا جاتا ہے لیکن ڈس انفارمیشن کی اس بے راہروی پر حکومت کو لگام دینا تو درکنار، اس میں خود شریک ہو گئے اور اعلان و اشارات کے ہر فن کا بے محابا استعمال کیا، صحافت کے اخلاقی اصولوں کو طاق پر رکھ دیا، صحیح اطلاع کے حصول کے استحقاق کو فراموش کر دیا۔حیرت ہے کہ سینکڑوں برس تک یورپ اور ایشیا کے ملکوں پر حکمراں عقیدے اور عقیدت مندوں میں دہشت گردی کے کوئی آثار کسی کو نہیں نظر آئے۔حیرت ہے کہ سائنس، طب، فلسفہ، جغرافیہ، ریاضی، علمِ ہیئت سے دنیا کو آشنا کرنے والوں کے سارے کارناموں پر تارکول پھیرنے کے لیے سارے سیاہ کار نکل پڑے ہیں۔حیرت ہے کہ بہترین اخلاق کا نمونہ پیش کرنے والوں کو انسانیت دشمن ثابت کرنے کی مہم میں سارے آبرو باختہ شانہ بشانہ کھڑے ہیں، تہذیب وثقافت اور فنون لطیفہ کے لافانی نقوش اور آثار کو مٹانے پر تلی ہوئی کالی آندھی کو دیکھ کر اس سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔سوال یہ ہے کہ دنیا میں کوئی ڈیڑھ ارب آبادی ایسی حقیر اور بے دست وپا ہے کہ اس کے وجود کے درپے ساری طاقتیں مل کر کیا اس کو واقعی مٹا دیں گی؟ سوال یہ ہے کہ عہد حاضر کی دانشوری اور سیاسی دانائی کس طرح بینائی سے محروم ہو گئی کہ دن کو رات کہنے والوں کی بات پر انھیں یقین آ گیا؟ سوال یہ ہے کہ ایسی کورچشمی انھیں کہاں لے جائے گی؟ کس اندھے کنوئیں میں ڈھکیل دے گی؟ یہ ڈس انفارمیشن ایک سحر باطل ہے، یہ بڑے سازشی اذہان کی زبردست منصوبہ بندی کا مظہر ہے۔اس کی کاٹ کے لیے

ہمارے پاس وسائل بالکل ناکافی ہیں۔ ہماری تو جہات کو چھوٹے چھوٹے داخلی مسائل میں الجھا دیا گیا ہے۔ یہ بھی ڈس انفارمیشن کی اسی عالمگیر مہم کا حصہ ہے۔ ہماری نیوز سروس، ہمارے اخبارات، ہمارے ایڈیٹر اس کے آگے بے بس ہیں۔ اس لیے انھیں اس سے نجات کے لیے اس وقت کا انتظار کرنا پڑے گا جب اس آندھی کا رخ الٹی طرف ہو جائے۔

حلقۂ اثر:

کلکتہ اردو پریس کے بارے میں اب تک میں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ایک عام تاثر تو یہی ملتا ہے کہ ان اردو اخبارات کے قاری کلکتہ اور مضافات تک محدود تھے چنانچہ ان کے حلقۂ اثر کی جہات بھی اتنی ہی رہی ہوں گی لیکن ایسا نہیں ہے۔ مغربی بنگال کے اضلاع میں خصوصاً صنعتی علاقوں میں ایسے شہر اور قصبات تھے، اور ہیں، جہاں اردو بولنے والوں کی اچھی خاصی آبادی ہے وہاں کلکتہ کے اردو اخبارت ہی جاتے تھے۔ ان کے علاوہ اطراف کی ریاستوں خصوصاً بہار، بشمول جھارکھنڈ اور اڑیسہ اور آسام میں بھی جہاں جہاں اردو بولنے والوں کی معتدبہ تعداد ہے ان کی ذہنی آبیاری کلکتہ کے اردو اخبارات ہی کیا کرتے ہیں۔ بہار سے اردو کے کئی روز نامے اور رسائل وجرائد ہمیشہ شائع ہوتے رہے ہیں لیکن وہ بھی کلکتہ کے اردو اخباروں سے دوطرح استفادہ کرتے رہے ہیں ایک تو ان اخبارات کی وہاں تک رسائی کی وجہ سے اور دوسرے ہر دور میں بہار کے صاحب ذہن افراد کلکتہ کے اردو اخباروں میں قوت محرکہ کا کام کرتے رہے ہیں۔ یہ بات بھی بڑی حد تک درست ہے کہ کلکتہ اور دیگر شہروں کے چند مقامی مسائل کے علاوہ اردو قاری کے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور مذہبی مسائل تقریباً یکساں بلکہ مشترک رہے ہیں۔ بین الاقوامی اور عالمی امور میں بھی ان کی سوچ اور اس کے اظہار میں بڑی یکسانیت رہی ہے۔ بایں ہمہ ایک بڑا نکتہ ایسا ہے جو ہمیں کلکتہ کے اردو اخبارات کے حلقۂ اثر کے باب میں اپنی نظر کو کلکتہ کی چوحدیوں میں پابند کرتا ہے۔ وہ نکتہ ہے عوامی ردِعمل کا۔ وہ تو منفی ہو یا مثبت، چھوٹا ہو یا بڑا، وقتی ہو یا طویل المدت اس کے مظاہر کلکتہ میں ہی دیکھنے میں آتے رہے ہیں۔

میں نے آزادی سے پہلے کلکتہ کے چہرے کو دیکھا تھا جس کا ذکر کر چکا ہوں۔ اسی چہرے پر اگست ۱۹۴۶ء کے ڈائریکٹ ایکشن کا داغ بھی دیکھا تھا۔ اس تحریک کو ہوا دینے میں 'عصرِ جدید' پیش پیش تھا۔ اسی اخبار کا ایڈیٹر گولیوں کا نشانہ بنا اور اسی اخبار کے بانیان تقسیم وطن کے مشعلوں میں شہر کو سلگتا چھوڑ کر خود کمبل لپیٹ کر فرار ہو گئے۔ ۱۹۵۶ء میں جنگ سوئیز کے وقت اسی شہر کے مرے کچلے، اجڑے بگڑے مسلمانوں نے چندے اکٹھا کر کے مصری سفیر کو پیش کیے۔ انگریزی روزنامہ 'اسٹیٹسمین' میں توہین رسالت والے مضمون کی اشاعت پر احتجاج کرنے والے اسی شہر کے نوجوان پولیس کی گولیوں کا نشانہ بنے۔ یہ معدودے چند مثالیں سامنے کی ہیں اور بیّن ہیں۔ نفی سے بھی اثبات مترشح ہوتا ہے چنانچہ ان بظاہر منفی مثالوں سے کلکتہ میں اردو اخباروں کے اثرات کا اثبات ثابت ہے۔ اس کی زیریں سطح پر اٹھنے والی اور جاری رہنے والی لہریں ہیں جو نظر نہیں آتیں لیکن ان کی کارفرمائیاں جاری رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر بنگلہ دیش کی تحریک اور تشکیل کے زمانے میں جب ڈھاکہ میں اردو اخبارات معتوبِ مردود اور مفقود ہو گئے تھے مجھے معلوم ہوا تھا کہ 'آزاد ہند' کی کچھ کاپیاں چوری چھپے وہاں پہنچا کرتی تھیں۔ ایمرجنسی نافذ ہوئی تو کلکتہ کے اخبارات پر بالخصوص نظر رکھی گئی۔ اس سے پہلے ہندوستان اور پاکستان کی لڑائیوں میں انہی اخبارات کے ایڈیٹر نظر بند کئے گئے۔ بات شاید کچھ زیادہ پھیل گئی لیکن کلکتہ اردو پریس کی اہمیت کو اور اس کے حلقۂ اثر کو پورے سیاق وسباق میں پیش کرنا ضروری بھی تھا۔ یہ کام شروع میں بھی کیا جا سکتا تھا لیکن میرا خیال ہے کہ ہمارے اخباروں میں کیا تھا اور کیا نہیں تھا، ان کی اصلیت اور حقیقت کیا تھی وہ سب بیان کرنے کے بعد ہی یہ بتانا مناسب تھا کہ ان کی رسائی کہاں تک تھی، ہمارے معاملات ومسائل کے نمٹارے میں وہ کتنی دور تک جا سکتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ سارے مشرقی ہند میں مسلم رائے عامہ جیسی اور جتنی بھی تھی اس کو بنانے اور پیش کرنے میں کلکتہ کے اردو اخبارات کا کلیدی کردار تھا۔ وہی Opinion Makers تھے اور شاید اب بھی ہیں۔ دہلی سے شائع ہونے والے اردو اخباروں نے اگر مشرقی ہند میں مختلف مقامات سے اپنی اشاعتیں شروع کیں تو رائے عامہ پر ان کا وہ اثر ہونا

مشکوک ہے جو وہیں سے بنیادی طور پر شائع ہونے ولے اخباروں کا ہے۔اس حقیقت کے پیش نظر ان مقامی اخباروں کی ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔

ایک تجویز:

طباعت کے معاملے میں انگریزوں کے زمانے سے ہی کلکتہ کو ایک خاص شہرت حاصل رہی ہے ملک کے بہترین پرنٹنگ پریس یہاں موجود رہے ہیں۔ یہاں کی جلد سازی بھی مشہور رہی ہے جلد سازوں کا ایک پورا محلّہ ہی آباد رہا ہے۔تاریخی اعتبار سے تو اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ انگریزوں کی عملداری کا پہلا مرکز یہی تھا جو تقریباً دوصدی تک جاری رہا لیکن دوسری وجہ اس شہر کا محل وقوع بھی ہوسکتا ہے جو استوائی خطے میں قدرے مرطوب آب وہوا میں ہے۔ایسے علاقے میں بعض کیمیکل کی کارکردگی بہتر ہوتی ہے، ان میں پرنٹنگ میں کام آنے والی روشنائیاں اور جلد سازی میں کام آنے والے سوت اور کیمیکل شامل ہیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ طباعت کی صنعت کلکتہ میں روایتی طور پر موجود رہی ہے اور اس طرح روزگار کا ایک بڑا ذریعہ رہی ہے تو اب کیوں نہ اس کو جدید خطوط پر فروغ دے کر پرنٹنگ ٹیکنالوجی کو ایک خصوصی حیثیت دی جائے اور اسے اپنے نوجوانوں کے لیے روزگار کے مواقع بڑھانے کا ذریعہ بنایا جائے۔ میں جس زاویہ سے اس میدان کو دیکھ رہا ہوں اس میں کئی سطحیں، مدارج یا مرحلے ہیں اور اس کی منفعت بھی اسی طرح کی ہے۔اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

پرنٹنگ ٹیکنالوجی کی ٹریننگ کا ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے جہاں اس فن کی ابتدائی تعلیم اور ٹریننگ سے لے کر اعلیٰ ترین ٹریننگ تک ہو۔اس کی حیثیت تعلیمی اداروں یا انجینئرنگ کالجوں جیسی ہو، اس میں باضابطہ نصابات ہوں، ان نصابوں کی مدت پوری کرنے ولے طلبہ کو باضابطہ سرٹیفیکٹ دیئے جائیں۔ اس طرح ابتدائی تعلیم وتربیت حاصل کرنے والوں کو چھپائی کے چھوٹے بڑے اداروں میں کام مل سکے گا۔

اعلیٰ تعلیم تربیت حاصل کرنے والوں کو بڑے پرنٹنگ پریسوں میں کام مل سکے گا۔ان میں سے جو چاہیں گے اپنے چھوٹے بڑے ذاتی چھاپہ خانے لگا سکیں گے۔ میں اس تجویز کو کلکتہ

تک محدود نہیں کر رہا ہوں اس نیک کام کو کہیں بھی دہلی، بمبئی، حیدرآباد میں شروع کر کے فروغ دیا جا سکتا ہے۔

مثال کے طور پر اگر دہلی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ یا جامعہ ہمدرد اس طرح کے کسی شعبہ کو قائم کرنا چاہیں تو ان کے پاس بنیادی ڈھانچہ موجود ہے۔ ابتدائی درجے سے کام شروع کیا جا سکتا ہے۔ ہر سال ان اداروں کے کروڑوں روپئے پرنٹنگ پر صرف ہوتے ہیں، وہ کام خود ان کے اپنے پرنٹنگ پریس میں ہو سکتے ہیں گویا اس تعلیم کے اہتمام میں روزِ اول سے بچت اور منفعت کے امکانات موجود ہیں۔ ان دونوں یونیورسٹیوں کا ذکر بھی میں نے بطور مثال کیا ہے۔ ندوہ اور دیوبند جیسی درسگاہیں بھی یہ کام یا نصاب شروع کر سکتی ہیں۔ وہاں ماضی میں خطاطی اور جلد سازی وغیر کی تربیت دی جاتی تھی۔ اب کمپیوٹر کی تعلیم بھی شروع ہو گئی ہے تو کیوں نہ پرنٹنگ ٹیکنالوجی کو متعارف کرانے پر بھی غور کیا جائے۔ ان اداروں میں ٹریننگ کے بعد اپنے چھاپے خانے قائم کرنے کے خواہشمندوں کے لیے اقلیتی امور کی مرکزی وزارت، گھریلو اور چھوٹی صنعتوں کے لیے مالی امداد فراہم کرنے والے اداروں، مولانا آزاد ایجوکیشنل فاؤنڈیشن سے امداد حاصل کرنے میں وہی تعلیمی ادارے ان کی مدد کر سکتے ہیں۔ اس میدان میں امکانات کی حدیں بڑی وسیع ہیں اور مجھے اس آسمان کے سائے تلے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نظر آ رہی ہے، ریاستی اردو اکاڈمیاں نظر آ رہی ہیں اور بیشمار ایسے ادارے ہوں گے جو میری حدودِ نگاہ میں نہیں ہیں۔ کوئی کام از خود تو معجزوں سے ہی ہو سکتا ہے لیکن کسی کام کو، خصوصاً بڑے کام کو، انجام دینے کے لیے اللہ کے کچھ بندوں کو مستعد ہونا پڑتا ہے۔ کاش چندا کابر اس تجویز پر غور کرنے کے لیے بھی کچھ وقت نکال لیں ایک جملے میں عرض کروں تو مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے نوجوانوں کو ایک ایسی ٹیکنالوجی میں مہارت کے ساتھ اس کی سند بھی دیں جو قدیم ترین ہونے کے باوجود جدید ترین ہوتی جا رہی ہے۔ جس کی ابتدا پتھروں، پتوں اور درخت کی چھالوں اور جانوروں کی کھالوں پر نقوش ثبت کرنے سے ہوئی تھی اور اب لکڑی، پتھر سے لے کر دیبا و حریر تک کوئی چیز اس کی گرفت سے باہر نہیں ہے۔

آخری بات:

ہمیں اس اعتراف میں کوئی عار نہیں کہ ہم نے صحافت کے اندھے کنوئیں میں جست لگادی تھی۔ تنگدستی اور قلندری میں بسر ہوئی۔ حالاتِ کار بڑے دشوار گزار اور صبر آزما تھے۔ لکھنے لکھانے میں معاونت کے اسباب و وسائل بہت ناکافی بلکہ نہ ہونے کے برابر تھے اور مستقبل میں امید افزا امکانات بھی نہیں نظر آرہے تھے، اردو صحافت تو درکنار اردو زبان ہی کا کوئی مستقبل نہیں نظر آرہا تھا لیکن آج حالات بہت بدل چکے ہیں۔ اردو زبان کا اور اردو صحافت کا بھی روشن مستقبل صاف نظر آرہا ہے تاہم چند باتیں صحافیوں کے لیے بہت ضروری ہیں۔ پہلے اردو صحافی ہرفن مولا ہوا کرتا تھا لیکن اب خصوصی مہارتوں کا زمانہ ہے اس لیے ہر صحافی کے لیے لازم ہے کہ اپنے ذوق اور رجحانِ طبع کے مطابق کسی خاص شعبے یا گوشے کا انتخاب کرے مثلاً اقتصادی امور جس پر ہمارے اردو اخباروں میں لکھنے والوں کا قحط ہے، سائنس اور ٹیکنالوجی جس کے آفاق روز بروز پھیلتے چلے جائیں گے، سیاسیات، قومی اور بین الاقوامی، مزید براں اس کے علمی نظریاتی اور تاریخی پہلوؤں سے بخوبی آگاہی اور غائر مطالعہ۔ اس کے بغیر اپنے پڑھنے والوں کو نہ تو آگاہی دی جاسکتی ہے اور نہ ہی مستقبل میں ان کی رہنمائی کی جاسکتی ہے جو کہ صحافی کی اولین ذمہ داری ہے۔ غرض کہ اپنے دائرہ کار کا تعین کرے اس کے ساتھ ہی ایسے اخبارات ورسائل کی تلاش اور ان سے رابطے جاری رکھے جہاں اس کی تحریروں کی کھپت اور اس سے منفعت کی امید ہو۔ آج کی مادہ پرست دنیا میں بے نیازانہ گزر جانا ممکن نہیں رہ گیا۔ اب بات صرف پرنٹ میڈیا تک نہیں رہ گئی الکٹرانک میڈیا میں بھی بڑی گنجائش پیدا ہوتی جارہی ہے۔ نئے چینل، اردو کے مخصوص چینل بھی آتے جارہے ہیں ان کے علاوہ نئے دور کے ''آسمانی جرائد'' بھی وجود میں آچکے ہیں۔ ان کی طرف سے آنکھ نہیں بند کی جاسکتی اس دنیا میں بھی بے پناہ امکانات ہیں۔ بتانے کی ضرورت نہیں کہ انٹرنٹ پر اپنے سائٹ لیے جاسکتے ہیں، چند صحافی مل کر اس کام کو زیادہ منظّم طریقے پر کرسکتے ہیں، اپنے کالموں کے لیے اس کائنات میں نئے خریدار تلاش کرکے اپنی آمدنی کے وسائل بڑھا سکتے ہیں۔

اخبارات اور نشر و اشاعت سے متعلق قوانین سے آگاہی تو ہر اس شخص کے لیے لازمی ہے جو اس میدان میں قدم رکھنے والا ہو مزید براں پریس کونسل آف انڈیا کے مرتب کردہ ضوابط ہیں جو صحافتی اخلاقیات کے حدود کا تعین کرتے ہیں۔ لکھنے والوں کے دائرہ کار کا تعین کرنے والے ان واضح خطوط کے علاوہ بعض باتیں اور بھی قابلِ لحاظ ہیں۔ عام سیاسی بے راہ روی اور سماج کو تقسیم در تقسیم سے دو چار کرنے والے بے اصول احتجاجیوں اور موقع پرستوں نے بھی کچھ کم مشکلیں نہیں پیدا کی ہیں۔ دوسری زبانوں کے صحافی ایسی صورت حال سے بہ آسانی بچ نکلتے ہیں لیکن اردو صحافیوں کے لیے شاید ایسا کرنا بہت مشکل ہوگا اس لیے لازم ہے کہ گوش و ہوش سے کام لیتے ہوئے ایسے معاملات، حالات اور عناصر کا ہمیشہ لحاظ اور خیال رکھیں۔

زبان کا معاملہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یوں تو کسی زبان میں بھی لکھنے والے کے لیے لازم ہے کہ اس زبان میں زیادہ سے زیادہ مہارت اور قدرت حاصل کرے۔ فی الحال ہم اردو زبان کی بات کر رہے ہیں۔ یہ زبان بڑی لچکدار اور ہمہ گیر ہونے کے باوجود سکہ بند بھی ہے۔ یہ لکھنے والوں سے گرامر اور محاوروں کی درستگی کا تقاضہ کرتی ہے۔ اس احتیاط کے بغیر کوئی صاحبِ قلم درجۂ اعتبار کو نہیں پہنچ سکتا۔ آج جب ہماری زبان چوطرفہ حملوں سے مجروح ہوتی جارہی ہے اس کی صحت کو برقرار رکھنے کی ہر ممکن کوشش ایک اخلاقی فریضہ ہے۔ کسی زبان کا ادب تحریر میں حسن اور کشش کا موجب ہوتا ہے اس لیے لازم ہے کہ حالاتِ حاضرہ سے آگاہی اور اپنے مخصوص شعبے یا گوشے میں واردات و واقعات سے باخبر رہنے کے ساتھ ہی کچھ وقت اچھے ادب کے مطالعہ کے لیے بھی ضرور نکالا جائے جو خود بخود تحریر میں راہ پاتا ہے اور تحریر خواہ کیسی ہی اور کسی موضوع پر ہو، اس کو جلا بخشتا ہے۔

میں طنز و مزاح بھی لکھتا رہا ہوں اس لیے اس راہ کو اختیار کرنے والوں کو خاص طور سے انتباہ کرنا چاہتا ہوں۔ واقعی مزاح لکھنا مذاق نہیں ہے۔ ٹھٹھا، مسخرہ پن، لچر بیانی واقعی مزاح نہیں ہے۔ مزاح وہ ہے جس سے طبیعتوں کو فرحت و فراغ حاصل ہو، کچھ دیر کے لیے سہی طبیعت کی کدورت دور ہو جائے، دل شاد ہو جائے اگر اس میں کوئی بات کسی کے لیے ناگوار بھی

ہوتو بھی وہ اس کے لیے نا قابلِ برداشت نہ ہو، دانت کے درد کی طرح کہ دبانے سے اس کی کسک میں بھی ایک لذت ہو۔ ہر زخم وقت کے ساتھ بھر جاتا ہے لیکن زبان کے زخم کی طرح قلم کا زخم بھی کبھی مندمل نہیں ہوتا۔ اس لیے طنز ومزاح لکھنے والوں کے لیے بڑی احتیاط لازم ہے۔ مزاح نگاری نہایت سنجیدہ عمل ہے اس لیے مجتبیٰ حسین کو کسی نے مسکراتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔ اپنے تجربات کی روشنی میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ اپنی زبان اور اپنے قلم کے ساتھ ہی خود اپنی نظر کا بھی محاسبہ کرتے رہنا چاہئے۔ بات یوں ہے کہ طنز ومزاح لکھنے والوں کو ہر معاملے، واقعہ یا شخص کو ایک مخصوص زاویہ سے دیکھنے کی عادت سی ہو جاتی ہے اس طرح خود اس زاویئے کے ہی بگڑ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے جیسے کہ خراب آئینے میں اچھی خاصی شکل بھی ٹیڑھی نظر آتی ہے۔ ابھی جس احتیاط کا ذکر کیا ہے وہ اس لیے ضروری ہے کہ ایک بار تیر کمان سے نکل جانے کے بعد واپس نہیں آتا کسی غلط تبصرہ، تجزیہ یا بیان کے بعد پشیمانی کا اندیشہ ہوا کرتا ہے۔ اس سے بچنے کے لیے خود اپنی اصلاح کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ترچھی نظر سے دیکھتے دیکھتے آنکھ ہی بھینگی ہو جائے، نقل کرتے کرتے خود اپنی ہی چال ٹیڑھی ہو جائے۔ ہر تحریر میں اعتبار قائم رکھئے۔

اداریئے اور دیگر مخصوص کالم لکھنے والوں کے لیے لازم ہے کہ حقائق کے بیان میں پوری احتیاط برتیں، واقعات اور تاریخ وغیرہ کے معاملے میں اچھی طرح تحقیق کرلیں۔ اس معاملے میں حوالے کے ذرائع اور وسائل اب زمین سے آسمان تک موجود ہیں۔ ہم لوگوں کے زمانے میں ایک عبدالحق کی ڈکشنری کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ خود اپنی ایک ڈائری رکھی جائے اور اس کو حوالوں کے لیے استعمال کیا جائے۔ موضوعات کے اعتبار سے تراشوں کی فائل بڑی کارآمد ہوتی ہے لیکن اس کو برتنا مشکل اور مستعدی کا کام ہے۔ یوں تو صحافت کا پیشہ ہی چوبیس گھنٹے کا کل وقتی کام ہے۔

■❖■

تمام عمر نشستیم و شب سحر کردیم
دراز بود ہماں قصہ مختصر کردیم
درونِ سینہ نگہ داشتیم لعل و گہر
ہمان بود کہ رضواں میاں ہنر کردیم

رضوان اللہ